عہدِ اسلامی کا ہندوستان

از

سید ریاست علی ندوی

ناشر:- ادارۃ المصنفین، پٹنہ ۶

طبع اول سنہ ۱۹۵۰ء

قیمت مجلد ۶/۸ (چھ روپے آٹھ آنے)

عنوانِ انتساب

میں ان ناچیز اوراق کو ہدیہ اخلاص وعقیدت کے طور پر حضرت مخدوم معظم ڈاکٹر قاضی سیّد اکرم امام صاحب منعمی ابو العلائی رحمہ اللہ (المتوفی سال ۱۳۵۰ھ) کے تذکار گرامی سے معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

حضرت اقدس علیہ الرحمہ، میرے والد ماجد جناب سید بشارت علی صاحب عرف بڑے مد ظلہ، کے حقیقی ماموں، راہ سلوک میں ان کے مرشد اور راقم سطور کے خسر تھے وہ خوش عقیدہ متقی دیندار اور اسلامی اخلاق وکردار کے عملی نمونہ تھے، ان کی صحبتوں میں ہندوستان کے پچھلے دور کی اس تہذیب کی جواب مٹتی جا رہی ہے، یاد تازہ ہوتی تھی، میں انہی کی نظر توجہ اور شفقتوں کے سایہ میں انگریزی اسکول کی تعلیم سے علیحدہ ہو کر عربی درسگاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی واسلامی علوم کی تحصیل کے لئے داخل کیا گیا۔ پھر انہی کی ہدایت ومشورہ کے مطابق دار المصنفین اعظم گڈھ کی رفاقت سے وابستہ ہوا۔ وہ میرے قلم سے نکلی ہوئی سطروں کو بڑی شفقت اور شوق کی نگاہ سے پڑھتے تھے۔

دیرینہ تمنا تھی کہ اپنی ناچیز علمی خدمت گذاریوں میں سے کسی خدمت کو ان کی یاد کی نذر کروں۔ مجھے خوشی ہے کہ ان سطروں کے ذریعہ وہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے اور اپنی مغفرتوں سے نوازے۔
اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ مَغْفِرَةً وَاسِعَةً وَهَبْ لَهٗ مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔

سید ریاست علی ندوی

۱۰ رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم
محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین ۰

ہندوستان کی صحیح و مستند تاریخ کی تدوین ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی ہے۔ ڈیڑھ دو سو برسوں کی مسلسل کوششوں سے یہاں کی تاریخ کے حلقوں کو جان بوجھ کر مسخ کیا گیا، کہ ایک طرف مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں کو دیکھ کر شرمائیں، دوسری طرف ان کے ہم وطنوں میں ان کے خلاف غم و غصہ اور عناد کے جذبات کی پرورش ہو۔ اور ملک کے مختلف گروہوں میں تعصب اور نفرت کی خلیج حائل ہو جائے۔ استعماریت کا یہ حربہ ایسا کامیاب رہا کہ رفتہ رفتہ اپنوں کی نگاہوں کے سامنے بھی پردہ آگیا۔ خصوصاً انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں پڑھی پڑھائی جانے والی کتابیں اسی انداز میں ترتیب پائیں۔

آج سے تقریباً چالیس برس پہلے ان غلطیوں کی اصلاح کی طرف پہلی مرتبہ علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمۃ کی زمانہ شناس نگاہ اٹھی۔ انہوں نے سنہ ۱۹۱۱ء میں ندوۃ العلماء میں "تصحیح تاریخ ہند" کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم کیا۔ حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ اس کے سکریٹری مقرر ہوئے، اس شعبہ نے اپنے زمانہ کے انگریز مؤرخین کی ان کتابوں پر توجہ کی، جو نصاب درس میں داخل تھیں، نیز اپنے وقیع علمی و تاریخی و تنقیدی کتابوں کے ذریعہ خدمات انجام دیئے۔

مولانا شبلی نعمانیؒ کی ذات گرامی کے ساتھ جتنی تحریکیں وابستہ تھیں، یا ان کے جو علمی و تاریخی تصورات، و ذہنی افکار تھے، ان کی تکمیل کے لئے دارالمصنفین کی تاسیس عمل میں آئی، اس مجلس نے جس طرح اسلامی علوم و آداب کی خدمت کی،

جدید علوم و نظریات کو اُردو کا جامہ پہنایا، اسی طرح تاریخ ہند بھی اس کا موضوع رہا!
آج تاریخ ہند کے صفحات میں بعض نظریئے ایسے موجود ہیں، جو تمام تر اس مجلس کے متنوع
کی تحقیق و تفتیش سے منظر عام پر آئے ہیں، مثلاً

انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی تھیں، ان میں مسلمانوں
کے دور کو محمد بن قاسم کے اچانک حملہ کو دکھا کر غزنوی کے حملہ سے شروع کیا جاتا تھا،
حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی تاریخ "عرب و ہند کے تعلقات" کی اشاعت
کے بعد پہلی مرتبہ ڈاکٹر تارا چند کی کتاب "تاریخ اہل ہند" میں مسلمانوں کے حملہ ہند
کا باعث ان عرب کشتیوں کی بربادی کو قرار دیا گیا جو اہل ہند کے ہاتھوں بحر سندھ میں عمل
میں آئی تھی۔ زیر نظر مجموعہ میں بھی "ہندوستان پر مسلمانوں کے ابتدائی حملے اور ان کے اسباب"
کے عنوان سے اس ابتدائی دور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی طرح عالمگیر کے خلاف جو فرد جرم تھی اس میں اس کے عہد میں "تاریخ نویسی کا قانوناً
جرم" ہونا بھی تھا۔ زیر نظر مجموعہ میں "کیا عالمگیر کے عہد میں تاریخ نویسی قانوناً جرم تھی" کے
عنوان سے جو مقالہ ہے، ۱۹۳۲ء میں اس کے شائع ہونے کے بعد درسی کتابوں میں
عالمگیر کے فہرست جرائم میں سے اس کو خارج کیا گیا۔ اسی طرح "مندروں کے انہدام"
کا الزام ۱۹۴۳ء تک ہندوستان کے نامور مؤرخ سر جدو ناتھ سرکار نے عالمگیر کے سر
رکھا، لیکن ان کے جواب میں "عالمگیر کے عہد میں مندروں کا انہدام" کے عنوان سے
جو مقالہ شائع ہوا، اس کے بعد اہل علم نے عالمگیر کے اس الزام سے بری ہونے کی رائے
قائم کی، یہ مقالہ اس مجموعہ میں موجود ہے۔ اس میں سر جدو ناتھ سرکار کے جواب میں
دکھایا گیا تھا کہ عالمگیر نے مندروں کے منہدم کرنے کا عام حکم نہیں دیا تھا، بلکہ چند ایسے
مندروں کو مسمار کیا گیا تھا جو حکومت کے خلاف سازشوں کا اڈہ بنے ہوئے تھے
اور خصوصاً بے دینی پھیلانے کے لئے مرکز کا کام دیتے تھے۔ اس مقالہ کی اشاعت کے
بعد آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے اجلاس پٹنہ میں ڈاکٹر بی۔ ماتا سرن نے اپنے
خطبہ صدارت میں اس دعویٰ سے رجوع کیا، اور ارشاد فرمایا :-

"دوسری یہ بات بھی علم میں آئی ہے کہ بعض اہل قلم کی طرف سے چند حقیقتیں ابھی روشنی میں لائی گئی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چند اہم مراکز جیسے بنارس کے مندر تھے، ہندوؤں کی طرف سے مفسدانہ سازشوں کے اڈوں کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے جن کے خلاف شہنشاہ نے اشتعال میں عملی اقدام کیا، اور اس کو اب اس کے تعصب کی شہادت میں پیش کیا جا رہا ہے ...."

(ر ر ص ۲۵۵)

اس سلسلہ کے یہ سب ٹکڑے اس مجموعہ میں شامل ہیں، اور انہیں زندہ رکھنا اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ ابھی ہندوستان کی تاریخ اپنے "تدوینی دور" میں ہے ایسا نہ ہو کہ غفلت میں ارباب علم سے یہ حقیقت نظر انداز ہو جائے، اور سر جدو ناتھ سرکار کی گل فشانیاں نئے سرے سے تازہ ہو جائیں۔

دار المصنفین کے زمانۂ قیام میں راقم سطور کا بیشتر زمانہ اس کے ترجمان رسالہ معارف کی ترتیب و ادارت کی خدمت میں بسر ہوا۔ اس تعلق سے مقالات کی ترتیب و تسوید کا موقع نسبتہً زیادہ ہاتھ آیا، کچھ دن گذرے کہ اپنی شائع شدہ تحریروں پر نگاہ ڈالی تو ان میں بیشتر حصہ ایسا نظر آیا جنہیں ایک خاص ترتیب سے تصنیفات کی شکل میں منتقل کیا جا سکتا تھا، چنانچہ انہیں مختلف موضوعوں کے اعتبار سے الگ الگ مجموعہ میں اکٹھا کیا گیا، اس سلسلہ میں ایسے مقالات کو جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے ہندوستان کے اسلامی دور کی تاریخ سے وابستہ ہے "عہد اسلامی کا ہندوستان" کے نام سے یکجا کیا گیا ہے، یہ مقالات ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۶ء تک کے رسالہ معارف میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس بیس بائیس برس کی مدت میں بہت سے ایسے نئے ماخذ چھپ کر سامنے آئے جو ان مضامین کی تسوید کے وقت تک چھپے نہیں تھے یا دار المصنفین کے کتب خانہ میں نہ آسکے تھے، اس لئے ان پر نظر ثانی کی ضرورت تھی، چنانچہ ان ماخذ سے فائدہ اٹھایا گیا، لیکن جب یہ مجموعہ اپنی ترتیب کے آخری مرحلہ پر پہنچا

تو اس کا حجم غیر معمولی نظر آیا، اس لئے اس کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ یہ پہلا حصہ "عہد اسلامی کا ہندوستان" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اور دوسرے حصہ کو "ہندوستان کے عہد اسلامی کے چند اکابر" کے نام سے علحدہ کر لیا گیا ہے جس میں اسلامی دور کے چند ممتاز ہستیوں کے سوانح خصوصاً ان کے علمی خدمات روشنی میں لائے گئے ہیں۔

اس کے بعد یہ مناسب معلوم ہوا کہ "عہد اسلامی کا ہندوستان" مجموعہ مضامین کے بجائے ایک مستقل تصنیف کی شکل میں شائع ہو، اس مناسبت سے چند ضروری ابواب شروع میں بڑھائے گئے، اور یہ مضامین اس طرح مرتب کئے گئے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلقات کے قیام سے "ملوک سلاطین دہلی" کے دور تک کی مسلسل تاریخ قلمبند ہو جائے اس کے بعد تغلق سلاطین کے دور سے متعلق دو مقالے ہیں، پھر متفرق تحقیقی مباحث پر مشتمل مضامین درج کئے گئے ہیں۔ ان مضامین کو ایک دوسرے کے بعد اس ترتیب سے رکھا گیا کہ ناظرین کے مطالعہ کا ذہنی ربط قائم رہے۔ متفرق مضامین کو ایک لڑی میں پرونے اور ان میں تصنیفی ربط پیدا کرنے میں جو دشواریاں پیش آسکتی تھیں، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

مضامین و مباحث کی ترتیب میں کوشش کی گئی ہے کہ "عہد اسلامی کا ہندوستان" رزم کے بجائے بزم کا، جنگ کے بجائے صلح کا، قوموں، ملتوں اور جماعتوں کے درمیان نفرت، عناد اور دشمنی کے بجائے محبت، شفقت، دوستی اور اتحاد کا آئینہ دار ہو، اس کے ساتھ واقعات کے بیان میں صحت اور سچائی کا رشتہ بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ البتہ اس گوشہ کو خاص طور سے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مختلف گروہوں میں لطف و محبت اور امن و اشتراک کے ان خوشگوار تعلقات کو دکھا سکیں، جن کو پہلے جان بوجھ کر چھپانے کی کوشش کی گئی تھی، لیکن طرز ادا ایسا رکھا گیا ہے کہ واقعاتی رنگ سے علحدہ ہو کر محض ذاتی نظریات و رجحانات کا طرز استدلال نہ ہو جائے، اس لئے ایسے موقعوں پر ہلکے انداز میں محض اشاروں ہی پر اکتفا کر کے

گذر جانا مناسب معلوم ہوا ہے۔

ہمیں اشتر ہے کہ یہ مجموعہ ہمارے مخدوم محترم جناب آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر ترقیات حکومت بہار کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ مخدوم موصوف کو منصب وزارت سے علٰحدہ ان کی علمی زندگی میں ایک خاص منزلت حاصل ہے۔ آج سے چند سال پہلے رسالہ ندیم گیا کی ادارت کے زمانہ میں اس کے بہار نمبر ۱۹۴۱ء میں ان کے متعلق یہ صحیح طور پر لکھا گیا تھا کہ:-

"ڈاکٹر صاحب کو علم کا پاکیزہ مذاق عطا ہوا، درحقیقت اگر وہ سیاسیات کے پُر خار وادی میں قدم نہ رکھتے تو ان کا صحیح مرتبہ کسی علمی خانقاہ میں ان کا زاویہ نشین ہو جانا تھا، خصوصاً ہندوستان کی تاریخ پر عالمانہ نظر رکھتے ہیں......"

ڈاکٹر صاحب کو تاریخ ہند سے جو لگاؤ ہے، اس تعلق سے انہوں نے اس مجموعہ کو دلچسپی سے پڑھا، ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے مقدمہ میں بعض قابل قدر مشورے بھی عنایت فرمائے ہیں۔

کتاب کا نام "عہد اسلامی کا ہندوستان" رکھا گیا ہے۔ راقم سطور "اسلامی" کے لفظ کے متعلق ۱۹۳۶ء میں اپنی کتاب تاریخ صقلیہ جلد دوم کے دیباچہ میں ایک شبہ کا ازالہ کر چکا ہے کہ:-

"اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی علوم و فنون سے مراد وہ تہذیب و تمدن و علوم و فنون ہیں.... جو مسلمانوں میں رائج رہے۔ عام ازیں کہ نفس دین اسلام کی تعلیمات کے مطابق بھی ہوں یا نہ ہوں اس لئے دوسرے الفاظ میں انہیں "مسلمانوں کی تہذیب و تمدن و علوم و فنون" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے"

دراصل اس زمانہ کو "ہندوستان کے عہد وسطیٰ" سے تعبیر کرنا چاہیے لیکن موجودہ زمانہ میں وہ "مسلم پیریڈ" ہی سے موسوم ہے، اور ہمیں اسی کے متعلق پھیلائی

ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے۔ اس لئے اسی نام سے موسوم کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ اسی سلسلہ میں ایک اور شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ کتاب کے صفحہ ۷۸ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے متعلق یہ دکھایا گیا ہے کہ :-

"در اصل یہاں مسلمانوں نے جس حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی، وہ مذہبی حکومت کے بجائے غیر مذہبی اور غیر جانب دار سلطنت (سیکولر اسٹیٹ) تھی۔"

اس کا مدعا یہ ہے کہ حقیقی اسلامی نظام حکومت ایک برتر نظام ہے۔ ان حکومتوں کو جو دور وسطیٰ میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں قائم تھیں، انہیں مذہبی حکومت کہنا صحیح اسلامی نظام حکومت کی غلط ترجمانی کرنا ہے، جب وہ حکومتیں جو اپنے کو اسلامی کہتی تھیں، اور شرعی نظام حکومت کے ماتحت قائم تھیں، حقیقی معنوں میں اسلامی حکومات کہے جانے کی مستحق نہیں تو ہندوستان کی ان حکومتوں کو جو مسلمانوں کے ہاتھوں قائم ہوئیں، اور جن کے قائم کرنے والوں نے بھی ان کے "اسلامی" ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، انہیں "مذہبی" اور "اسلامی" کہنا کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔

آخر میں مجھے حکومت یوپی کی علم نوازی کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنے- G.O No A-6135/XV-2203/1948

G.O. No-A 6581/XV-2203/1948 کے مطابق ڈیڑھ ہزار روپئے "عہد اسلامی کا ہندوستان" کی طبع و اشاعت کے لئے عطا کئے۔ اس سلسلہ میں آنریبل سمپورنانند وزیر تعلیم یوپی، اور اپنے لائق دوست آنریبل کیشو دیو مالویہ وزیر ترقیات اور مخلص دوست شری الگورائے شاستری ام۔ ال۔ اے۔ سکریٹری یوپی پراونشل کانگریس کمیٹی کی کرم فرمائیوں کا شکر گذار ہوں۔

کتاب کے لکھنؤ کے ایک پریس میں جانے کے بعد راقم سطور کا تعلق حکومت

بہار کے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہوگیا۔ اور ۲۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو راقم سطور نے پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی حیثیت سے اپنے نئے منصب کی ذمہ داری قبول کرلی، اس طرح یوپی اور اس کے دارالحکومت لکھنؤ سے دور ہوگیا، میں اپنے مخلص کرمفرما نواب سیّد التفات حسین صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انہیں کی تمام تر توجہ سے اس کی طباعت کے مرحلے انجام پذیر ہوئے۔ کتاب کے فرمے انہوں نے لکھنؤ سے پٹنہ بھیج دیئے۔ اور اب فہرست، مقدمہ اور ان سطروں کو پٹنہ میں چھپوا کر ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچایا جارہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو حسن قبول عطا فرمائے۔

۱۸ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ
۵ جولائی ۱۹۵۰ء

سیّد ریاست علی ندوی
مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ ۶

فہرست مضامین

عہد اسلامی کا ہندوستان

عیدین کے مراسم اسلامی ہند میں (۲۰۷-۲۱۶)

پٹھان اور مغل کی اصلیت (۲۱۷ — ۲۲۰)

پٹھانوں کی تاریخ کے مآخذ (۲۲۱ — ۲۲۵)

مقدمہ

از

جناب آنریبل ڈاکٹر سید محمود صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی" وزیر ترقیات حکومت بہار

مولانا سید ریاست علی ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ کے مشہور و ممتاز رفقا میں تھے، ارباب علم ان سے اچھی طرح واقف ہیں، اور ابھی حال تک وہیں سے وابستہ تھے "عہد اسلامی کا ہندوستان" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں سے بیشتر حصہ وقتاً فوقتاً معارف میں شائع بھی ہو چکے ہیں اور اب ان کو تاریخی ترتیب دے کر ہندوستان کے عہد متوسط کا آئینہ دار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابتدا میں تمہیدی طور پر ہندوستان کے عہد قدیم کا اجمالی ذکر بھی کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی تاریخ کا متوسط عہد جو افغان اور مغل حکمرانوں کا زمانہ ہے، جس کو عام طور پر اسلامی عہد کہا جاتا ہے، اب تک صحیح ترجمانی کا محتاج ہے انگریزوں کے عہد حکومت میں جو تاریخیں اس دور کی مرتب کی گئیں، ان کی اصلی غرض و غایت مسلمان بادشاہوں کی سیاہ اور بھیانک تصویریں دکھلا کر ان بادشاہوں سے خصوصاً اور عام مسلمانوں سے عموماً نفرت پھیلانا تھا، اگرچہ کچھ اہل علم حضرات نے تصویر کا روشن رخ بھی دکھلانا شروع کر دیا تھا، چنانچہ مولانا شبلی نعمانی علیہ الرحمۃ نے سب سے پہلے بعض اہم تاریخی مغالطوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور پھر علامہ سید سلیمان صاحب نے، اسی طرح مولانا سید ریاست علی ندوی نے بھی ایک سعادتمند شاگرد کی حیثیت سے اسی نہج سے ان مضامین میں "عہد اسلامی" کی صحیح ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان میں پہلے پہل جو پُر امن مسلم نو آبادیاں قائم ہوئیں ان کا ذکر اس

مجموعہ میں اگرچہ مجمل و مختصر ہے۔ مگر وہ ہمارے لئے نہایت ہی سبق آموز ہے۔ عام طور پر اس عہد
کی تاریخوں میں اس کا مجمل ذکر بھی نہیں ملتا ہے۔ مسلمانوں نے کس قدر پُر امن طریقوں پر
اس ملک کے تمام ساحلی علاقوں پر اپنی نوآبادیاں قائم کیں اور نہایت ہی اتحاد و امن
کے ساتھ اس ملک کے قدیم باشندوں میں مل جل کر اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔ اور اپنی
تجارت کو فروغ دیتے رہے۔ اور مقامی حکمرانوں کو بھی اپنے برتر اخلاق کی وجہ سے
اپنا گرویدہ بنائے رکھا ہے۔ یہ مباحث اس کتاب سے روشنی میں آتے ہیں۔ میں نے اس کتاب
کو اکثر مقامات سے پڑھا اور سرسری طور پر پوری کتاب پر نظر ڈالی، لائق مؤلف کی محنت
قابل تعریف ہے۔ لیکن کتاب کی ترتیب کسی قدر نظر ثانی کی محتاج تھی۔ مثلاً بعض
تاریخی مباحث کو زیادہ طوالت دی گئی ہے، جیسے عالمگیر کا برتاؤ ہندوؤں کے ساتھ
اور تہواروں کے برتنے کی تفصیل، ان مضامین پر پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مولانا شبلی
صاحب نے بھی ان کو آج سے اٹھارہ (۱۸) برس پہلے لکھا تھا۔ اس لئے اس وقت کے لحاظ سے
موزوں تھے۔ تاہم اب ان مضامین کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان مضامین
کے ذریعہ سے بہت سی غلط فہمیوں کے دور ہونے میں رفتہ رفتہ کیسی مدد ملی ہے۔

درحقیقت ضرورت اس امر کی نظر آتی ہے کہ نفسیاتی طور پر تمام عہد افغان کی تاریخ
کی تشریح و ترجمانی کی جائے۔ ایک عہد دوسرے عہد سے تاریخی اور نفسیاتی تسلسل رکھتا
ہے۔ اور ہر عہد کے ذہنی رجحانات کو نمایاں طور پر دکھلانا اور حاکم و محکوم کی مزاجی کیفیتوں
اور ملکی واقعات کو سامنے رکھ کر احکام کی توجیہہ کو سامنے لانا، دور حاضر کے مورخ کے اہم
فرائض میں سمجھا جا سکتا ہے۔ افسوس کہ اب تک وفات عالمگیر سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی
حکومت کی ابتدا تک کے عہد کی تاریخ پر مفصل فلسفیانہ نگاہ نہیں ڈالی گئی جس سے یہ
نفسیاتی کلیہ قرار پاتا ہے کہ ابنائے دہلی اور سرداران ملک ہند، مرہٹہ، سکھ، اور راجپوت
عناصر نے ملک کے مرکزی سیاسی اقتدار (دہلی) تخت شاہی پر خود غرضانہ جذبات سے
ضرب لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ یہ آزاد اور خود مختار [illegible]
حقیقی معنوں میں ایک غیر ملکی اور غیر قوم (انگریز) کی غلامی میں جکڑ دیا گیا۔ یہاں سے

بہ ظاہر ہم ابھی ابھی کچھ قربانیاں دے کر آزاد ہو سکے ہیں۔ خدا اس آزادی کو برقرار رکھنے کی توفیق دے۔
یہ مختصر اشارات محض اس لئے کئے گئے ہیں تاکہ نوجوان حوصلہ مند، صاحب نظر مولفین قلم اٹھائیں اور اس کمی کو پورا کریں۔

مجھے امید ہے کہ مولانا ریاست علی صاحب کی یہ تالیف ان کو اس قسم کے مطالعہ کی طرف اور بھی زیادہ متوجہ ہونے کا موقع دیگی۔ موجودہ انقلابات کے پیش نظر ضرورت ہے کہ تاریخ ہند کے اس باب کو مستقل طور پر ایک تالیف میں جمع کیا جائے تاکہ ہماری موجودہ اور آئندہ نسلیں اس نقش قدم پر چلنا سیکھیں۔ "ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی حیثیت" کیا تھی؟ اس کی صحیح ترجمانی کتاب کے صفحات ۱۶۸–۱۶۹ میں آپ پائیں گے۔ یہ نہایت صحیح ہے کہ دراصل یہاں مسلمانوں نے جس سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی وہ مذہبی حکومت کے بجائے غیر مذہبی اور غیر جانبدار (سکولر اسٹیٹ) تھی۔ پروفیسر حبیب اللہ کی کتاب کا جو اقتباس ص۱۶۸ و ص۱۶۹ میں درج کیا گیا ہے اس کو ہمیں غور سے پڑھنا چاہیئے

"اسلامی حکومت" کے غلط اطلاق نے اس ملک میں مسلمانوں کے خلاف منافرت و انتقام کے نہایت غلط جذبات پیدا کر دیئے ہیں جن کو مٹانا ہمارا فرض عین ہے۔ اور ضرورت ہے کہ ایسے مضامین ملک کی اور زبانوں میں بہ کثرت شائع کئے جائیں۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی اس دور کی تاریخ کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اب ضرورت ہے کہ ایسی تالیفیں خاص طور پر ہندی رسم الخط میں بھی شائع کرائی جائیں تاکہ ان کے مطالعہ سے اکثریت کے طبقات بھی متاثر ہو سکیں۔ مجھے امید ہے کہ مولانا ریاست علی ندوی کی یہ تالیف شوق سے پڑھی جائے گی۔ اور حضرات ذوق اس کے مواد کو اپنے تاریخی مضامین اور کتابوں کے لئے استعمال کریں گے۔ یہ ہر طرح پر ایک مفید اور کارآمد تاریخی تالیف ہے۔ اور اس کو ہماری تاریخ اور ادب کی معیاری کتابوں کے سرمایہ میں ایک بہتر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

خاکسار

سید محمود ۱۶ر مئی ۱۹۵۰ء

ہندوستان کے عہدِ قدیم کا اجمالی نظارہ

"عہدِ اسلامی کا ہندوستان" اسی وقت درخشاں نظر آئے گا، جب قدیم ہند کا بھی ایک مرقع ہماری نگاہوں کے سامنے آجائے۔

ہندوستان عہدِ قدیم سے تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے، دریائے سندھ کی وادی اور جنوب پنجاب میں ۱۹۲۲ء میں جو آثارِ قدیمہ زمین کی تہ سے برآمد کئے گئے ہیں۔ ان سے ہندوستان کی قدیم تہذیب کا نشان بہت اونچا ہوگیا ہے۔

ہند کے اصل باشندے ہند کے اصلی باشندے یہاں آریوں بلکہ ڈراوڑیوں کی آمد سے پہلے شمال و جنوب ہند کے ایک بڑے حصہ میں پھیلے ہوئے تھے وہ سیلون سوماٹرا، اور آسٹریلیا کے اصل باشندوں کے ہم نسل تھے۔ اور "دبلیور" اور "منیوز" کے نام سے یاد کئے گئے ہیں، ہندوستان کے ایک مورخ کا خیال ہے کہ شاید دبلیور وہی ہیں۔ جو اب بھیل کہے جاتے ہیں، اور "منیوز" "مینا" کہلائے، تیسرا قبیلہ ناگا تھا، یہ پہاڑی باشندے آج بھی اسی نام سے آسام کی پہاڑیوں میں آباد ہیں، ان وحشی قبیلوں کی آبادی ڈھائی کروڑ کے قریب ہے۔ اور ان میں کا بڑا قبیلہ چھوٹا ناگ پور اور اڑیسہ میں "سنتال" کہا جاتا ہے، اور ان ہی لوگوں نے اب اپنا نام "آدی باسی" یعنی قدیم باشندے رکھ لیا ہے۔

ہندوستان میں آباد ہونے والی قومیں

ڈراوڑی باہر سے آنے والی قوموں میں پہلا نام "ڈراوڑیوں" کا ہے،

یہ آریوں کے یہاں آنے سے چار ہزار برس پہلے تمام ہندوستان میں چھائے ہوئے تھے، آریوں کے بعد یہ شمالی ہند سے ہٹ گئے اور جنوب ہند میں پناہ لی، موہنجوداڑو اور ہڑپا کے شاندار تمدن کے مالک یہی دراوڑی تھے جس میں پانچ پانچ منزل کے عالی شان محل برآمد ہوئے ہیں، مبصرین نے ان کے زمانے کی تعیین ۳۲۵۰ سے ۲۸۰۰ ق م تک کی ہے، اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے، دراوڑی قوم اس تمدن کے پیدا ہونے سے کئی ہزار برس پہلے ہندوستان میں آچکی تھی اور کم سے کم ایک ہزار برس میں تمدن کے یہ اعلیٰ مدارج اپنے عروج پر پہنچے ہوں گے جس میں ان کی وضع قطع، لباس زیور، بود و باش سب ہی میں تمدن کی لطیف نزاکتیں موجود ہیں[1]

آریا – ہندوستان کی سرزمین پر آکر آباد ہونے والی دوسری قوم آریا کہی جاتی ہے، انھوں نے دراوڑیوں کو ہٹا کر اپنے قدم جمائے، ان کا قدیم تعلق "انڈوجرمن" نسل سے ہے، وسط ایشیا سے اس نسل کے مختلف قافلے مشرق و مغرب میں چلے، ہندوستان میں ان کے آنے کا صحیح زمانہ ۲۵۰۰ ق م سمجھا جاتا ہے اور ان کا آخری قافلہ ہندوستان میں تقریباً ۱۶۰۰ ق م میں آیا تھا۔

آریوں کا ابتدائی تمدن سادہ تھا، ان میں تمدن کی تکمیل جو کچھ ہوئی وہ ہندوستان ہی میں ہوئی، وہ ہندوستان میں مستقل تمدن کے بانی بنے، یہیں ان کی سیاسی تنظیم ہوئی وہ دوسری قوموں کو ہٹا کر یہاں آباد ہوئے، اس لیے ان کے رزمیہ کارنامے بہت روشن ہیں، پھر ان میں قبائلی تقسیم پیدا ہوئی، اور ذات پات کی تفریق قائم ہوئی. اور اس سے بہت سے مسائل پیدا ہوئے، وید ان کا مقدس صحیفہ تھا وہ قدرتی عناصر زمین، آسمان، سورج، بجلی، آگ، پانی کے پرستار تھے، مہابھارت اور رامائن ان کی قابل قدر رزمیہ داستانیں ہیں، پھر رگ وید پر تفسیری کتابیں اپنشد لکھی گئیں۔

آریوں کی قدیم سلطنتیں – گندھارا جن کا پایہ تخت ٹیکسلا تھا، سلطنت کورو جن کا پایہ تخت اندرپرست (نزد دہلی) تھا، پنچال کی سلطنت اودھ، اسی طرح مگدھ

---

[1] مارشل ج ۱ ص ۱۰۲، ۱۰۳ اور تاریخ ہند ... ص ۲۹

یامت سبیس، سورسین (پایہ تخت لاہور یعنی متھرا) اونتی (اوجین، جین (دیسائی) نزد مظفر پور (متھلا) کوسل کی سلطنت بساوتی (نزد گورکھپور) یہاں کی قدیم ترین حکومتیں تھیں[1]، پھر مگدھ (بہار) کی سلطنت کا دور آیا، سیس ناگ اور نند خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ راجہ بم بسار ناگ سیس کی پانچویں پشت میں تھا، وردھ مان مہابیر جناتری پتر اسی راجہ کے ہمعصر تھے۔ یہ چھتری امیرزادے جین مت کے بانی تھے۔ مگدھ ہی میں انھوں نے وفات پائی، ان کی سمادھ راج گیر کے قریب مرجع خلائق ہے، پھر اسی زمانہ میں ساکی منی گوتم بودھ کپل وست (ضلع بستی یوپی) میں پیدا ہوئے اور مگدھ کی تیرتھ گاہ گیا جی میں پیپل کے درخت کے نیچے گیان حاصل کیا، اور جیسا کہ سمانتھ دت نے دلائل سے دکھایا ہے، وہ کرشن جی کی طرح سچنتہ موحد تھے۔

اس کے بعد موریا خاندان کے عروج کا دور آیا اور مگدھ کی سطوت و سلطنت کا سایہ پورے ہندستان پر چھا گیا، ان ہی کے زمانہ میں یورپ کی نئی قوم سکندر اعظم کے زیر علم ہندستان میں آئی اور واپس چلی گئی، پھر ایرانیوں نے بھی یہاں کچھ فتوحات حاصل کئے۔ مگر وہ بھی قدم جما نہ سکے۔ مگدھ کی سلطنت (پایہ تخت راج گیر نزد بہار ٹپنہ) اور موریا خاندان کے عروج کا دور آریائی تمدن کے شباب کا زمانہ تھا، جین اور بدھ مت کو اس دور میں بڑی ترقی ہوئی، چندر گپت اور اشوک جیسے جلیل القدر فرماں رواؤں کے نام کے سامنے عقیدت سے نگاہ جھکتی ہے۔

چندر گپت ہی نے یونانی سلوکس کو ہٹا کر افغانستان تک قبضہ جمایا، چندر گپت کے برہمن وزیر چانک نے اصول حکمرانی پر "ارتھ شاستر" لکھی جس کا نسخہ میسور کے کتب خانہ سے برآمد ہوا، یونانی سفیر میگاس تھینز کا بیان ہے کہ چندر گپت کے شاہی محل آرائش و زیبائش اور شان و شوکت میں سوس و ہمدان کے شاہی محلات سے بڑھے ہوئے تھے، ستون و رواق پر سونے کا پانی چڑھا کر ان پر سونے چاندی کی بیلیں چڑھائی گئی تھیں۔ اور ان کی شاخوں پر زمرد سرا طیور دکھائے گئے تھے۔ پایہ تخت پاٹلی پتر کی شہر پناہ میں ۶۴ دروازے

---

[1] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا ج ۱ ص ۶۲

اور ۵۷۰ برج تھے فصیل کی خندق کے لیے سون کا پانی لایا گیا تھا۔

اشوک کے دور میں جتنی بڑی سلطنت ہوئی ہندوستان کے پورے زمانہ تاریخ میں اس سے بڑی سلطنت نہیں ہوئی تھی اس کی فتح کی یادگاروں کے کتبات دستیاب ہو چکے ہیں، وہ آخر میں بودھ مت کا پیرو ہو گیا۔ اور اس مشن کی تبلیغ کے لیے تبت فارس، چین، مصر، یونان میں مبلغ بھیجے، اشوک کے لاٹ شہرت رکھتے ہیں، اس کے کتبات چٹانوں پر اور غاروں میں جو ضلع گیا میں اسٹیشن بیلا کے قریب واقع ہیں، اسی طرح مختلف میناروں پر ہیں، اب تک ۴۳ کی تعداد میں برآمد ہو چکے ہیں۔ یہ کتبے جس علاقہ میں ہیں، وہ وہیں کی بولی اور پراکرت میں ہیں جو اس حصۂ ملک میں رائج تھی ہندی یونین نے اشوکا ہی کے چکر کے سایہ میں اپنا قومی نشان پایا۔[۱]

موریا خاندان کے خاتمہ کے بعد ملک میں طوائف الملوکی پھیلی، مختلف نسل کے، مختلف خاندان، ملک کے مختلف حصوں میں، مختلف ناموں سے برسر اقتدار آئے اور ان میں خانہ جنگیاں بھی ہوئیں۔ برہمنوں کو دوبارہ فروغ ہوا، سنگ کانوا اندھر ممتاز حکمران خاندان تھے، پھر اسی دور میں ہندستان کی مغربی سرحد پر یونانی نسل کے شاہان باختر (بکٹریا) اور پارتھیہ کو عروج حاصل ہوا، پھر سیتھی اور یوچی اور کشان ترکمانی قبیلے آگے بڑھے، گندر فارس، کدنسیس، اد اجتن، بھومکا اور راجہ کنشک نامی حکمران اور صوبہ دار گذرے ہیں۔ انھوں نے صدیوں تک حکمرانی کی، یہاں تک کہ پاٹلی پتر (پٹنہ) کے راجہ سمندر گپت نے ان کا خاتمہ کیا۔ اور مگدھ کی سلطنت نے اس نئے دور میں پورے ملک ہندوستان کی سیاست میں ایک اثر انداز حیثیت اختیار کر لی۔[۲]

---

[۱] آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا، ص ۴۹، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۰۔ انسائیکلو پیڈیا ج ۱ ص ۳۱، پارینہ انڈیا ص ۲۵۲، ۲۵۳، ویدک انڈیا ہیٹرکل آف بدھزم (واٹکرن) آرمی ہسٹری آف انڈیا (آستھر) بودھا و بودھزم انسائیکلو پیڈیا، پیرافنس آف انڈیا (ربابو منا تھ دت) الکزنڈر امپائر ص ۳۵۔ درتاریخ ہند ہاشمی ج ۱ ص ۹ ۱۰ ص ۹۴، ۱۰۹،

[۲] ایضاً ص ۲۰۷، انسائیکلو پیڈیا ج ۱۸ ص ۱۱۰، آکسفورڈ ہسٹری ص ۱۵۲، ۱۲۷، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۴ درتاریخ ہاشمی ج ۱ ص ۱۱۰، ۱۲۹۔

مگدھ سلطنت کو دوسرے دور میں گپت خاندان کے ہاتھوں فروغ حاصل ہوا، سمندر گپت، چندر گپت ثانی یا راجہ بکرماجیت نے اس سلطنت کو ہندوستان کی عظیم الشان سلطنت بنا دیا، اس دور میں ہندوستان میں بودھ مت کو زوال اور برہمنی مت کو نیا عروج حاصل ہوا۔ قدیم زبان سنسکرت کے احیاء کی خدمت انجام پائی، تمدن میں نوک و پلک نکلے، سنگ تراشی و نقاشی میں کمال پیدا ہوا، اجنتا کی نقاشی اسی دور کا نمونہ ہے، کہا جاتا ہے کہ مشہور شاعر کالی داس اسی بکرماجیت کے نورتن میں شامل تھا، چینی سیاح فاہیان اسی کے زمانہ میں آیا تھا، جس کا سفرنامہ اس عہد کی قابل قدر تاریخ ہے۔

سکندر گپت اسی خاندان کا آخری تاجدار ہے، جو وسط ایشیاء سے آنے والے ایک نئی قوم "ہون" کے سیلاب کا مقابلہ نہ کر سکا، اس کی سلطنت مگدھ میں محدود ہو کر رہ گئی اور پوری سلطنت پر ہونوں کا تسلط قائم ہو گیا، ۵۰۵ء میں مگدھ کی گدی پر پورو گپت کا بیٹا نرسمہ گپت بالادت بیٹھا، اس نے گپت خاندان کا نام نئے سرے سے اونچا کیا، اس نے ہونوں کو مالوہ کے راجہ جس دھرمن کی مدد سے مالوہ میں شکست دی، اُدھر ۵۵۷ء میں ترکوں نے مزید مدد بہر کی، کہ ہونوں کے صدر مقام پر ان کا تختہ الٹ دیا جس کے اثر سے ان کے ہندی مقبوضات بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے، اس قوم کے جو لوگ ہندوستان میں بچ رہے، وہ یہاں کی نسل اور آبادی میں گھل مل گئے۔ اسی لیے آریوں کو اکال الامم (قوموں کو کھانے والی قوم) کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے، نرسمہ گپت کے دور کے علمی مرکز نالندا نے شہرت دوام حاصل کی، یہ علمی ادارہ اسی کے ہاتھوں تعمیر پایا تھا جس کے آثار آج عقیدت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں[۱]۔

آگے چل کر ساتویں صدی کے آغاز میں تھانیسر کے حکمران خاندان کو عروج حاصل ہوا، راجہ ہرش وردھن ۶۰۶ء میں تخت نشین ہوا، اور اس نے پورے ہندوستان کو ایک چھتر کے نیچے لانے کی آرزو کی، ہرش کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی، شمالی ہند میں مشرقی بنگال کے علاوہ وسیع علاقہ میں اس کا علم لہرانے لگا، پھر ساٹھ ہزار

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۲ ص ۷۰۹، ص ۴۵۱ آکسفورڈ ہسٹری ص ۱۶۱، اکس بی ص ۱۶۱، ہند و تاریخ ہاشمی ص ۱۴۷

جنگی ہاتھی اور ایک لاکھ شہسواروں سے اس نے دکن کی چالکیہ سلطنت کو زیروزبر کرڈالنا چاہا۔ مگر چالکیہ خاندان کے حکمراں پلکیسن ثانی نے نربدا ندی کے کنارے اس سیلاب کو روک دیا، لیکن گجرات اور مغربی مالوہ نے اس کے قدم چومے اور ۶۴۲ء میں گنجام (شمالی کلنگ) کو اس نے زیرنگین کیا، وہ بودھ مت کی طرف مائل تھا گوشت خوری اور جانورکشی کی سختی سے ممانعت تھی اور خلاف ورزی پر موت تک کی سزا دی جاتی تھی۔ اس کو رزم کے ساتھ بزم میں بھی امتیاز حاصل تھا، وہ صرف، نحو اور کئی نظموں کا مصنف تھا۔ "ناگا نند" ڈراما اسی کا لکھا ہوا ہے، جو ہند کے قدیم ناٹکوں میں بہترین سمجھا جاتا ہے۔ چینی سیاح نے اس کی مدح سرائی کی ہے، اس عہد کی تصنیفات کو سنسکرت زبان میں امتیاز حاصل ہے، مشہور چینی سیاح ہوئن سانگ اسی کے دور میں ہندوستان آیا تھا۔ اور اس دور کے قابل قدر تاریخی حالات اس کے سفرنامہ میں محفوظ ہیں۔

اسی دور میں ہندوؤں کی آخری مذہبی کتابیں مہاپران (۱۵عدد) اُپ پران (۱۸عدد) تصنیف ہوئیں، مہاپرانوں میں ۴ لاکھ اشعار ہیں، پران دراصل کائنات کی فلسفیانہ مگر افسانہ آمیز تاریخیں ہیں، یہ حقیقت میں قدیم قصص و روایات کے مجموعے ہیں لیکن ان کی حیثیت مہابھارت وغیرہ رزمیہ نظموں سے فروتر ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ راجہ ہرش کے حکومت سے، موجودہ زمانہ کی طرح مشرق میں مشرقی بنگال اور مغرب میں پنجاب، سندھ اور بلوچستان خارج تھے یہ علاقے ہندوستان کی سرحد سے علیحدہ ہوچکے تھے[1]۔

سندھ میں ایک مضبوط خودمختار سلطنت قائم تھی، بلوچستان بھی اس کے مقبوضات میں داخل تھا۔ سندھ کا یہ حکمران خاندان شودر ذات کا اور بودھ مت کا پیرو تھا۔ اس خاندان کا مہاراس رائے وہ پہلا حکمران تھا جس کے زمانہ میں شتر سواروں کا ایک نیا قافلہ ہندوستان میں رہ جانے کے لیے مغرب سے آیا۔ اور اپنی زندگی، عمل، اور عقیدے کے اقدار بھی اپنے ساتھ لایا۔

---

[1] قدیم تاریخ ہند۔ اسمتھ ص ۶ ۳ ۵ فانگ چاچ ا ص ۲۴۵

عرب ڈراوڑیوں اور آریوں کے بعد عربوں کا تیسرا قافلہ تھا، جو ہندوستان کی سرزمین میں آیا، اور اپنی زندگی کے ناقابل فراموش نقوش یہاں کے چپہ چپہ پر قائم کیے یہ سامی نسل کے تھے، باہر سے آنے میں سامی و آریہ دونوں نسلوں کا حال یکساں ہے آریوں کا آخری قافلہ ہندوستان میں تقریباً سنہ [illegible] ق م میں آیا، اور عربوں کے یہاں آنے میں اس زمانہ کو علیحدہ کر دیا جائے۔ جب وہ اسلام کے ظہور سے پہلے یہاں آئے تھے جس کا سلسلہ سنہ [illegible] ق م تک پہنچتا ہے، تو بھی مسلمان عربوں کا پہلا قافلہ سنہ ۱۲ھ میں یہاں آ گیا تھا۔ اس طرح آریوں کے آخری اور مسلمانوں کے پہلے قافلہ کی آمد کے زمانہ میں صرف ایک ہزار برس سے کچھ اوپر کا فرق رہتا ہے، جو قوموں کی تاریخ کے لیے کوئی بڑی بات نہیں، یہ بھی اشارہ کر دینا مناسب ہے کہ یہ فرق اس سے بھی کم ہے۔ جو ڈراوڑیوں اور آریوں کے ہندوستان سے وابستہ ہونے کے درمیان میں پڑتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمان دو راہوں سے آئے۔ ایک سندھ کی راہ سے، دوسرے سرحد کے مغربی دروں کو پار کر کے پھر سندھ سے بری و بحری دونوں رستوں سے ان کی آمد و رفت کا سلسلہ قدیم سے قائم تھا، جب مسلمانوں نے پہلی مرتبہ اس ملک پر حملہ کیا تو جیسا کہ گزرا سندھ میں شودر خاندان کا تاجدار سہراس رائے جو راجہ ہرش کا ہم عصر تھا۔ ان عربوں کی لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے بیٹے ساہسی نے عربوں سے مقابلہ کی تیاری کی اور وہ بھی جنگ میں کام آیا۔ اس کے بعد برہمنوں کا ایک خاندان برسر حکومت آ گیا، اس کا مورث چچ راجہ ساہسی کا وزیر تھا اور گدی کو خالی پا کر اس پر براجمان ہو گیا تھا، راجہ داہر اسی کا بیٹا تھا جس کے زمانہ میں عربوں نے سندھ کی فتح کی تکمیل کی اور سنہ ۴۱۹ھ میں محمود غزنوی کے ہاتھوں میں جانے سے پہلے تک یہاں عربوں کی منظم حکومت قائم رہی، سندھ کی اس عربی سلطنت نے اسلام کو ہندوستان میں سیاسی طاقت سے آراستہ کرنے کا تصور اپنے سامنے نہیں رکھا، لیکن ان کے دور کے تمدنی آثار و نشانات کی ناقابل محو یادگاریں قائم ہوئیں، سندھ کے ان اسلامی حملوں اور سندھ کی اسلامی سلطنت کا اجمالی خاکہ زیر نظر مجموعہ کے ایک مقالہ میں آیا ہے جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کی داغ بیل پڑنے کا حال آشکارا ہوگا

ہندوستان کے مغربی دروں سے آنے والی مسلم قوموں میں ترک قبائل ہیں ترکوں
کی ہندوستان سے بلا ارادہ دوستی کا ایک مظاہرہ اس وقت ہو چکا تھا جب ۵۵۵ء میں
انھوں نے ہونوں کے پایۂ تخت کو لے کر ہندوستان کے راجاؤں کی مدد کی تھی اور ہندوستانی
مقبوضات پر ہندوستانی راجاؤں کا نئے سرے سے قبضہ ہوا تھا، اس وقت تک اسلام کا ظہور نہیں ہوا تھا اسلام
کے ظہور کے بعد ترکوں میں بھی اس کی اشاعت ہوئی۔

ترک | آٹھویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا میں ترکوں کے چند جانباز قبائل
اسلامی سطوت کا علم بلند کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جلد ہی وہ ایران، عراق
اور افغانستان پر چھا گئے۔ پھر ان کے اقبال کا ستارہ بڑھتا ہوا ہندوستان کے افق
تک پہنچا اور اس ملک کے مغربی حصہ کو دریائے راوی تک یہاں سے علیحدہ کر کے غزنی کی مضبوط مرکزی
حکومت سے اس کا رشتہ جوڑ لیا۔

غزنویوں نے تقریباً دو سو برس تک پنجاب کو ہندوستان سے علیحدہ کر لیا تھا۔ وہ کابل
کی ہندو حکومت کا پہلے خاتمہ کر چکے تھے اور دو صدیوں کے لیے پنجاب کو اس طرح یہاں
سے علیحدہ کیا کہ گویا اس کا نام ہندوستان کے نقشہ سے نکل گیا۔

سندھ کے عربوں کو شودروں اور برہمنوں کی حکومتوں سے سابقہ پڑا تھا۔ لیکن
شمالی ہند کے فاتح ترکوں کو راجپوت حکومت سے واسطہ پڑا جن کی مستحکم حکومت
کی سطوت شمالی ہند پر چھائی ہوئی تھی، اور ان کی بہادری کے کارناموں سے ہندوستان
کی فضا گونج رہی تھی۔ اس لیے ترکوں اور راجپوتوں دونوں کو اپنی تلواروں پر بھروسہ
تھا اور اسی کے سہارے وہ ایک دوسرے سے میدان کو صاف کرنے کا تہیہ کر کے لڑنے
کے لیے جنگ میں اترے تھے۔ تلوار دونوں کو پیاری تھی اور دونوں اس پر اعتماد کرتے
تھے، دونوں کے اپنی اپنی جگہ پچھلے کارنامے تھے اور دونوں اسی کے بل بوتے پر آخری
فیصلہ کرنا جانتے تھے اور ان ہی دونوں بہادر قوموں کے کارناموں سے ہندوستان کے
عہد اسلامی کا ابتدائی دور معمور رہا

تاجیک | غوری خاندان جس نے ہندوستان میں آگے چل کر اپنی حکومت قائم کی

"تاجیک" عرب و ایران کی مخلوط نسل سے تھے، یہ تاریخ میں اپنے آبائی انتساب سے آل شنسب بھی کہے جاتے ہیں، یہ قبیلہ خراسان سے اٹھا۔ اور گرد و نواح پر چھا گیا ہندوستان سے اس کا تعلق اس وقت پیدا ہوا، جب یہ اسلام قبول کر چکا تھا، اور عرف عام میں غوری کہا جاتا ہے

پٹھان ان کے بعد لودھیوں پٹھانوں کی آمد ہوئی یہ بھی اسلام لانے کے بعد ہی ہندوستان میں وارد ہوئے ان کی نسل و اصلیت پر اس مجموعہ میں مستقل ایک تحریر موجود ہے۔ اس لیے یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

تیموری مغل پھر ہندوستان سے تیموریوں کا تعلق پیدا ہوا، ان کی اصل کے متعلق بھی ایک تحریر اس مجموعہ میں موجود ہے۔ مغلوں کا ہندوستان سے گہرا تعلق قائم رہا اور ہندوستانی کلچر کی تخلیق میں ان کا اہم حصہ رہا، اور اس دور میں ہندوستان نے ایک شاندار علمی و تمدنی منزل طے کی اور ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبے ترقی کر کے نئے رنگ و روپ میں نکھر آئے۔

یورپین اس کے بعد ہندوستان میں یورپین کے قدم پہنچے ان میں سے انگریزوں نے ان کی سلطنت کے چراغ کو گل کر کے اپنی غیر ملکی سلطنت کا مینار ہندوستان میں اونچا کیا اور ہندوستان دو سو سال میں یورپ کے نئے تہذیب و تمدن سے آشنا ہوا۔ انگریزوں نے ہندوستان سے کبھی اپنا وطنی تعلق قائم نہیں کیا۔ اس غیر ملکی سلطنت کا خاتمہ مہاتما گاندھی کی اہنسا اور ستیہ گرہ کی تحریک کی رہنمائی میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کے مضبوط ہاتھوں سے ہوا اور انڈین یونین کی کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی نے ہندوستان کے لیے آزاد سیکولر جمہوری اسٹیٹ پر مشتمل آئین مرتب کر دیا ہے اس طرح ہندوستان پہلی مرتبہ جمہوری نظام حکومت سے روشناس ہوا

ایک نکتہ ہمیں ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے پڑھنے میں ایک نکتہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے، ترک، تاجیک، پٹھان، اور مغل اسلام قبول کرنے کے بعد جلد ہی ہندوستان میں آئے، اسلام کی تعلیمات کے اثرات تعلیم و صحبت سے ایک قوم

دوسری قوم میں منتقل ہوتی ہیں، اس وقت تک ان قوموں کے دورِ وحشت کی عادتیں پوری طرح بدلی نہ تھیں کہ اسلام کا پرچم ان کے ہاتھوں میں آگیا اور جو کچھ ان کے ہاتھوں سے انجام پایا، خواہ اسلام کے مزاج، منشاء اور احکام کے مطابق رہا ہو یا نہ رہا ہو۔ ہندوستان میں وہ اسلام کے ذہن سے وابستہ سمجھا گیا، اور اسی آئینہ کو دیکھ کر اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی گئی حالانکہ یہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

پارسی ۸ ویں صدی عیسوی میں زردشتی مذہب کے ماننے والے عرب حملہ آوروں کے غلبہ کے بعد خراسان سے جلاوطن ہوکر ۷۳۵ء میں احاطۂ بمبئی کے ضلع تھانہ کے مقام سنجان میں آئے اور آج تک پارسی کے نام سے موجود اور یہاں کے باشندے ہیں۔

قدیم ہند کے پچھلے عہد کی آزاد حکومتیں

ہندوستان کے اسلامی عہد کو روشناس کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ قدیم ہند کے پچھلے عہد کی ان آزاد حکومتوں پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے، جو راجہ ہرش کی متحدہ حکومت کے دور میں، اس کے حدود حکومت سے باہر قائم تھیں، یا اس کی حکومت کے خاتمہ کے بعد لامرکزیت یا طوائف الملوکی کے طور پر ملک کے مختلف صوبوں اور گوشوں میں قائم ہوگئی تھیں کہ ہندوستان کی اسلامی حکومتوں نے ان ہی علیحدہ علیحدہ خودمختار حکومتوں کو ختم کرکے ان کے پرعظمت کھنڈروں پر اپنی سطوت کا پرچم نصب کیا اس زمانے میں ہندوستان کے یہ مختلف علاقے گویا اپنی اپنی جگہ ایک مستقل ملک تھے، جن کا تصور ہم اس زمانے میں مختلف صوبوں کی شکل میں کیا کرتے ہیں - ان میں سے ہر علاقہ میں الگ الگ حکومتیں قائم تھیں اور ان کے حدود مختلف حکومتوں کی طاقت اور کمزوری کے اثر سے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں اور کبھی برسرعروج شاہی خاندان کئی کئی علاقوں کو زیرنگین کرکے اپنے حدود حکومت میں ملا لیتے تھے، مناسب ہے کہ ان سلطنتوں کا جائزہ علاقہ واری لیا جائے - ان میں سے سندھ کی آخری قدیم سلطنت کا تذکرہ تو اوپر گزر چکا اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں اس کے علاوہ حسب ذیل مختلف علاقے کشمیر، قنوج، بندیل کھنڈ، بہار و بنگال اڑیسہ و مشرقی بنگال، آسام، پنجاب، دہلی، سانبھر، اجمیر، گجرات اور مالوہ گویا شمالی ہند میں سلطنت کے اہم مرکز تھے۔ اسی طرح دکن کے مختلف علاقوں میں مختلف برسرحکومت خاندان چالکیہ کی مختلف شاخیں، وتاپی، راشٹر کوٹ، کلیانی، پھر خاندان ہوسل اور خاندان یادو گذرے ہیں، اسی طرح جنوبی ہند میں سرزمین تامل کئی سلطنتوں پانڈیا، چول اور چیر کا گہوارہ رہی ہے، نیز مشرقی جنوبی ہند میں خاندان پلّو کو بھی عروج حاصل ہوا؛

ذیل میں مذکورہ صدر علاقوں اور خاندانوں کی سلطنتوں کا ایک سرسری جائزہ لے لیتا ہوں:-

حکومت کشمیر | راجہ ہرش کے زمانہ میں سندھ کے علاوہ پنجاب اور کشمیر میں بھی آزاد و خود مختار حکومتیں قائم تھیں۔ کشمیر کی سلطنت کے حدود میں کابل و گندھارا (قندھار) یعنی شمال مغربی پنجاب کا پہاڑی علاقہ بھی داخل تھا راجہ ہرش کا ہم عصر راجہ درلبھ وردھن یہاں کا حکمران تھا، اسی خاندان کا حکمران للتادت تھا جس نے ۷۴۰ء قریب قنوج کے راجہ کو شکست دی، اس کے عہد کی یادگار مارتانڈ (یعنی سورج مندر) اسلام آباد سے ۳ میل کے فاصلہ پر آج بھی موجود ہے۔ اور فن تعمیر کی امتیازی خصوصیت رکھتا ہے، اسی خاندان کے راجہ سنگ رام دست ۱۰۱۴ء سے ۱۰۲۸ء کے زمانہ میں سلطان محمود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا اور اس کو شکست دی، مگر اس سلطنت کی خود مختاری برقرار رہی، یہاں تک کہ ۱۳۳۹ء میں ایک مقامی مسلمان خاندان نے اس ملک پر قبضہ کر لیا، سلطان زین العابدین وغیرہ اسی خاندان میں گذرے ہیں بالآخر ۱۵۸۷ء میں اکبر نے اس کو مرکزی حکومت سے وابستہ کر لیا[۱]۔

سلطنت پنجاب | دسویں صدی میں یہاں ایک عظیم الشان سلطنت قائم تھی جس کے حدود حکومت میں دریائے سندھ کی وادی کا بالائی حصہ اور سندھ کے شمال میں پنجاب کا بڑا علاقہ جو مغرب کی طرف کوہستان تک اور مشرق کی طرف دریائے بجرا تک پھیلا ہوا تھا، شامل تھا، راجہ جے پال یہاں کا حکمران تھا، غزنی کے امیر سبکتگین سے اسی کی آویزش ہوئی، پھر سلطان محمود نے اس کو شکست دی جس سے غیرت کے جوش میں آکر اس نے خودکشی کر لی، اس کا جانشین اس کا بیٹا انند پال ہوا[۲] بھٹنڈا جو اب ریاست پٹیالہ میں ہے اس کا پایہ تخت تھا، غزنویوں نے اس سلطنت کا خاتمہ کیا،

دہلی، سانبھر، اجمیر کی حکومتیں | شہر دہلی کی بنا ۹۹۳ء سے ۹۹۴ء میں مہابھارت کے شہر اندر پرست کے قریب ڈالی گئی تھی، اس حکومت کا خاتمہ تنوار خاندان کے راجپوتوں نے کیا تھا، جن میں راجہ اننگپال نے دلی کو بڑی ترقی دی، دوسری

---

[۱] قدیم تاریخ ہند مسعود ص ۲۱۵ تا ۲۶۲ [۲] قدیم تاریخ ہند مسعود ص ۷۷۵

طرف چوہان نسل کے راجپوتوں کی حکمرانی راجپوتانہ کے علاقہ سانبھر میں تھی جس میں اجمیر کا علاقہ بھی شامل تھا، بارھویں صدی میں اس خاندان کے راجہ وسیل دیو نے تنواروں کے ہاتھ سے دلی کو بھی فتح کر لیا، وسیل دیو کا بھتیجا یا نواسہ پرتھی یا پرتھوی راج یا رائے پتھورا برسر اقتدار آیا، اس نے مہوبا کے چندیل کے راجہ پرسالی کو شکست دی اسی زمانہ میں غوریوں کے حملے شروع ہوئے اور اس نے مشترکہ ہندو افواج کے سپہ سالار کی حیثیت اختیار کر لی، اس کی سلطنت کا خاتمہ شہاب الدین غوری کے ہاتھوں سے ہوا۔

سلطنت قنوج | قنوج قدیم ہند کی پرانی آبادی ہے، مہابھارت میں اس مقام کا جہاں یہ آباد ہے۔ دو جگہ ذکر آیا ہے، بطلیموس کے جغرافیہ (تصنیف ۱۴۰ء) میں بھی "گنگورا" اور "کنوزگا" کے نام سے اس کا تذکرہ ملتا ہے، پھر کنیا کبج یا کان کبج کے نام سے اس نے شہرت پائی، مورخین کے درمیان اس کی قدامت کا احساس موجود تھا چچ نامہ میں ہے؛

"رائے ہر چند گفت درجواب داد کہ این ولایت قریب یک ہزار و شش صد سال است کہ در ضبط و تصرف ما است۔

لیکن اس کی سیاسی نشوونما کا دور چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہوا، یہاں تک کہ ہرش کے زمانہ (۶۰۶ء تا ۶۴۷ء) میں یہ شہر دار السلطنت بنایا گیا اور اس کی ترقی کی وجہ سے اس علاقے کے دوسرے پر رونق شہر بے رونق اور گمنام ہو گئے، اور اسی زمانہ سے قنوج کو مرکزی اہمیت حاصل ہوئی۔

عرب اور عام مورخین نے قنوج کی فتح کو پورے ہندوستان کی فتح سمجھا، ہرش کے بعد اس کے وزیر ارجن نے حکومت ہاتھ میں لی، پھر راجہ جس ورمن کا دور آیا جس کے زمانہ میں بھوبھوتی شاعر گزرا ہے، جس کے "مہا بیرچرت"، "اتر رام چرت" اور "مالتی مادھو" مشہور ڈرامے ہیں۔ دوسرا مشہور شاعر واک پتی ہے۔ جس نے اپنی رزمیہ مثنوی "گوڑوہا" پراکرت زبان میں لکھی۔ اور اس میں جس ودھرمن کے بنگالے کے فتوحات کو بیان کیا ہے، اس کے بعد اس حکمران کے دو جانشین آٹھویں صدی تک گزرے، مگر حکومت

کمزور ہو چکی تھی، کشمیر اور بنگال کے راجاؤں نے دبا یا، پھر راجپوتانہ کے راجہ ناگ بھٹ نے اس پر ۸۱۶ء میں قبضہ کر لیا۔

ناگ بھٹ گوجروں کی قوم کا بادشاہ تھا، اس گروہ کا ایک قبیلہ "پریہار" کہا جاتا تھا، جو راجپوتانہ کے وسطی علاقے میں قابض تھے، ناگ بھٹ قنوج کی فتح کے بعد راجپوتانہ کے ریگستان کو چھوڑ کر یہاں چلا آیا، اور سلطان محمود کے حملوں کے وقت اسی کی اولاد یہاں حکمران تھی، ناگ بھٹ کے بعد اس کا بیٹا رام دیو، پھر اس کا جانشین راجہ مہر بھوج (سنہ ۸۴۰ء سنہ ۸۹۰ء) گدی پر آیا۔ راجہ بھوج نے بڑا نام پیدا کیا، اور اپنی مملکت کو وسیع کیا، اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مہندر پال تخت نشین ہوا، اس کو پراکرت بھاشا سے دلچسپی تھی، اس زبان کے مشہور دکھنی شاعر راجہ سکھر کی شاگردی اختیار کی تھی، اس کے بعد مہندر کے لڑکے بھوج دوم پھر اس کا لڑکا مہی پال (سنہ ۹۱۰ء سنہ ۹۴۰ء) حکمران ہوا۔

مہی پال کے زمانہ میں قنوج کا شیرازہ بکھرنے لگا، راشٹر کوٹ خاندان کے دکھنی راجہ اندر (ثالث) نے اس کو شکست دی، بدیل کھنڈ کے چندیلوں نے بھی اپنے حملوں سے کمزور کر دیا، اس کے بعد دیو پال (سنہ ۹۴۰ء سنہ ۹۵۵ء) تخت نشین ہوا پھر وجیا پال (سنہ ۹۵۵ء سنہ ۹۹۰ء) برسر حکومت آیا۔ اس کے بعد راجہ جے پال تخت نشین ہوا۔ اس کے باوجود راجہ جے پال غزنی کی سلطنت سے سنہ ۹۹۱ء میں نبرد آزمائی کے لیے بڑھا تو قنوج کا راجہ بجے پال بھی اس کی فوج میں شریک تھا۔ پھر اسی کا بیٹا راجے جے پال یا راجیا پال اس کا جانشین ہوا جس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اور اسی جرم کی سزا میں ہمسایوں کے ہاتھوں قتل کیا گیا تھا۔

قنوج میں گوجروں کے جانشین گڈوال یا گروار ہوئے۔ راجہ چندر دیو (سنہ ۱۰۹۰ء) میں یہاں کا حکمران تھا، آگے چل کر راجہ گوبند چندر (سنہ ۱۱۱۰ء سنہ ۱۱۶۰ء) نے بڑی ترقی کی، اسی کا پوتا جے چند یا جیا چندر تھا۔ جس کی پرتھوی راج سے دشمنی تھی اور دہلی پر مسلمانوں کے قابض ہونے کے بعد اس نے اپنی سلطنت کو بچانے کی بڑی تیاریاں کیں لیکن چندا ور ضلع ایٹہ کے میدان میں اس کی عظیم الشان فوج کو شہاب الدین کے ہاتھوں شکست ہوئی

سلہ قدیم تاریخ ہند آسمتھ ص ۲۹۶ تا ص ۲۹۵

شہاب الدین بنارس تک بڑھتا چلا گیا، راجہ خود مارا گیا، اور سلطنت قنوج مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی، اس خاندان کے بہت سے راجپوت سردار یہاں سے نکل کر راجپوتانہ کے بیابان میں پناہ گزیں ہوئے، وہاں انھوں نے جودھپور کی سلطنت قائم کی، جو اب تک موجود ہے، مگر یہاں پہنچ کر ان کا اصلی نام بدل گیا، اور وہ "راٹھور" کہے جانے لگے اور اسی نام سے اب تک یاد کئے جاتے ہیں[1]۔

سلطنت بندیل کھنڈ | جمنا اور نربدا ندی کے درمیان کا علاقہ بندیل کھنڈ کہا جاتا ہے، ہندوستان میں طوائف الملوکی شروع ہونے کے بعد نویں صدی میں یہاں گوجر یا پریہار سرداروں کی حکومت قائم ہوئی، ان ہی میں کے ایک سردار نانک چند چندیل نے چھتر پور کے قریب ایک ریاست قائم کی، چندیل خاندان کی حکمرانی یہاں مستقل طور پر قائم ہوئی سنہ ۹۱۶ء میں انھوں نے قلعہ کالنجر پر قبضہ کیا، مہوبا، کھجوراہو، اور کالنجر میں ان کی بہترین یادگاریں ہیں۔ کھجوراہو کا مندر راجہ دھنگ کا تعمیر کرایا ہوا تھا، جب پنجاب کے راجہ جے پال نے امیر سبکتگین کے سفیروں کو قید کیا، اور اس نے فوج کشی کی، تو جو راجے، جے پال کی مدد کے لیے اپنی فوج لے کر گئے ان میں راجہ دھنگ بھی تھا، اس کے بعد اس کے جانشین سلطان محمود کے خلاف صف آرا ہوئے، یہاں تک کہ مسلمانوں نے اس کے ایک ایک قلعہ پر قبضہ کیا اور اس ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔

سلطنت بہار و بنگال | ملک میں طوائف الملوکی پھیلنے کے بعد آٹھویں صدی عیسوی میں مغربی بنگال و بہار میں پال خاندان برسر حکومت آیا۔ راجہ گوپال اس خاندان کا بانی اور بودھ مت کا پیرو تھا، اس نے اودند پور میں بودھ مت کی خانقاہ قائم کی یہی مقام اس کی راج دھانی تھا۔ اسی بودھ خانقاہ وہار کی مناسبت سے اس کا نام تبدیل ہوا، اور اب بہار کہا جاتا ہے، یہی قصبہ آگے چل کر حضرت مخدوم شاہ شرف الدین

---

[1] اوکس بیس ص ۱۰۱ اور تاریخ ہند ہاشمی و قدیم تاریخ مختصر ص ۵۷۷، ۵۷۲، ۵۶۱، ۵۸۲، ۵۸۳۔
انسائیکلو پیڈیا ج ۲۴ ص ۱۶۳ ارلی ہسٹری آف مختصر ص ۲۰۸، ۱۱۴ تا ۲۱، ص ۳۱
انسائیکلو پیڈیا ج ۱۵ ص ۸۸۰، ۶۸۹

کی ابدی خواب گاہ بنا۔ پال خاندان کی حکومت بہار سے بنگال تک وسیع تھی، دہرمپال اسی خاندان کا بنگال کا راجہ تھا۔ بھاگل پور کے نواح میں اس نے خانقاہیں اور درس گاہیں تعمیر کرائیں، اس کے بیٹے دیوپال نے اڑیسہ اور آسام پر بھی قبضہ کرلیا پہاڑی علاقہ کے قبیلہ کام بوج نے اس خاندان کی حکومت کو اپنے پے در پے حملوں سے کم زور کیا، بایں ہمہ نبی پال اور اس کے بیٹے پال وغیرہ بہار پر حکمرانی کرتے رہے، اور بارھویں صدی میں جب مسلمان بہار پر حملہ آور ہوئے تو اسی خاندان کے ہاتھوں سے اُنھوں نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔

سلطنت اڑیسہ گیارھویں صدی کے اواخر میں اڑیسہ (کلنگ) میں راجہ چوڑ گنگ نے قوت حاصل کی۔ اسی کا ایک فوجی سردار سمنت دیو کاشی پور کا مالک بنا، سمنت دیو کے پوتے نے مشرقی بنگال کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بیٹے لکشمن سین کو بودھ مت سے سخت اختلاف تھا۔ اس سین خاندان کی کوششوں سے مشرقی بنگال و اڑیسہ سے بودھ مت کا خاتمہ اور برہمنی عقائد کی تبلیغ ہوئی ۱۱۱۹ء میں بلال سین کی وفات پر اس کا بیٹا لکشمن سین وارث تخت و تاج ہوا جس کو مسلمان مورخین نے رائے لکھمن لکھا ہے، سپہ سالار محمد بن بختیار خلجی اسی کے محل میں صرف چند سواروں کے ساتھ گھس آیا، تو وہ ننگے سر اپنے محل سے نکل بھاگا، اور ملک پر بلا مزاحمت مسلمان کا قبضہ ہوگیا، رائے لچھمن سین ضلع ڈھاکہ کے بکرم پور میں پناہ گزیں ہوا، مسلمانوں نے نودیہ کے بجائے لکھنوتی کو پایہ تخت بنایا، سین خاندان علم و ادب کا قدردان تھا۔ اس کے ملک الشعراء دھیوئی دھوٹیک نے ناٹک لکھا گیتا گوبند کا مشہور مصنف جیا دیو بھی اسی عہد میں گزرا ہے

سلطنت آسام کامروپ کی قدیم سلطنت کے حدود آسام سے زیادہ تھے

کامروپ کوچ بہار اور رنگ پور کے علاقے اس میں شامل تھے، آسام کا یہ علاقہ عہد قدیم سے آریہ حکمرانوں کے زیر نگین رہا، پھر مقامی سرداروں نے وہاں حکومت قائم کی، بھاسکر ورمن یہاں کا حکمران تھا، پھر بنگال کے پال خاندان

• ۱؎ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا ج ۱ ص ۶۹۶، آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا مطبوعہ ۱۹۱۹ء، انسائیکلو پیڈیا ج ص ۳۱، برہت انڈیا ص ۲۴ ۱۱، قدیم تاریخ ہند استھو ص ۶۱۶۔

کی یہاں حکمرانی ہوگئی، اسی خاندان کے ایک راجہ کمارپال نے اس علاقے کو بارھویں صدی میں اپنے وزیر ویدیا دیو کے سپرد کردیا، پھر ۱۳ویں صدی کے اوائل ۱۲۲۸ء میں شان قوم کے ایک قبیلہ آہوم نے یہاں قبضہ جمالیا۔ اور یہاں کا یہی شاہی خاندان انگریزوں کی فتح ۱۸۲۵ء تک یہاں حکمران رہا۔

ہندوستان کا یہی صوبہ ان علاقوں میں سے ہے، جس پر اسلامی سلطنت کا سکہ رواں نہیں ہوا، محمد بن بختیار خلجی فاتح بنگال و بہار ۱۲۰۶ء میں دریائے کرتویا کے کنارے کنارے اس علاقہ میں بڑھا اور دارجلنگ کے شمال تک کوہستان کو قطع کرنے میں کامیاب ہوگیا، مگر یہاں مزید کامیابی کی راہ نہ دیکھ کر واپسی کا فیصلہ کیا، کامروپ والوں نے واپسی کے وقت دریا کے سنگی پل کو جو واپسی کا تنہا راستہ تھا، توڑدیا، پورا اسلامی لشکر برباد ہوگیا۔ صرف سپہ سالار اپنے سو سپاہیوں کے ساتھ بدقت تیر کر پار کرسکا۔ اس کے بعد بھی اس علاقہ پر بعض اوقات ناکام اسلامی حملے ہوئے یہاں تک کہ ۱۸۱۶ء میں اس پر برمیوں نے قبضہ کیا، اور ۱۸۲۴ء میں انگریزوں نے اس کو ان کے ہاتھوں سے لے لیا[1]

سلطنت گجرات ادھر ہندوستان کے شمال مغرب حصوں میں سے گجرات میں بارھویں صدی میں یہاں کے چالوکیہ خاندان کے ہاتھوں، جن میں سدھ راج اور کمارپال ممتاز تھے، اس علاقہ کو بڑی ترقی حاصل ہوئی، پھر اس صدی کے آخر میں چالوکیہ کے جانشین بگھیل خاندان والے بنے، اسی خاندان کے راجہ دیردھولی سے شہاب الدین غوری کی معرکہ آرائی ہوئی[2]

سلطنت مالوہ مالوہ کا علاقہ دریائے نربدا کے شمال کی وہ سرزمین ہے، جو قدیم زمانہ میں اونتی یا سلطنت اوجین کے نام سے مشہور تھی، یہاں پرمار خاندان حکمران تھا، نویں صدی کے اوائل میں اپندر یا کرشن راج نے اس خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی، تقریباً

---

[1] قدیم تاریخ ہند اسمتھ ص ۵۵۶ تا ص ۵۶۰ [2] قدیم تاریخ ہند اسمتھ ص ۵۸۴، ۵۸۵، و آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا اردو ص ۱۵۶، ۱۵۷۔

چار سو برس اس خاندان کی حکومت قائم رہی، اور اس کے ہاتھوں سنسکرت زبان و ادب کی امتیازی خدمتیں انجام پائیں، اس کا ساتواں حکمران راجہ منج سنسکرت کا بہترین شاعر اور شعراء اور اہل علم کا قدرداں تھا، دھنجیا اور دھنک اس دور کے بہترین شاعر گزرے ہیں اس کا بھتیجا راجہ بھوج ۱۰۱۰ء میں پایۂ تخت دھارا میں تخت نشین ہوا، محمود سے اس کی معرکہ آرائی ہوئی، وہ علم و ادب کا پرستار اور بہترین مصنف تھا، بھوجپور کی عظیم الشان جھیل جو بھوپال کے جنوب مشرق میں ہے، پہاڑوں میں بند باندھ کر ڈھائی سو مربع میل میں تیار کرائی۔ پندرھویں صدی تک یہ جھیل قائم رہی ۱۰۶۰ء میں گجرات اور چیدی کے متحدہ حملوں سے اس خاندان کی حکومت میں کمزوری آئی، تیرہویں صدی میں قبیلۂ تمر نے ان کی جانشینی حاصل کی، پھر چوہان راجاؤں نے اس پر قبضہ کیا، اور مسلمانوں کے قبضہ میں اس سرزمین کے وسیع علاقہ کے چلے جانے کے باوجود کہیں نہ کہیں چوہان راجاؤں کے اثرات قائم رہے، یہاں تک کہ ۱۵۶۱ء میں اکبر نے اس خاندان کے نام و نشان کو مٹایا۔ اور مالوہ مرکزی حکومت سے ملحق ہوگیا[۱]۔

دکن کی حکومتیں | دکن کا اطلاق دریائے نربدا کے جنوب کے اس حصہ ملک پر کیا جاتا ہے جس میں بیشتر تلنگی بولنے والے لوگ آباد ہیں اور اسی میں مہاراشٹر بھی شامل کر لیا جاتا ہے

خاندان اندھرا | اس حصہ ملک پر ساڑھے چار سو برس یعنی ۲۲۵ء تک اندھرا خاندان کی حکومت رہی، کنو خاندان کے بھی یہی جانشین رہے۔ یہ دکھنی علاقہ شمالی ہند سے عہد قدیم میں اس سے بیشتر زمانوں میں جدا رہا، شمالی ہند کی مشہور قدیم حکومتوں کے بیشتر حکمران یہاں تک نہیں پہنچ سکے، صرف موریا خاندان ہی ایسا تھا جس کو انھوں نے اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کیا تھا، اشوک کے بعد یہ جلد ہی اقتدار اعلیٰ کے بھی مالک بن گئے تھے۔ یجن سری اس خاندان کا آخری حکمراں تھا[۲]

دتا چلکیا خاندان | چھٹی صدی عیسوی میں دکن نے چلکیا خاندان کے ہاتھوں عروج

۱؎ قدیم تاریخ ہند اسمتھ ص ۵۹۸ – ۶۰۱

۲؎ قدیم تاریخ ہند اسمتھ باب ہشتم

حاصل کیا، اس خاندان کی حکومت کی بنا پلکیسن اول نے ۵۵۰ء میں ضلع بیجاپور کے مقام وتاپی میں ڈالی، اس کے لڑکوں کیرتی ورمن اور منگلیس نے مشرق و مغرب میں حکومت کے حدود بڑھائے پھر پلکیس دوم ۶۱۰ء میں حکمراں ہوا، اس نے اپنی فوجی طاقت سے راجہ ہرش کے حملہ کو روکا، دوسری طرف ۶۲۶ء میں اس کے تعلقات ایران کے خسرو دوم سے وابستہ ہوئے، اجنتا کے غار نمبر ۱ میں ایرانی سفیر کے ہندی بادشاہ کے سامنے اپنے وکالت نامہ کے پیش کرنے کا منظر دکھایا گیا ہے، اجنتا کی نقاشیاں اس خاندان کی لازوال یادگار ہیں، ۶۴۲ء میں پلو خاندان کے راجہ نرسمہا ورمن نے اس کے جدید پایۂ تخت ناسک میں اس کا خاتمہ کیا، مگر وہ چند سال سے زیادہ جنوبی ہند پر قبضہ نہ رکھ سکے، پلکیس کے لڑکے بکرماجیت اول نے ۶۵۵ء میں اپنی حکومت نئے سرے سے قائم کرلی اور بکرماجیت دوم نے ۷۴۰ء میں پلو خاندان کے قدیم دارالحکومت پر بھی قبضہ کرلیا، وتاپی شاہان چلکیہ کا زمانہ ۵۵۰ء سے ۷۵۳ء تک رہا اور اس دور میں ۹ حکمران گزرے۔

<u>شاہان راشٹر کوٹ</u> | اس کے بعد اسی آٹھویں صدی میں چلکیا خاندان کی ایک دوسری شاخ راشٹر کوٹ کو ۷۵۳ء میں عروج ہوا اس نے وتاپی چالکیوں کی حکومت ختم کی، دنتی درگا اس خاندان کی حکومت کا بانی تھا، پھر کرشن اول (۷۶۱ء)، گوبند دوم، دھرو، گوبند سوم (۸۱۵ء – ۷۹۳ء) اوگھورش (۸۱۵ء – ۸۷۷ء) گزرے، آخر الذکر پایۂ تخت کو ناسک سے مانیا کھیت لے گیا، جس کو عرب مورخین مانکیر کہتے ہیں، اور آج کل سلطنت نظام میں مالکھیڑ کے نام سے موجود ہے، اس خاندان کا آخری راجہ کک دوم تھا۔ ان کا دور حکومت ۷۵۳ء سے تک رہا، جس میں ۱۴ فرماں روا گزرے،

اس زمانہ میں عربوں کی حکومت سندھ میں قائم ہو چکی تھی، راشٹر کوٹ ایک طرف گوجروں سے لڑائیاں کرتے رہے، اور دوسری طرف مسلمانوں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھے، اس کی وجہ سے مسلمان سوداگر اور سیاح ہندوستان کے مغربی حصہ میں آتے جاتے رہے، سلیمان تاجر نے بلہرا کو یعنی ولبھ جو اس خاندان کے راجاؤں کا لقب تھا، ہندوستان کا سب سے بڑا بادشاہ لکھا ہے، کرشنا اول کے عہد کے مندر الورا، کیلاس تعمیری بہترین

یادگاریں ہیں، اس زمانہ میں ان سلطنتوں میں جو لڑائیاں ہوئیں، ان میں برہمن اور بودھ مذہب کی عصبیتیں زیادہ تھیں، اور اس کی وجہ سے وحشیانہ اور خونخوارانہ حرکتیں بھی سرزد ہوئیں۔

کلیانی شاہان چلکیا | راشٹر کورٹ کے بعد چلکیا ہی کا تیسرا خاندان راجہ تیل کی سرکردگی میں برسر اقتدار آیا، ایک دور ایسا بھی آیا جب چول خاندان کے حکمران نے اس خاندان کی مملکت کو روند ڈالا، مگر مختلف سیاسی عروج و زوال کے ساتھ اس خاندان کے حکمرانوں کی حکومت بارہویں صدی تک قائم رہی، اسی دور میں چلکیا خاندان کی ایک اور شاخ کلیان میں برسر اقتدار آئی، اور سنہ ۱۱۹۰ء اس حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا،

یہی زمانہ ہندوستان میں بودھ اور جین مذہبوں کے زوال و انحطاط کا ہے اسی زمانہ میں ایک نیا فرقہ سنہ ۱۱۶۷ء میں لنگائیت پیدا ہوا۔ جو برہمنوں سے چند امور میں بنیادی اختلاف رکھتا تھا۔ لیکن۔ شمالی ہند کی طرح جنوبی ہند میں بھی برہمن مت کو نئے سرے سے عروج ہو چکا تھا۔

ہوسل خانداں | ہوسل خانداں کی حکمرانی کا زمانہ سنہ ۹۷۳ء سے سنہ ۱۱۹۰ء تک رہا اس میں گیارہ فرمانروا گذرے۔ بارہویں اور تیرہویں صدی کے دوران میں ہوسل خاندان نے میسور میں بھی اقتدار حاصل کیا، ان میں راجہ بتی دیو ر سنہ ۱۱۱۱ء سے ۱۱۴۱ء نے نام پیدا کہ وہ جین مت کا پیرو ہو گیا تھا، چول خاندان نے جتنے مندروں کو جو برباد کیا تھا اس نے ان کی درستی کرائی اور اس مذہب کی ترقی ہوئی، مگر آگے چل کر اسی کے زمانہ میں مشہور مصلح رامانج کی تحریک کو مقبولیت ہوئی، یہ راجہ بھی ان کا پیرو ہو گیا، اور برہمن مت کو نئے سرے اقتدار حاصل ہوا، اور اس نے اپنا نام دشنو وردھن رکھ لیا۔ اس سلطنت کا خاتمہ سنہ ۱۳۱۰ء میں ملک کافور کے ہاتھوں سے ہوا۔ اور سنہ ۱۳۲۶ء میں اس کا پایۂ تخت بھی برباد ہو گیا۔

سلطنت خاندان یادو | اسی زمانہ میں دیوگری (دولت آباد) میں یادو خاندان

کو عروج ہوا، اس میں راجہ بھلم اور راجہ سنگھن (۱۲۱۰ء) امتیاز رکھتے ہیں، ۱۲۹۴ء
میں علاء الدین خلجی نے اس پر حملہ کیا، راجہ رام چندر نے چھ سو من موتی، دو من جواہرات
دے کر اپنی جان بچائی، ۱۳۰۹ء میں ملک کافور نے اس پر دوبارہ حملہ کیا اور اس نے
حملہ آوروں کی کامل اطاعت قبول کر لی، یہ دکن کا آخری ہندو خود مختار حکمران تھا، ۱۳۱۱ء
میں اس کے داماد ہرپال نے سر اٹھایا، مگر گرفتار کر کے مار ڈالا گیا، اور اسی پر سلطنت
یادو کا خاتمہ ہوا۔

یادو خاندان کی حکمرانی کے دور میں سنسکرت کے مشہور مصنف ہمادریت نے ادب
کی نمایاں خدمت انجام دی، ہندوؤں کے قانون پر بھی اس کی تصنیفات ہیں، اس کی تصنیفات
سے یادو خاندان کی یادتازہ ہے[1]۔

جنوبی ہند کی حکومتیں | دکن کی سطح مرتفع کے بعد سے راس کماری تک کا علاقہ جنوبی
ہند کہا جاتا ہے اس میں وہ ساحلی حصے بھی ہیں جو جدید اصطلاح میں مغربی و مشرقی گھاٹ
کہے جاتے ہیں، اس وسیع علاقہ میں احاطۂ مدراس کے اضلاع وزیگاپٹم و گنجام، میسور، کوچین
اور ٹراونکور کی دیسی ریاستیں شامل ہیں۔

تاملکم | یہ حصہ دراصل تامل قوم اور اس زبان کے بولنے والوں سے آباد ہے، اور
اسی وجہ سے قدیم زمانہ میں یہ تاملکم یعنی "تامل قوم کا ملک"، کہا جاتا تھا، تاملکم کی شمالی
حد شہر مدراس سے ذرہ اوپر مشرقی ساحل پر پلی کٹ تھی اور مغربی ساحل میں بدگر کے قریب
تھا تک، پھر یہ علاقہ شمال مشرق میں شہر تلورتک اور شمال مغرب میں منگلور سے جنوب دریائے
چندرگری تک وسیع ہو گیا[1]۔

تین سلطنتیں | جنوبی ہند کے متعلق قدیم روایات و آثار سے جو کچھ تاریخی مواد فراہم
ہو سکا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تامل سرزمین میں صرف تین ہی سلطنتیں پانڈیا، چول، اور
چیر یا کریل قائم تھیں۔

سلطنت پانڈیا | سلطنت پانڈیا شمال و جنوب میں دلا سعد اور کوتی اسی راس کماری

---

[1] قدیم تاریخ ہند اسمتھ باب ۱۵۔ دکن، ص ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۸،

تک اور مشرق و مغرب میں ساحل کارومنڈل سے درۂ اچھنکوول تک جوڑ اونکور میں دخل کا راستہ ہے۔ وسیع تھی، اس طرح اس میں مدرا اور تناولی کے اضلاع اور ترچناپلی کے کچھ حصے شامل تھے، کبھی ٹراونکور کے جنوبی حصے بھی آجاتے تھے، یہ سلطنت پانچ ریاستوں میں تقسیم تھی، اور موجودہ اصطلاح کے لحاظ سے ان میں وفاق قائم تھا، ان وفاقی ریاستوں کے سردار "پانچ پانڈیا" کہے جاتے تھے، قدیم زمانہ میں اس سلطنت کا صدر مقام ضلع مدرا کے مشرقی ساحل پر ایک جنوبی شہر منلور تھا، پھر ایک دوسرا مقام کورکئی پایۂ تخت بنا، یہاں جنوبی ہند کا تمدن بہت پھولا پھلا۔ اب ضلع تناولی میں دریائے تاراپرنی کے کنارے یہ شہر ایک معمولی سا گاؤں ہو کر رہ گیا ہے، کبھی یہ اہم بندرگاہ اور موتیوں کی تجارت کا مرکز تھا۔ ساتویں صدی تک اس کی تجارتی اہمیت قائم رہی، لیکن پہلی صدی عیسوی میں سلطنت کا مستقر مدرا ہو گیا تھا اور اس کا تجارتی کاروبار ایک نئے بندرگاہ کایل کی طرف منتقل ہو گیا جو صدیوں تک ایشیا کی سب سے بڑی منڈی رہا، مگر قدرتی تبدیلیوں سے آگے چل کر پرتگالیوں نے ایک دوسرا بندرگاہ تتی کورن بنایا، کایل میں اب مسلمان اور دیسی عیسائی ماہی گیروں کی آبادی باقی رہ گئی ہے۔

سلطنت پانڈیا کے تعلقات رومتہ الکبریٰ سے بھی قائم تھے، ۲۰ ق م میں شاہ پانڈیا کا سفیر آگسٹس سیزر کے پاس پہنچا تھا، تیسری صدی عیسوی تک ان دونوں حکومتوں میں تجارتی تعلقات قائم رہے۔

"تامل ادبیات میں جن سلاطین پانڈیا کا ذکر آیا ہے، ان میں دوسری صدی کے نیڈم چلین کو امتیاز حاصل ہے۔ مدرا میں علوم کی ایک اہم درس گاہ سنگم قائم تھی، جس نے تامل زبان کا بہترین ادب پیدا کیا، ادیبا تروولوا کی تصنیف "کرل" پہلی صدی عیسوی سے کچھ پہلے کی یادگار ہے، ہیون سونگ ۶۴۰ء میں جنوبی ہند میں گیا تھا، مگر سلطنت پانڈیا کے حدود میں نہ جا سکا۔ کچھ سنی سنائی باتیں درج کی ہیں، دسویں صدی عیسوی میں سلطنت پانڈیا نے آٹھویں سے دسویں صدی تک کی زور آزمائی کے بعد سلطنت چول کے عروج کے بعد اس کی اقتدار کو تسلیم کرلیا، اور یہ ایک باج گزار ریاست بن گئی۔ اس کے آگے کے زمانہ میں ۱۱۰۰ء سے ۱۵۶۷ء تک کے شاہان پانڈیا کے نام مل سکے ہیں

[illegible] ۱۹۵۰ [illegible]

سلطنت چول سلطنت چول کے حدود مشرق میں ساحل کارومنڈل کے ساتھ نلور سے پدکوتی تک اور مغرب میں کرگ تک قائم تھے۔ ان حدود میں زمانہ حال کی تقسیم کے لحاظ سے مشرق میں ضلع مدراس اور انڈین یونین کے چند اضلاع اور ریاست میسور کا ایک بڑا حصہ آگیا تھا۔ اس کا پایۂ تخت اُریور یعنی قدیم ترچناپلی تھا، اس سے پہلے منلور نام کی کوئی آبادی مستقر تھی، تامل زبان اس سلطنت کی بھی ملکی زبان تھی، پہلی دوسری صدی عیسوی میں چول کے تجارتی بندرگاہ ساحل کارومنڈل بنے ہوئے تھے اور تجارتی بیڑے روم و یونان، مصر، ملایا کے مجمع الجزائر وغیرہ سے آمد و رفت رکھتے تھے ان کا ایک اہم بندرگاہ دریائے کاویری کے دہانہ پر کاوری پٹم تھا، راجہ کرکال نے اس بندرگاہ کو آباد کیا تھا، دوسری صدی عیسوی میں سلطنت چیر نے اس کے اقتدار کو نقصان پہنچایا، مزید زوال پلو خاندان کے ہاتھوں آیا، یہاں تک کہ اسی موخرالذکر خاندان کے ۸۴۶ء میں خاتمہ کے بعد چول سلطنت نے نئی زندگی پائی، نویں صدی میں وجیالیا نے نئی زندگی ڈالی، پرانتک اول ۹۰۷ء میں تخت نشین ہوا، اس نے سلطنت پانڈیا کے دارالسلطنت مدرا کو فتح کیا۔ پھر لنکا پر فوج کشی کی۔ پھر ۹۸۵ء میں راجہ راجہ دیو اعظم نے اس سلطنت کو جنوب کی سب سے بڑی سلطنت بنا دیا۔ اس کے حدود میں احاطہ مدراس کا پورا علاقہ اور لنکا اور میسور کا بڑا حصہ شامل تھا۔ ۱۰۱۱ء میں اس کا بیٹا راجہ راجیندر تخت نشین ہوا، اس کا جنگی بیڑا عظیم الشان تھا چند جزائر پر بھی اس نے قبضہ کیا۔ اب اس سلطنت کا مستقر تنجور تھا، یہاں کا عظیم الشان مندر اسی کا تعمیر کرایا ہوا ہے جس میں تیئیسویں سنہ جلوس کی فتوحات کی تصاویر بھی کندہ ہیں اس میں مذہبی رواداری تھی، اس نے نیگ پٹم کے بندرگاہ پر برمیوں کو بودھ مت کا مندر تعمیر کرنے کی اجازت دی، ۱۰۶۷ء تک یہ مندر قائم تھا، مگر پادریوں نے اس کو برباد کر کے اس کے ملبے سے کلیسا تعمیر کرائے، ۱۰۱۸ء کے بعد اس سلطنت کے جنگی بیڑے نے خلیج بنگال کو عبور کر کے پیگو کے قدیم پایۂ تخت کدرام کو فتح کیا اور چند اور بندروں پر بھی قبضہ جمایا اور سلطنت پیگو سلطنت چول کا ایک حصہ بن گئی۔ یہ فتوحات ۱۰۲۵ء سے ۱۰۲۷ء کے اندر ہوئے پھر جزائر نکوبار اور انڈمان قبضہ میں آئے۔

ملہ مستند ہیں ۹۰۷ء

خاندان چول کا آخری حکمران بادشاہ کلوتنگ سوم تھا جس نے سنہ ۱۲۴۷ء سے چالیس برس تک حکومت کی، اس کی جانشینی کے لیے خانہ جنگیاں ہوئیں، یہاں تک کہ سنہ ۱۳۱۰ء میں پانڈیا خاندان نے نیا عروج پایا۔ مگر اسی زمانہ میں جنوبی ہند پر ملک کافور کے حملے شروع ہوگئے، اور اسلامی فتوحات سے جنوبی ہند کی تمام ریاستوں کا زور ٹوٹ گیا، چودھویں صدی میں وجیانگر کی ترقی ہوئی اور سنہ ۱۳۷۰ء میں انتہائی جنوب کا علاقہ اس سلطنت کے ہاتھ میں آگیا تھا۔

سلطنت چول اعلیٰ تمدن کی مالک تھی، ترچناپلی میں شاہی محل کا کھنڈر اب تک ان کی یادگار ہے۔ ایک عالی شان مندر بھی تھا جس میں دس گز سنگ موسیٰ کا تراشا ہوا بت موجود تھا مشہور و معروف ہندو فلسفی رامانج جی نے جو جنوب میں وشنو طریق کے سب سے بڑے رشی مانے جاتے ہیں۔ راجہ ادھراجندر (۱۰۶۳ء تا ۱۰۷۰ء) کے زمانہ میں ترچناپلی کے قریب سری رنگم میں سکونت اختیار کی، مگر راجہ شیو طریق کا معتقد تھا اس لیے رامانج جی یہاں کا قیام چھوڑ کر میسور چلے گئے اور اس کی وفات کے بعد یہاں واپس آئے اور اپنے مشن کی تبلیغ کرتے رہے[۵]

سلطنت چیر یا کرل | سلطنت چیر یا جس کو کرل بھی کہا جاتا ہے ساحل مالابار میں قائم تھی، جس میں موجودہ ضلع مالابار مع ٹراونکور اور کوچین شامل تھا، کرل کا اطلاق عموماً مغربی گھاٹ کی اس ناہموار زمین پر کیا جاتا تھا، جو چندرگری دریا کے جنوب میں واقع ہے، ٹراونکور کا جنوبی حصہ کبھی پانڈیا سلطنت کا جزو رہا اور پانڈیا چول، اور چیر کے حدود وقتاً فوقتاً گھٹتے بڑھتے رہے، تامل کے قدیم ادبیات میں اس سلطنت کے پانچ اضلاع پوجی کدم، کدّم، ودین اور کرکا کا ذکر آیا ہے، دو اہم بندرگاہیں ایک مزرس (موجودہ کرنگنور) اور دوسرا ایکرنی (بندر کوٹیم) تھا عرب سے مزرس تک چالیس دن کی مسافت تھی، اور ان دونوں ملکوں میں عہد قدیم سے تجارتی رشتہ قائم تھا، اور عربوں کی تجارتی کوٹھیاں مدتوں پہلے یہاں قائم ہوئی تھیں، اس کا قدیم پایہ تخت ونجی یا کرور تھا جو آج کل ایک گاؤں

[illegible]

ترو کرور کے نام سے کو چین سے ۲۰ میل شرق شمال مشرق میں موجود ہے، پھر اس کا پایۂ تخت
ترو نجی کلم بنا، پھر سرزمین کونگو بھی اس سلطنت کے حدود میں آ گئی۔ اس سلطنت کی سیاسی تاریخ
دوسری صدی عیسوی سے آگے دریافت نہ ہو سکی ہے۔ قدیم حکمرانوں میں راجہ چن کتّوں کا حال
معلوم ہو سکا ہے۔ پھر ٹرادنکور کے راجاؤں کا حال ۱۱۲۵ء تک معلوم ہو سکا ہے، پھر ٹراونکور
کے راجاؤں کا حال ۱۱۲۵ء تک معلوم ہو سکا اور اس کے بعد دو صدیوں کے راجاؤں کی تقریباً
مکمل فہرست تیار ہو سکی ہے۔

تاملکم یعنی تامل کی ان تین سلطنتوں کی سرزمین کا تمدن، تہذیب، مذہب اور رہن سہن
شمالی ہند سے مختلف تھا۔ اس کا اندازہ تامل زبان کی ان قدیم نظموں سے ہوتا ہے جو پہلی
سے تیسری صدی عیسوی تک میں لکھی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی علاقے سے آئے
ہوئے لوگوں نے جو مدرا وغیرہ میں آباد ہو گئے تھے۔ شمالی ہند کے تمدن، معاشرت، اور
تہذیب، ہندو رسوم اور ذات پات کی تقسیم کو رواج دینا چاہا۔ مگر ان کی سخت مخالفت
کی گئی، اسی طرح ان کا مذہب "دیو پرستی" تھا، مگر آگے چل کر رفتہ رفتہ شمالی ہند کے اثرات
یہاں پہنچے، ان کی "دیو نی کنونی" نے شیوجی کی استری درگا کی جگہ حاصل کر لی۔ برہمنی مذہب
کے ساتھ جین اور بودھ مت آگے چل کر روشناس ہوئے، جین مذہب کا اثر سب سے
پہلے میسور میں داخل ہوا، جہاں شمالی ہند کے قحط سے پریشان ہو کر لوگ جا بسے تھے۔ یہیں ان
کے مذہبی پیشوا بھدر باہو نے جین مت کے اتباع میں اپنے کو برت رکھ کر ہلاک کیا، جنوبی
ہند کے جینی اس کو پیشوا مانتے ہیں، ۱۸۰۰ء میں یہی مذہب میسور میں سب سے زیادہ مروج
تھا، اسی طرح بودھ مت یہاں مہاراجہ اشوک کے مبلغوں کے ہاتھوں پہنچا، چند صدیوں میں
اس کو فروغ حاصل ہوا، مگر وہ حکمران مذہب کی حیثیت کبھی یہاں اختیار نہ کر سکا، ساتویں صدی
عیسوی سے اس کو زوال آیا اور جین اور برہمنی مت نے اس کی جگہ لے لی، پھر برہمنی مذہب
کو یہاں اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ شمالی ہند سے زیادہ ذات پات کی پابندیاں پھیل گئیں
ورنہ قدیم تامل قوم میں اونچ نیچ ذاتوں میں کوئی تمیز نہ تھی ان میں انسانوں کی پانچ مجلسیں
یا قسمیں تھیں، عوام الناس، مذہبی پیشوا، منجم، طبیب اور وزرائے سلطنت لیکن ان میں

باہم کوئی ایسا فرق مراتب نہ تھا کہ اونچ نیچ جاتیوں کا تصور پیدا ہوتا۔

تامل قوم میں نظم و ضبط، اور فنون لطیفہ کی لطافتیں موجود تھیں اور وہ تجارت، صنعت اور زراعت سے خوش حال اور فارغ بال رہتے تھے، موتی، مرچیں اور مینا یہاں کی خاص پیداوار تھی۔ اور ان کی تجارت دور دور ملکوں سے ہوتی تھی، ان کے تجارتی بیڑے مشرق و مغرب میں آتے جاتے تھے، اسی تعلق سے رومتہ الکبریٰ کا سکہ بھی یہاں چلتا تھا، اور کھدائی میں دستیاب بھی ہوا ہے۔ تامل زبان کے ادب کا بہترین زمانہ پہلی تین صدی عیسوی میں گذرا ہے مختلف فنون لطیفہ موسیقی، ڈراما، مصوری اور سنگ تراشی میں امتیاز رکھتے تھے، ڈراموں میں حسن و عشق کے افسانے اور رزمیہ داستانیں دونوں موجود ہیں[۱]۔

خاندان پلو کا عروج و زوال جنوبی ہند کی ان تین سلطنتوں کے علاوہ ایک اور خاندان پلو برسر اقتدار آیا۔ انھوں نے چوتھی سے آٹھویں صدی عیسوی تک جنوبی ہند کی سیاسیات میں اثر انداز طاقت حاصل کی، ان کا کوئی مستقل مستقر نہ تھا۔ ان کی طاقت ہمسایہ حکومتوں کی کمزوریوں سے حاصل ہوا کرتی تھی، اور اس چلتی پھرتی قوم کی معرکہ آرائیاں وقتاً فوقتاً تینوں حکومتوں سے برپا رہیں، اور مرہٹوں کے چوتھ کے طریق سے یہ بھی تحصیل وصول کیا کرتے تھے، آخر میں چول سلطنت کا خاتمہ ان ہی کے ہاتھوں سے ہوا، اس خاندان کا ایک راجہ کانچی میں حکمران تھا جس کی سرگزشت تانبے کی لوحوں پر پراکرت زبان میں کندہ موجود ہے۔ کانچی کا راجہ وشنوگپت جس کو ۳۵۰ء میں سمندر گپت نے شکست دی تھی، اسی خاندان کا تھا۔ اسی طرح قدیم تاریخ کے ایک دور راجہ ہستی ورمن اور سمہوورمن اسی خاندان کے تھے پھر سمہو وشنو (۵۷۵ء) آیا اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے تینوں تامل سلطنتوں اور لنکا کے راجہ کو شکست دی، پھر مہندرورمن اول (۶۰۰ء۔۶۲۵ء) اس کا جانشین ہوا جس نے ترچنا پلی چنگل پٹ شمالی اور جنوبی ارکاٹ کے اضلاع میں سنگی مندروں کو کھدوا کر اپنا نام روشن کیا، پھر مہندرواری میں بھی اس کی عمارتوں کے کھنڈر موجود ہیں، ایک تالاب کھدوایا جس پر وشنو کا مندر اب تک قائم ہے، نرسمہوورمن (۶۲۵ء۔۶۴۵ء) کے دور میں پلو نے نہائی عروج حاصل کیا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت [illegible] تک وسیع کر لیا تھی، ہیون سانگ

---

[۱] قدیم تاریخ ہند سمتھ ص [illegible]

اسی دور میں کانچی میں آیا، اسی عہد کی قدیم یادگار رمائل پورم کے سات مندر ہیں جو آج کل دھرم راج رتھ کہے جاتے ہیں، پلو خاندان کے آخری راجہ دوسری بڑی سلطنتوں کے باج گزار بن گئے، تیرھویں صدی تک ان کی حکمرانی رہی، یوں چھوٹے امرا ستر ھویں صدی تک پائے گئے ہیں اس کے بعد پلو کا امتیازی نام ختم ہوگیا۔ اور وہ کلّر، پلّی اور دلالی قوموں میں ضم ہوگئے۔

پدکوتئی کی باج گزار ریاست کا راجہ جو کلّر قبیلہ کا مسلّم سردار ہے۔ اب تک اپنے کو راجہ پلّو کہتا ہے، اور اسی قدیم شاہی خاندان کی اولاد میں سے ہونے کا دعویدار ہے، اور مورخین ان کے اس دعوے کی تاریخی اور معاشرتی عادات وخصائل کی بنیاد پر تصدیق وتائید کرتے ہیں،[1] اس طرح اگرچہ "اسلامی فتوحات کا سیلاب" اس خاندان کا خاتمہ نہ کرسکا، لیکن اسلام کے روحانی اثرات سے وہ بے نیاز نہ رہ سکا جس کی حکومت صرف جسم اور ملک پر نہیں دل، دماغ، ضمیر اور عقیدہ پر چھا جاتی ہے

---

[1] قدیم تاریخ ہند اسمتھ ص ۶۰۲ و ۱۴۷ تا ۲۲۴۷ ہند کا قدیم مرقع تیار کرنے میں اسمتھ کی ضخیم قدیم تاریخ ہند، تاریخ ہند مرتبہ ہاشمی اور آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا خاص طور پر سامنے رہی،

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت سے پہلے کی

پُرامن اسلامی نو آبادیاں

ہندوستان میں اسلام کے روحانی فتوحات کے اثرات کے مظاہر یہاں مسلمان کے ملکی فتوحات سے زیادہ روشن اور نتیجہ خیز رہی ہیں۔ اگرچہ قدیم ہند کی سیاسیات اور سلطنتوں کے عروج وزوال اور مختلف قدیم حکومتوں کے خاتمہ کے ضمن میں ہندوستان سے مسلمانوں کی وابستگی کا ذکر جیسا کہ اوپر گزرا تاریخ میں کشورکشاؤں کے لباس میں آتا ہی لیکن درحاصل ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلہ کا تعلق ان کشورکشاؤں سے نہ تھا، بلکہ ان کے فاتحانہ دخلہ سے بہت پہلے اسلام کا پیام اس دیار میں پہنچ چکا تھا اور اپنے غیر فانی نقوش وہ قائم کرچکا تھا، جس طرح آریوں کے مختلف قافلے ہندوستان میں مختلف موقعوں پر آتے رہے، اسی طرح عربوں اور ترکوں کے قافلے بھی جو اسلام قبول کرچکے تھے، سرزمین ہند میں آئے اور یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے رہ بس گئے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ پرامن آبادیاں شمالی وجنوبی ہند دونوں میں قائم ہوئیں اور ان کے مستند تذکرے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں، اگرچہ وہ اتنے روشن نہیں، کہ مغربی مصنفین اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ہندوستانی مورخین کی نگاہ میں آسکے ہوں، چنانچہ جنوبی ہند کی تاریخ کے محقق مسٹر سندرام پلے جو ٹراونکور کے باشندے ہیں، اپنے خطہ ملک کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"یہاں اسلامی فتوحات کے سیلاب کا بہت کم اثر پڑا ہے، اس لیے بیدقبہ

> ایسا ہو کہ ہندوستان بھر میں یہیں کسی بیرونی اثر نے کام نہیں کیا اور یہیں ہندوستان کو دیسی حیثیت میں دیکھا جا سکتا ہو، ... جہاں ہندوستان کے قدیم ترین اقوام کے مذہب، قوانین، رسوم، اور اوضاع و اطوار کے زندہ جاوید نمونے موجود ہیں۔[1]

حالاں کہ یہی علاقہ جو لائق محقق کے خیال میں "بیرونی اثرات" سے محفوظ رہا، عربوں کے اثر سے سب سے پہلے متاثر ہوا۔ یوں تو "عرب و ہند کے تعلقات" کا سراغ عہد قدیم سے لگایا گیا ہے اور اس موضوع پر محققانہ مستقل تصنیف چھپ چکی ہے، اور عہد قدیم میں ان دونوں کے تجارتی، علمی اور مذہبی تعلقات کا تفصیلی مرقع ہماری نگاہوں کے سامنے آ چکا ہے، لیکن عرب میں ظہور اسلام کے بعد جو دور آیا۔ اس کے مذہبی و اخلاقی انقلاب کے اثرات بھی ان ہی واسطوں سے جلد سے جلد یہاں پہنچ گئے اور اس کا زمانہ درہ خیبر سے آنے والے کشورکشاؤں سے صدیوں پہلے گذرا ہے، تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے ایسے عرب سیاحوں اور تاجروں کے سفرنامے اور جغرافیہ کی کتابیں ہندوستان کے متعلق موجود ہیں، جو ہندوستان میں آتے جاتے رہے، سلیمان تاجر (سنہ ۲۳۷ھ) ابن خرداذبہ (سنہ ۲۵۰ھ) ابو زید حسن سیرافی (سنہ ۲۶۴ھ) بزرگ بن شہریار۔ (سنہ ۳۰۰ھ) ابو دلف مسعر بن مہلہل (سنہ ۳۳۱ھ) مسعودی (سنہ ۳۰۳ھ) اصطخری (سنہ ۳۴۰ھ) ابن حوقل (سنہ ۳۳۱ھ) بشاری مقدسی (سنہ ۳۷۵ھ) البیرونی (سنہ ۴۰۰ھ) اور ابن بطوطہ (سنہ ۷۷۹ھ) کے قلم کی ایسی دستاویزیں ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں، جن کے معلومات و مباحث و بیانات ہند قدیم کے چینی سیاحوں سے زیادہ اہم اور کارآمد ہیں لیکن یورپ کے مورخین نے ہندوستان کی تاریخ کی ترتیب میں ان پر نگاہ نہیں ڈالی، اس لیے ابھی تک وہ ایسے روشناس نہیں کہ ان کے معلومات سے ہندوستان کی تاریخ کی کڑیاں صحیح طور پر ملائی جا سکیں۔

عرب تاجروں اور جغرافیہ نویسوں کی ان اہم تصنیفات میں ہندوستان کی تاریخ کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ زمانۂ حال میں ہندوستان کے مسلمان مورخین نے ان پر

---

[1] قدیم تاریخ ہند اسمتھ ص ۶۹۸، ۶۹۹

توجہ کی ہے، اور توقع ہے کہ ان کے ہاتھوں سے تاریخ ہند کی نئی کڑیاں جڑ جائیں گی،
ان عرب محققین کی تصنیفات میں ہندوستان کی ان پرانی آبادیوں کا ذکر تفصیل سے آیا
ہے، جو اسلامی حملوں سے پہلے یہاں قائم ہو چکی تھیں، اور اپنے مذہبی، روحانی اور اخلاقی
اثرات سے یہاں کے باشندوں کو متاثر کرتی رہیں اور اس زمانہ کے برہمنی، بودھی اور جینی
راجاؤں نے ان کا اور ان کے معتقدات کا احترام کیا، اور ان سے نئی باتیں سیکھیں
اور ہندوالوں کو سکھائیں۔

لنکا | ہندوستان میں پرامن آبادیوں کا آغاز جزیرۂ سرندیپ (لنکا) سے ہوا۔
جہاں مسلمان درویش قدم آدم کی زیارت کے لیے پہلی مرتبہ آئے، یہ ساتویں صدی کے
آغاز میں سنہ ۱۲ھ کا واقعہ ہے، یہاں عربوں کی آمد و رفت اسلام کے پہلے سے قائم تھی، اس لیے
اسلام کے ظہور کے ساتھ ہی ان ہی عربوں کی زبانی سراندیپ کے راجہ اور عوام کو اسلام اور
مسلمانوں کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا، اور فرشتہ کا بیان تو یہ ہے کہ اس بودھ مت
کے پیرو راجہ نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا[1]، بہرحال اس کا میلان مسلمانوں کی طرف غیر معمولی
ہمدردانہ تھا اور عجائب الہند کے مصنف کے بقول اس نے تحقیق حال کے لیے عرب میں اپنے
سفیر بھی بھیجے تھے جن میں سے ایک واپس آسکا، اور اس نے یہاں صحیح حالات بیان کیے، بلاذری
(۲۷۹ھ) کا بیان ہے کہ یہاں کے حکمران نے ان مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کو پہلی صدی
ہجری میں عراق روانہ کیا جن کے باپ اس جزیرہ میں تجارت کرتے تھے اور بے وارث
چھوڑ کر مر گئے تھے، یہ لنکا میں مسلمانوں کی پہلی نو آبادی تھی۔

مالدیپ | مسلمانوں کا دوسرا مرکز جزیرۂ مالدیپ تھا۔ یہاں بہت پہلے سے
اسلامی نو آبادی قائم ہوئی، اس پر کبھی فوج کشی نہیں کی گئی۔ مگر آٹھویں صدی ہجری میں
اس جزیرہ کے سارے رہنے والے خواہ عرب ہوں، یا دیسی باشندے مسلمان تھے جو شیخ
ابوالبرکات کے ہاتھ پر یہاں کے آخری راجہ شنورازہ کے اسلام قبول کرنے پر مسلمان ہو گئے
تھے۔ اس نو مسلم راجہ نے یہاں کی مسجد پر یہ کتبہ کندہ کرایا،

---

[1] فرشتہ ج ۲ ص ۳۱۱ [2] عجائب الہند ص ۱۵۵، ۱۵۷ [3] فتوح البلدان ص ۴۳۵،

"سلطان احمد شنورائرہ ابوالبرکات مغربی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا"[۱]

اس وقت سے آج تک یہاں مسلمان ہی آباد ہیں،

مالابار مسلمانوں کا تیسرا مرکز وہی خطۂ مالابار ہے، جس کا ذکر اوپر گزرا، یہاں عرب تاجروں کی آمد و رفت پہلے سے قائم تھی، مسلمان درویشوں کا پہلا قافلہ تیسری صدی ہجری کے شروع میں کدنگانور میں اترا، یہاں کا حکمران "زمورن" اسلام کے متعلق پہلے سے کچھ حال سن چکا تھا، مسلمان درویش اس کی دعوت پر سراندیپ سے واپس آئے۔ اور اسلام کی حقیقت کو ایسے موثر انداز میں بیان کیا کہ راجہ اسلام کی طرف مائل ہوگیا۔ اس نے اپنے سرداروں سے کہا، وہ اب خدا کی یاد کرنا چاہتا ہے، وہ ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا وہاں سے سرداروں کو خطوط لکھ کر دین کی تبلیغ اور اس کی حمایت کرنے کی دعوت دیتا رہا، عربوں نے یہاں سوداگری کا کاروبار شروع کیا، راجہ کی ہدایت کے مطابق یہاں کے حکمران پردیسی سوداگروں سے لطف و محبت سے پیش آئے مسجدیں تعمیر کی گئیں اور عرب مستقل طور پر یہاں سے آنے جانے اور رہنے سہنے لگے، تحفۃ المجاہدین کا مصنف لکھتا ہے،

> "اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے شہر آباد ہو گئے، مسلمانوں کی تجارت سے ان کی آبادی بڑھ گئی۔ یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں ... وہ مسلمانوں کے مذہب اور شعائر کا بہت پاس و لحاظ رکھتے ہیں بہت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے تعجب ہوتا ہے، کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں، ...... غرض ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے کیونکہ ان کے ملک میں ان شہروں کا آباد ہونا انہی مسلمان تاجروں کی بود و باش کا نتیجہ ہے"[۲]

مالابار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکین وطن ہیں جو موپلا اور نایت کے ناموں سے ہندوستان میں مشہور ہیں اور جن کے ہاتھوں ... [illegible]

۱؎ رحلہ ابن بطوطہ ص [illegible] ۲؎ تحفۃ المجاہدین بحوالہ دعوت اسلام ص [illegible] ۳؎ عرب و ہند ص ۶۶۹

ٹراونکور | اسی طرح خاص ٹراونکور کے شہر کولم میں مسلمانوں کا ایک محلہ آباد تھا جس میں ان کی جامع مسجد بھی تھی[۱]،

کارومنڈل | جنوبی ہند میں مسلمانوں کی چوتھی نوآبادی کارومنڈل (معبر) میں قائم ہوئی، یہاں مسلمانوں نے دوسری نوآبادیوں کے خلاف امور مملکت میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ ساتویں صدی ہجری میں یہاں کا دیوان سندر پانڈے راجہ بن بیٹھا، اور ملک تقی الدین بن عبدالرحمن طیبی اس راجہ کا وزیر و مشیر خاص مقرر ہوا۔ تقی الدین کے بھائی، جمال الدین ابراہیم سے ۱۴ سو عربی گھوڑے ہر سفر میں لاکر دینے کا معاہدہ قائم تھا، سندر پانڈے کی وفات کے بعد یہ سلطنت اس کے مشیروں اور نائبوں میں بٹ گئی اور جمال الدین وزارت کی مسند پر آگیا[۲]، مارکو پولو اس کے بعد یہاں آیا۔ اس نے گھوڑوں کے یہاں لانے کا ذکر کیا ہے۔ جنوبی ہند پر علاؤ الدین خلجی کا حملہ اس کے بعد ہوا ہے، اس موقع پر یہ بات بھلائی نہ جائے گی، کہ خلجی کی ترکی فوجوں کے مقابلہ میں راجہ کی جو فوج لڑی اس میں عراقی و عرب مسلمان بھی تھے اس طرح سمندر کی راہ سے آنے والے مسلمانوں نے درۂ خیبر سے آنے والے ترکی مسلمانوں کا پہلی مرتبہ ہند کی سرزمین پر ہندو راجاؤں کی طرف سے "ہندو حکومت" کی حمایت میں تلوار چلائی، خسرو نے خزائن الفتوح میں ان مسلمان مدافعین کو برا بھلا کہا ہے[۳]۔ مگر وہ عرب مسلمان اس حقیقت سے آگاہ تھے، کہ یہ کوئی مذہبی لڑائی نہیں تھی، یہ کشورکشائی کی جنگ تھی، اور اس کو خالص ملکی حیثیت حاصل تھی، معاہدہ کے رو سے وہ پابند تھے، کہ یہاں کی حکومت کی طرف سے حملہ آوروں کا مقابلہ کریں، چاہے وہ جس نسل اور عقیدہ کے لوگ ہوں۔

گجرات و بمبئی | عربوں کا پانچواں مرکز گجرات، کاٹھیاواڑ، کچھ اور کوکن کا علاقہ تھا، جہاں ولبھ رائے یا عربوں کے محبوب راجہ بلہرا کی حکومت تھی بسلیمان تاجر کے بیان کے مطابق یہاں کے راجاؤں سے مسلمان سوداگروں کے بڑے اچھے تعلقات قائم تھے،

---

[۱] تقویم البلدان ص ۳۶۱ [۲] جامع التواریخ در ایلیٹ ج ۱ ص ۶۹ [۳] خزائن الفتوح ص ۱۶۱، ۱۶۲ و ایلیٹ ج ص

یہاں عربوں کی آبادیاں کثرت سے قائم ہوئیں۔ اسی طرح طاقن (دکھنی دکن) کے حکمراں بھی ان کے دوست تھے البتہ اگر گوجر حکمران سے اچھے تعلقات نہ تھے[۱]، بزرگ بن شہریار نے یہاں کی بہت سی مسلم نوآبادیوں کا ذکر کیا ہے۔ محمد بن مسلم سیرافی بیس سال تک تھانہ (بمبئی) میں مقیم رہا، چیمور میں بھی لوگ آباد تھے گو اکے راجہ کا مشیر ایک مسلمان موسیٰ نامی تھا[۲]۔ گجرات میں مسلمانوں کے مقدمات کے فیصلہ کے لیے ایک مستقل مسلمان قاضی حکومت کی طرف سے رہتا تھا، اس کو اصطلاح میں "ہنرمند" کہتے تھے، مسلمانوں کے سارے مقدمے اسی کی عدالت میں جاتے تھے[۳]۔ چیمور میں راجہ کی طرف سے عباس بن ماہان ہنرمند مقرر تھا[۴]، مسعودی ۳۰۴ھ میں چیمور آیا، وہ کہتا ہے، اس راجہ کی حکومت میں اسلام معزز اور محفوظ ہے، مسلمانوں کی مسجدیں اور جامع مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ یہاں کے راجاؤں کا عقیدہ ہے کہ وہ چالیس چالیس پچاس پچاس برس اپنے اسی عدل و انصاف کی بدولت حکومت کرتے ہیں۔ جو وہ مسلمانوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں، مسعودی نے چیمور میں مسلمانوں کی کی آبادی دس ہزار لکھی ہے، جن میں سے بیشتر بیاسرہ کہے جاتے تھے، یہ عربی ہندی نوجوں کی ملی ہوئی نسل سے تھے اور ان کا مولد ہندوستان تھا۔ ان کے علاوہ سیراف عمان، بصرہ، اور بغداد وغیرہ کے لوگ آباد تھے، بیاسرہ میں سے موسیٰ بن اسحٰق جیسے معزز سوداگر اور سعد بن زکریا ہنرمند چیمور وغیرہ تھے[۵]، اسی طرح تھانہ (نزد بمبئی) میں کثیر ہندو آبادی کے ساتھ مسلمانوں کی نوآبادی بھی قائم تھی[۶]، اسی طرح کھمبایت میں مسلمانوں کی آبادی اور مسجدیں اسلامی حملہ کے پہلے سے قائم تھیں۔ جن میں امام و خطیب مقرر تھے[۷]۔ ابن حوقل نے کھمبایت سے چیمور تک کے وسیع علاقہ میں کثیر ہندو آبادی کے ساتھ منتشر اسلامی آبادیوں کا ہونا اور ان میں جامع مسجدوں اور پھر ان میں

---

[۱] سلیمان تاجر ص ۲۶ تا ۲۹ [۲] عجائب الہند ص ۱۴، ۱۵۲، ۱۵۷، [۳] ابن حوقل ص ۲۳۳ [۴] عجائب الہند ص ۱۴۲ [۵] مروج الذہب ج ۱ ص ۳۸۲، ۳۸۴، [۶] تقویم البلدان ص ۳۵۹ - [illegible]

علی الاعلان اذان کا دیا جانا بیان کیا ہے[1]۔ اسی طرح ابن بطوطہ نے دہلی سے کھمبایت اور وہاں سے کاردمنڈلی[2] کا سفر کیا تھا۔ یہ پورا علاقہ اس وقت تک اسلامی حکمرانی سے خالی تھا، مگر اسلامی آبادیاں قبضہ ہو چکی اور عالی شان مسجدیں آباد تھیں[3]۔ اسی طرح گاذی اور گندھار جو بھروچ کے بندرگاہ تھے مسلمانوں سے آباد تھے یہاں کے ہندو راجہ جالبینی کے درباریوں اور افسروں میں بھی داخل تھے۔ اس علاقہ میں بیرم، گوگہ، چندا پور، اور ہنور (نزد بمبئی) ایسے مقامات تھے، جو مسلسل چھوٹے چھوٹے مسلمان امیروں کی حکومت میں تھے اور ہندو راجاؤں کو ان سے کوئی پرخاش نہ تھی، حالاں کہ اگر وہ چاہتے تو چشم زدن میں انہیں بے دخل کر سکتے تھے۔

چند دیگر علاقے | اسی طرح اس نے ملیبار، ابی سرور، باگنور، منگلور، ہیلی جوپٹن، وہ پٹن، بدھ پٹن۔ پنڈارانی، کالی کٹ، کولم، جالیات، مالدیپ سیلون گالی، کاردمنڈل، دوارسمندر اور وجیانگر کی پررونق اسلامی آبادیاں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے خوش گوار تعلقات، مسلمانوں کی خوش حالی، اور عالی شان مسجدوں، خانقاہوں، وغیرہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، وجیانگر میں آخر دور میں ہندوؤں کی مضبوط و مستحکم حکومت قائم تھی جس نے سلاطین بہمنی کو دریائے کرشنا پار ہونے نہیں دیا مگر کتنے تعجب کی بات ہے کہ اس زمانہ میں بھی جب کہ مسلمان اگر ظاہری مذہب کے ناتے سے جانتے تو مسلمانوں کی حکومت میں نوکریاں کر سکتے تھے، بایں ہمہ وجیانگر کی فوج میں دس ہزار مسلمان موجود تھے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ وجیانگر کے راجہ ان مسلمان سپاہیوں کی عزت کرتے تھے، ان کے لیے مسجدیں تعمیر کرا دی تھیں۔ اور قرآن مجید کا احترام کرتے تھے[4]۔

سندھ | سندھ کو مسلمانوں نے پہلی صدی کے آخر میں فتح کیا۔ مگر اسلامی بستی یہاں اس سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی۔ چنانچہ پانچ سو عرب مسلمان ایک عرب سردار کی ماتحتی میں مکران سے بھاگ کر راجہ داہر کے یہاں چلے آئے تھے[5]۔

---

[1] تقویم البلدان ص ۷ ص ۲ ، جامع الحکایات عوفی [2] ابن حوقل ص ۳۳۲ [3] ابن بطوطہ ج ۲ [illegible]

کشمیر کشمیر کے متعلق عام شہرت ہے کہ اس کو بادشاہوں کی تلواروں نے نہیں درویشوں کی تاثیروں نے فتح کیا، ساتویں صدی میں اسلام کا پیام ہمسایہ ممالک چین وتبت میں پہنچ چکا تھا۔ کشمیر کی مشہور تاریخ راج ترنگنی کے بیان کے مطابق نویں صدی عیسوی میں مسلمان تاجر یہاں موجود تھے اور سری نگر سے[۱] تیس میل پر ایک موضع میں مسلم نوآبادی کا ذکر دسویں صدی میں آیا ہے اور راجہ ہرش دیو کی فوج میں مسلمان افسر موجود[۱] تھے جب محمود کے حملے کے بعد ۱۰۳۲ء میں مسعود نے اس پر حملہ کیا۔ تو قلعہ بند اہل شہر میں مسلمان تاجر بھی موجود[۲] تھے۔ کشمیر کے ان درویشوں میں جن سے اسلام کا پیام کشمیر میں گھر گھر پہنچا، حضرت بلبل شاہ کا نام پہلے آتا ہے جو بارہ سو مریدوں کے ساتھ ۱۲۹۵ء میں کشمیر کی وادی میں داخل ہوئے۔ اور ان کے اثر سے ۱۳۲۵ء میں یہاں کے راجہ رنچو نے اسلام قبول کر لیا اور پھر لوگ جوق جوق مسلمان ہونے لگے، پھر شہاب الدین کے زمانہ میں حضرت سید حسین سمنانی اور قطب الدین کے دور میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کشمیر میں تشریف لائے تو اس تیزی سے اسلام پھیلا کہ کہا جاتا ہے کہ پورے کشمیر میں صرف گیارہ خاندان ایسے باقی رہ گئے جو اپنے آبائی مذہب پر قائم[۳] تھے۔

پنجاب و صوبہ سرحد یوں تو سندھ اور ملتان کے اثر سے پنجاب میں اسلام کی روشنی ساتویں صدی عیسوی ہی میں پہنچ چکی تھی اور تاجروں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی، پھر نویں صدی میں اسیوان کے راجہ جو موجودہ پنجاب و صوبہ سرحد میں سے کسی مقام پر دہلی سے سو فرسخ پر واقع تھا، کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ پیش آیا اس کا لڑکا پجاریوں کی دعاؤں اور بتشین گوئیوں کے خلاف زندہ نہ رہ سکا تھا۔ اس صدمہ سے وہ ہندومت سے برگشتہ ہوا اور مسلمان مبلغین کو بلا کر اسلام

---

[۱] اسلامی نوآبادیوں کی تحقیق کے سلسلہ میں عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۵۱ تا ۳۰۱ سامنے رہی ہے
راج ترنگنی ص ۷، ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۶ و نگارستان کشمیر ص ۲۹، ۳۰، ۴۴، ۶۶ [۲] فرشتہ ج ۱ ص ۴۱
[۳] اقوام کشمیر ج ۱ ص ۶۰ ... ۳۷۲ -

قبول کر لیا، یہ واقعہ ۲۱۸ھ سے ۲۲۷ھ کے اندر پیش آیا۔[1]

دوآبہ اسی طرح شمالی ہند میں پنجاب سے بنارس تک کی سرحد میں وقتاً فوقتاً اسلامی آبادیاں اس وقت قائم ہوئیں، جب مسلمان حملہ آوروں کی تلواریں وہاں نہیں پہنچی تھیں، ایسی نومسلم نوآبادیوں کے اشارات اس مجموعہ کے ایک مضمون "حضرت سید سالار مسعود غازی" میں سرسری طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

بنگال و بہار یہی حال بنگال و بہار وغیرہ کا ہے، اگرچہ مورخین نے اس علاقہ میں اسلام کے پہنچنے کا زمانہ بارہویں صدی عیسوی یعنی بختیار خلجی کے ورود کے بعد متعین کیا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ تحقیق تشنہ ہے، دراصل یہاں اسلام کا پیام پہلی مرتبہ مغرب کی راہ کے بجائے شمال و مشرق سے پہنچا، چین اور انڈونیشیا وغیرہ جزائر میں اسلام تاجروں اور سوداگروں کے ہاتھوں بہت پہلے پہنچا، اور جہاں جہاں وہ جاتے تھے، درویشوں کے قافلے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے سفر کرتے تھے، اس لیے بنگال میں بھی اسلام کی تعلیمات چین اور مجمع الجزائر ہی کی راہ سے پہنچیں، اگر صوفیہ کے تذکروں کا مطالعہ تفحص سے کیا جائے، تو اس نظریہ کی تائید میں مناسب دلیلیں مل سکتی ہیں البتہ بختیار خلجی کے ورود کے بعد اسلام کی تبلیغ یہاں تیزی سے ہوئی اور داعیان اسلام اس کے طول و عرض میں پھیل گئے اور ان اثرات کو شاہی محل کی چار دیواری بھی روک نہ سکی اور اس پورے علاقہ میں مذہب کے مقابلہ میں رواداری کا عام جذبہ پیدا ہو چکا تھا، چنانچہ ۱۴۱۴ء میں جب راجہ کنس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے راجہ جیت مل نے سرداروں کو اپنے تبدیلی مذہب کے ارادہ سے آگاہ کیا اور کہا کہ اگر وہ اس کی وجہ سے اس کا گدی پر رہنا پسند نہ کریں

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۴۶، لیکن یہ قیاس نہ کیا جائے کہ ایسے کفر و عناد میں اسلام کو یہاں فروغ حاصل ہوا، ایسی مثالیں شاذ و نادر ہیں اور یہ لطیفہ بھی ذکر کئے جانے کے لائق ہے کہ اسی قسم کی ایک دوسری مثال اس کے برعکس بھی گزری ہے، مقدسی کا بیان ہے کہ ملتان میں قبر کی رو سے جب بتوں پر زینت بتیں تھیں تو سونے چاندی کی معلوم ہوتی تھیں یہاں تک کہ [illegible] جب مقدسی یہاں [illegible]

[illegible]

تو وہ اپنے بھائی کے حق میں حکومت سے دستبردار ہو جائے۔ عالی ظرف سلطان نے اس کے جواب میں کہا کہ "راجہ کو اختیار ہے، وہ اپنا جو مذہب چاہے رکھے وہ ہر حال میں ہمارا بادشاہ ہے" اس کے بعد اس نے علانیہ دربار میں اپنا مذہب تبدیل کیا، اور بہت سے دوسرے ہندوؤں نے بھی اس کی پیروی کی، اس کے بعد اس نے اپنا نام جلال الدین محمد شاہ رکھا[1]

اسلامی نو آبادیوں کے باشندے شمالی اور جنوبی ہند میں اسلامی حکومتوں کے تسلط سے پہلے اسلامی نو آبادیوں کی اس کثرت سے یہ شبہ نہ ہو کہ یہ سب کے سب باہر سے آئے ہوئے مسلمان تھے بلکہ اس میں تمام تر مسلمان فقیروں، درویشوں، صوفیوں اور عالموں کی ان دینی خدمتوں کے آثار تھے جو یکہ و تنہا پوری آبادی میں چلے جاتے یادِ الٰہی میں مصروف رہتے، اور اپنے اسوۂ عمل سے اس آبادی کو اپنا گرویدہ بنا لیتے اور چند دنوں کے قیام کے بعد اس آبادی کی قلب ماہیت کر دیتے تھے مسجدیں نمازیوں سے معمور ہو جاتیں اسلام کے سچے مبلغین خود اس نو آبادی کے پرانے باشندوں میں سے نکل آتے وہ ان کے جانشین ہوتے اور وہ خود کسی اور آبادی کا رُخ کرتے۔ اور اپنے مقصد کی تکمیل کرتے رہتے۔

ہمارے صوفیۂ کرام کا یہی طریقۂ عمل تھا جس سے دین کی اشاعت اس ملک میں ہوئی۔ اور آفتابِ اسلام کی کرنیں اس ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئیں۔ اس موقع پر مسٹر آرنلڈ کے بعض اقتباسات پڑھنے کے لائق ہیں۔ لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں ...... ایسے نو مسلموں کی نسلیں ہیں جن پر مسلمان ہونے کے لئے کسی طرح کا جبر و تشدد نہیں کیا گیا، بلکہ دعاۃ اسلام کی تعلیم و تبلیغ سے ... اسلام قبول کیا (ص ۲۶۹) ......
ہندوستان کے مسلمانوں میں ... ایسے لوگ ہیں جو اپنے نام کے ساتھ شیخ ... یا خان کا لقب ...... اختیار کرتے ہیں ......"

---

[1] یوں شاہ کی کتاب "مرقع شاہ" [illegible] ص ۹۹ مطبوعہ لندن، دعوت اسلام (آرنلڈ) ص ۲۹۴

جن بزرگوں نے انھیں مسلمان کیا انھوں نے ان کا لقب اختیار کر لیا......

(ص ۲۷۰) .... ہندوستان کے ان مسلمان فاتحوں کے دل میں کوئی ایسا خیال جس کو دوسروں کی آخرت کی بھلائی چاہنے کا خیال کہتے ہیں موجود نہ تھا، جو مذہب کے ہر سچے داعی کے دل میں ہوتا ہے...... خلجی تغلق اور سوری بادشاہ لڑائیوں میں عموماً ایسے مصروف رہے کہ اسلام کو ترقی دینے کی ان کو مہلت نہ ہوئی، لوگوں کو مسلمان کرنے کی جگہ ملکوں سے خراج وصول کرنے کا ان کو زیادہ خیال رہا (ص ۲۴۷، ۲۴۸)

پھر وہ مختلف ملکوں کا حال لکھ کر بنگال سے متعلق کہتے ہیں۔

"بنگالی نومسلموں کی کثرت ایسے شہروں میں نہیں ہے، جو کبھی زمانہ میں اسلامی سلطنت کا پایۂ تخت رہے تھے بلکہ ان کی جس قدر کثرت ہے وہ دیہات میں یا ایسے اضلاع میں ہے جہاں .... نیچ قوموں کے ہندو، برادری سے خارج ہو کر وہاں کثرت سے آباد ہیں[۱]"

یہ صرف بنگال پر موقوف نہیں، اسی نقطۂ نظر سے پورے ہندوستان کی آبادی پر نگاہ ڈالی جائے، تو یہ حقیقت زیادہ روشن نظر آئے گی، ہندوستان میں بنگال، کشمیر اور سندھ، اسلامی دارالسلطنت کی سطوت سے دور رہے، مگر وہاں آج بھی ان کی غالب اکثریت موجود ہے، ان کے برخلاف آگرہ، دلی، اور اودھ مسلمان سلاطین اور ان کی تہذیب و تمدن کے مرکز تھے۔ مگر یہاں مسلمانوں کی آبادی ۱۵ فی صدی سے آگے نہیں بڑھی[۲]

---

۱ دعوت اسلام ص ۲۶۹ تا ص ۲۹۵ ۔ ۲ حقیقت یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر ہی سرے سے صحیح نہیں ہے کہ مسلمان جہاں گئے شمشیر کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر گئے یا جہاں رہے تلوار کے سایہ میں پناہ گزیں رہے، ہندوستان کے ان علاقوں میں جو مرکز سے دور رہے مسلمانوں کی آبادی کا تناسب اوپر گزرا۔ ہندوستان میں تو خیر مسلمان کشور کشا کی حیثیت سے آئے، ایسے مقامات بھی رہے جہاں مسلمانوں کی تلوار کبھی نہیں پہنچی مگر وہاں کے باشندے اسلام کی آغوش میں آئے۔ حبشہ پر مسلمانوں نے کبھی چڑھائی نہیں کی مگر وہاں آدھی سے زیادہ آبادی مسلمان ہے۔ افریقہ کے بہت سے مقامات ہیں جہاں مسلمان سپاہیوں کی تلوار نہیں پہنچی مگر وہاں ان کی بڑی آبادیاں قائم ہیں۔ چین پر مسلمانوں نے کبھی فوج کشی نہیں کی مگر تین چار کروڑ مسلمان وہاں ہیں۔ مسلمان جاپانیوں کے ساتھ امن کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انڈونیشیا کبھی کسی مسلمان تاجدار کے زیر نگیں نہیں آیا۔ مگر وہاں آج بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔

عہد قدیم میں ہندو مسلمانوں کے میل جول کے خوشگوار تعلقات

ہندو مسلمانوں کے میل جول سے ان میں باہم مختلف قسم کے خوشگوار تعلقات پیدا ہوئے، دونوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے، ایک دوسرے کے مذہب کو جاننے، باہم معاشرتی تعلقات برتنے اور ایک دوسرے کی قدیم ترین تہذیب، تمدن اور علم و فن میں ایک دوسرے کی ترقیوں سے آگاہ ہونے کا موقع ملا، بلخ کے نوبہار کے پجاری برمک (پرمکھ) نے اسلام قبول کر لیا تھا اور عباسی خلفا کے دربار میں ۱۳۶ھ سے ۱۸۶ھ تک وہ وزارت کے اہم منصبوں پر فائز رہے اور ملکی نظم و نسق کی باگ ان کے ہاتھوں میں رہی۔ وہی عرب و ہند کے باہم خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی ایک کڑی بنے۔ انہی کی تحریک سے سنسکرت سے ترجمہ کے لیے ہندوستان کے اہل علم بغداد بلائے گئے، اور بے شمار کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا گیا، ان تحریروں سے عربوں کے دل میں ہند کی قدر و منزلت بڑھی، اور وہ پہلے سے زیادہ ہندوستان سے وابستہ ہو گئے، عربوں نے ہندوستان کے قدیم علوم خصوصاً ریاضیات و نجوم، ہیئت، جوتش، حساب، ادب، شعر، اور فن سنگ تراشی میں ہندوستان کی عظمت کا اعتراف کیا، اور مختلف علوم سے سنسکرت کی اصطلاحات کو عربی میں منتقل کیا، وہ الفاظ عربی لب و لہجہ کے ساتھ آج بھی اس میں موجود ہیں، ہندوستان کے دو قدیم نظریوں، سال کے ۳۶۵ دنوں اور چند گھنٹوں [illegible] اور زمین کے حرکت کرنے کے نظریے سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئے اور یورپ میں پہنچے۔ اسی طرح طبی نظریے اور تجربات ان ترجموں سے عربی علوم میں داخل ہوئے۔ اسی طرح ہندوؤں کے علاوہ سائنس کے علم نجوم، جوتش، جفر، رمل، جڑی بوٹیوں کی تحقیق، موسیقی کی راگ راگنیاں، یہ سارے علوم و فنون عربی میں داخل ہو گئے اور عرب و ہند کا رشتہ مستحکم ہوا، اسی طرح مہابھارت

۱؎ [illegible] ۱۰۱ تا ۱۰۵

کے قصے اور اصول شاستر یعنی فن سیاست کی معیاری کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں کیمیا، منطق، منتر، کرتب، جادو، کہانی، افسانے اور اخلاق و حکمت کی بے شمار کتابیں عربی میں ترجمہ کر لی گئیں، ان کتابوں میں سے بہت سی کتابوں کے اصل سنسکرت نسخے آج ناپید ہیں، ان علوم سے فائدہ اٹھانے کے لیے اہل علم نے ہند کا سفر کیا، تنوخی و بیرونی وغیرہ کی تصنیفات اس کی زندہ یادگار ہیں، اسلامی ملکوں کے متعدد عرب و غیر عرب سیاح ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے آتے جاتے رہے اور ان کو اسلامی آبادیاں ملتی رہیں اور انھوں نے یہاں کوئی غیر معمولی اجنبیت محسوس نہیں کی۔

ہندو مسلمانوں کی ملی جلی آبادیوں سے ان دونوں کو ایک دوسرے کے مذہبوں سے شناسائی ہوئی اور دونوں میں ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کے احترام کا جذبہ پیدا ہوا، ہندو بڑی رواداری سے مسجدوں کا احترام رکھتے تھے اور ان کو اپنی آبادی کا ایک حصہ سمجھتے تھے اور جیسا کہ اوپر گذرا لوگ ہندو راجاؤں کی عملداری میں آزادی سے اپنے مذہبی فرائض ادا کرتے تھے، باہمی میل جول سے دونوں میں ایک دوسرے کے مذہبوں کی تحقیقات کا شوق بھی پیدا ہوا، ہندو مذہب کی تحقیقات کی روداد کا خلاصہ ابن ندیم کی الفہرست میں موجود ہے اور عرب سیاحوں نے ہندو مذہب کے متعلق بیش قیمت چشم دید حالات بیان کئے ہیں مسلمان مصنفین نے ہندوؤں کے فرقوں کو مسلمانوں کے فرقوں سے تطبیق دینے کی کوشش کی تھی، سنہ ۲۷۰ھ میں ہند کا ایک ادب شناس راجہ ایسا موجود تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی عزت کیا کرتا تھا مسلمان اور ہندو عالموں میں مذہب کی تحقیق کے لیے مناظرے بھی اکثر ہوا کرتے تھے، اور ان کی روداد بھی قلم بند کی گئی ہے سنہ ۲۷۰ھ میں ایک ہندو راجہ کے حکم سے قرآن پاک کا پہلا ترجمہ ہندی زبان میں کیا گیا۔

ہمارے صوفیہ کرام میں وحدۃ الوجود کا مسئلہ ہندو مذہب ہی سے آیا اسی طرح تصوف میں مشق و مہارت کے بہت سے طریقے پاس انفاس وغیرہ ہندو لوگ ویدانت ہی سے ماخوذ ہیں حسین بن منصور حلاج کا عقیدۂ حلول ہندستان ہی

نئے سرے سے مرمت کی جائے۔ مسلمانوں نے اس عدل و انصاف کی قدر کی، راجہ کے اس احسان کو یاد رکھا، مسجد کی مرمت کے بعد اس خلعت و انعام کو اس مسجد کے ایک حجرے میں محفوظ رکھا، ایک مسلمان سیاح محمد عوفی یہاں ۶۲۵ھ میں آیا تو یہ "تبرکات" بھی مسجد میں محفوظ رکھے تھے۔[1]

یہ ہے آئینہ ہندستان میں ہندو مسلمانوں کے میل جول کا اس زمانہ کا جب کہ بت شکن فاتح یہاں نہیں آئے تھے، کیا اس شیشہ میں کہیں بال آیا، لیکن اگر ہم مسلمانوں کو ان کے فاتحانہ لباس میں بھی دیکھنا چاہیں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ نہ صرف واقعی بت شکن نہ تھے، بلکہ انھوں نے بتوں کی حفاظت بھی اپنے دین کا ایک حکم اور اپنی سلطنت کا ایک فرض سمجھ کر کیا، اور ہندستان کے عہد اسلامی کی تاریخ ایسی مثالوں سے خالی نہیں ہے۔

(جنوری ۱۹۴۹ء)

---

[1] لباب الالباب ج ۱ ص ،

ہندستان پر مسلمانوں کے ابتدائی حملے

اور

اُن کے اسباب

عرب اور ہند کے تعلقات کا سراغ پچھلے زمانے میں سنہ [illegible] ق م تک چل سکا ہے، جب فنیقیوں کے تجارتی قافلے بحر عرب سے بحر ہند میں آتے تھے پھر سنہ [illegible] ق م میں یمن کی قوم سبا کے گہرے تعلقات جنوبی ہند کے شہروں سے پیدا ہوئے یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں سنسکرت کے بعض الفاظ مثلاً فلفل، کافور، زنجبیل صندل، نارجیل، قرنفل اور جائفل وغیرہ عہد قدیم میں داخل ہوئے اور آج وہ عربی زبان کے الفاظ سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح عود ہندی، تمر ہندی قسط ہندی اور مہند عربی تلوار سے ہندستان کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ان دونوں ملکوں میں علمی تعلقات بھی قائم تھے سنہ [illegible] ق م تک ہندستان میں لکھنے کا عام رواج نہ تھا، عرب تاجروں ہی کے ذریعہ آرامی رسم الخط ہندستان پہنچا، چنانچہ موریہ اور اندھرا خاندان کے کتبات ان ہی حروف میں تھے، ساتویں صدی ق م میں یہاں لوگ عربی زبان سے واقف تھے پانڈوں کو جب جلانے کا منصوبہ کیا جا رہا تھا تو عربی زبان ہی میں ان کو اس راز سے آگاہ کیا گیا اور یدہشٹر نے عربی زبان ہی میں ان کو جواب دیا۔

اسلامی عہد میں ان دونوں ملکوں کے یہ تعلقات زیادہ استوار ہو گئے عربوں کے تجارتی قافلوں کا سندھ اور ہندستان میں خیر مقدم کیا جاتا تھا یہاں تک کہ عربوں کے سندھ پہنچنے اور پہونچنے سے پہلے ان کی چھوٹی چھوٹی نو آبادیاں یہاں قائم ہو گئی تھیں

لہ تفصیل کے لیے دیکھیے "عرب و ہند کے تعلقات"

اس کے بعد سندھ سے اسلامی حکومت کو دوسری براہ راست شکایت یہ پیدا ہوئی کہ حکومت سندھ نے ایسے مختلف باغیوں کو اپنے دامن میں پناہ دی جو مسلمانوں کے خیال میں دین اور اسلامی حکومت کی نظر میں امن و امان کے لیے خطرہ بن چکے تھے ان میں سے محمد بن حارث علافی معاویہ بن حارث علافی اور جہیم بن سامہ سامی کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ حجاج بن یوسف ثقفی اور عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کی باہم جنگ آزمائی اس عہد کی تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے، یہ لوگ ابن اشعث کے ساتھ ہو کر حجاج کے خلاف لڑے تھے، اور ابن اشعث کی شکست کے بعد فرار ہو کر عمان چلے گئے اور وہاں سے سندھ آئے، اور سندھ کے راجہ داہر سے پناہ مانگی اور اس نے ان بہادر عربوں کو اپنی پناہ میں لے لیا اس اثنا میں مکران کے مسلمان حاکم سعید بن اسلم بن زرعہ نے کسی جرم میں قبیلہ علاف کے بعض لوگوں کو قتل کرایا، اور اس کے انتقام میں ان دونوں بھائیوں محمد و معاویہ نے پانچ سو سپاہیوں کا دستہ لے کر مکران پر حملہ کیا، سعید کلابی مارا گیا، اور ان لوگوں نے مکران پر قبضہ جما لیا، مکران مرکزی حکومت کا ایک صوبہ تھا۔ ان علافیوں کی اس یورش کی ذمہ داری سے قدرتی طور پر راجہ داہر سبک دوش نہیں سمجھا جا سکتا تھا، حجاج بن ثقفی نے اس حادثہ کی خبر سنتے ہی مجاعہ بن مسعر تمیمی کو ہندستان کی سرحد کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اس نے مکران پر فوج کشی کر کے اس پر دوبارہ قبضہ کیا، محمد و معاویہ علافی اپنے آدمیوں کے ساتھ پھر سندھ چلے آئے اور ۸۵ھ میں سندھ کے ایک مقام ارور میں قیام پذیر ہو گئے[1]۔

---

[1] نزہتہ الخواطر ص ۱۱ (ذکر محمد بن حارث علافی) ص ۷، (معاویہ علافی) ۲، ۳، (سامی) محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے بعد جب راجہ داہر قتل کیا گیا، تو یہ لوگ فرار ہو کر برہمن آباد آ گئے اور داہر کے بیٹے جے سنگھ کی حمایت میں آ گئے، جب جے سنگھ سندھ سے فرار ہو کر کشمیر روانہ ہوا تو یہ لوگ بھی اس کے ساتھ ہو گئے، اور صاحب تحفۃ الکرام کی روایت ہے کہ آخر میں محمد بن قاسم سے ان لوگوں نے امان طلب کی اور اس نے فراخ دلی سے معاف کر دیا۔

اب "ثغر الہند" یعنی ہندستان کی سرحد کی دیکھ بھال کرنے اور مورچہ جمائے رکھنے کے لیے ایک مستقل والی نامزد ہونے لگا۔ چنانچہ جب مجاہد بن مسعر تمیمی نے مکران میں وفات پائی تو اس عہدے پر محمد ہارون نمری مامور کیا گیا، اور پانچ برس تک اس خدمت پر مامور رہا، یہاں تک کہ محمد بن قاسم ثقفی کے مشہور حملہ سندھ کا واقعہ پیش آیا اور حجاج ثقفی کی ہدایت کے مطابق محمد ہارون نمری، محمد بن قاسم ثقفی کی مدد کے لیے اپنی فوج کے ساتھ اس لشکر میں شریک ہو گیا اور فتوحات کے بعد کسی مقام کی ولایت پر سرفراز کیا گیا

اس صورت حال سے ان دونوں ملکوں کے تعلقات روز بروز خراب ہوتے جارہے تھے، آخر میں عرب عورتوں کے جہاز کے لوٹ لینے کا واقعہ پیش آیا اور یہی سبب تھا جس کی وجہ سے ان دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہوئے اور اس قضیہ کو مستقل طور پر تلوار ہی کے ذریعہ سے طے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس آخری واقعہ کی صورت حال یہ تھی کہ

اس زمانہ تک اسلامی حکومت کا دائرہ اثر ایشیا، یورپ اور افریقہ میں دور دور پہنچ چکا تھا اور مختلف ممالک کے سفیر دار الخلافت میں آیا کرتے تھے اسی سلسلہ میں مالدیپ کے راجہ نے ایک سفارت چند تحائف کے ساتھ خلیفہ ولید بن عبد الملک کے پاس دمشق روانہ کی۔ نیز اسی سفارت کے ساتھ چند ایسے عرب تاجروں کی عورتیں اور لڑکیاں بھی تھیں جو لنکا میں انتقال کر گئے تھے، اس جہاز کو سندھیوں نے بندرگاہ دیبل کے پاس لوٹ لیا۔ اسلامی حکومت کی طرف سے سندھ کے راجہ داہر کو اس کی طرف توجہ دلائی گئی کہ شریف عرب خواتین کو واپس کر دیا جائے لیکن راجہ داہر نے جواب دیا کہ یہ بحری قزاقوں کا کام ہے جو اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے راجہ داہر کے جواب کو حیلہ جوئی پر محمول کیا چنانچہ عرب عورتوں کے جہاز کو لوٹ لینے کے انتقام میں حکومت سندھ

[illegible]

کے خلاف ابتدائی مہم سرحدی افسر عبید اللہ بن نبہان کی سرکردگی میں دیبل بھیجی گئی، عبید اللہ جنگ میں کام آیا تو ایک دوسرے افسر بدیل بن طہفہ بجلی کو بھیجا گیا، وہ بھی گھوڑے سے گر کر مرگیا، بدیل کی قبر دیبل (ٹھٹھہ) میں بنی۔

اس ناکام مہم کے بعد بڑی تیاریوں کے ساتھ محمد بن قاسم کی مشہور مہم شیراز کے راستے سے بھیجی گئی، ۹۳ھ/۷۱۱ء میں جمعہ کے دن وہ دیبل (ٹھٹھہ) پہنچا، بحری کمک بھی آگئی، دیبل فتح ہوگیا۔ پھر مسلمانوں کے قدم آگے بڑھتے گئے، اور تین سال کے اندر سندھ کا پورا علاقہ زیر نگین ہوگیا اور ایک مستقل گورنر کے ذریعہ سندھ پر حکومت کی جانے لگی[۱]۔

محمد بن قاسم کا شمار اس عہد کے ممتاز سپہ سالاروں میں کیا جاتا ہے، اس نے ایک مختصر زمانہ میں سندھ و ملتان کی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا، راجہ داہر جنگ میں کام آیا، اس کا قاتل قاسم بن ثعلبہ طائی تھا، محمد بن قاسم کے دوسرے مشہور عرب سرداروں میں داؤد بن نصر عمانی جس کو ملتان کا والی بنایا گیا، زعوہ بن عمیر اور محمد بن مصعب ثقفی جو ہراول دستوں کے سالار تھے، زائدہ بن عمیرہ جو ملتان کی فتح میں شریک تھا۔ اور عبد الرحمان بن عباس ہاشمی جو ممتاز سپہ سالاروں میں شمار کیا جاتا تھا، اسی طرح مصعب بن زبیر، سلیمان قریشی، عطیہ ثعلبی، ذکوان بکری، نباتہ بن حنظلہ اور جہم بن زحر جعفی وغیرہ تھے جن میں سے اکثر سپہ سالاروں کا سندھ خواب گاہ بنا[۲]۔

محمد بن قاسم کے ساتھ اس کی قسمت نے نیرنگی دکھائی، وہ بعض سیاسی حالات کے بدلنے سے گرفتار کر کے سندھ سے دار الخلافت لے جایا گیا، لیکن وہ اپنی سیرت و کردار کا ایسا

---

[۱] اسد الغابہ، فتوح البلدان بلاذری کا ذکر فتوح السندھ ص ۴۳۲، ۴۴۲، وشذرات الذہب ج ۱ ص ۵۳ حوادث ۹۶ھ، ابن اثیر ج ۴ ص ۳۵، ۷۷، ۷۶، وج ۴ ص ۹۰، ۱۳، استیعاب ونزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۵ وغیرہ

[۲] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۸ (داؤد) ۹ (زعوہ، زائدہ) ۱۱ (قاسم بن ثعلبہ) ۱۲ (محمد بن مصعب) ۲۸ (جعفی) وغیرہ۔

غیرفانی نقش سندھ میں چھوڑ گیا کہ جو مسلمان عرب یہاں مقیم تھے، انھوں نے اپنے مرثیوں میں خون کے آنسو بہائے، اور ان سے زیادہ ماتم ہندستان کے باشندوں نے کیا، اور اس کی فیاضی، سیرچشمی، رواداری اور حسن اخلاق کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اس کی مورتی بنائی اور عقیدت سے اس کے آگے سر نیاز جھکایا۔ بلاذری لکھتا ہے۔

"ہندستان کے باشندوں نے محمد پر آنسو بہائے اور کیرج (کورج یا بجے پور) میں اس کی مورتی بنا کر رکھی[1]"

خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نے سندھ کی ولایت پر محمد بن قاسم ثقفی کے بجائے یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو والی بنا کر بھیجا، مگر اس نے سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہی ۱۸ ویں دن وفات پائی[2]۔ اور محمد بن قاسم کی گرفتاری اور نئے والی کی موت سے ملک میں ابتری پیدا ہو گئی، خلیفہ سلیمان نے حبیب بن مہلب کو یہاں کا والی بنا کر بھیجا اور ملک میں بغاوتوں اور اطاعتوں کے واقعات کے پیش آنے کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔ اور ولاۃ میں بھی مختلف زمانوں میں تغیر و تبدل ہوتا رہا اور اس کی وجہ سے نئے حالات پیش آتے گئے چنانچہ سنہ ۹۶ھ (۷۱۴ء) سے سنہ ۳۰۶ھ (۹۹۶ء) تک سندھ کبھی دارالخلافت دمشق پھر بغداد کا صوبہ والی عراق کی نگرانی میں رہا اور کبھی یہاں آئے ہوئے والیوں نے اپنی خودسر حکومت قائم کر لی، اس زمانہ میں اس مفتوحہ علاقہ کو چار یا پانچ بڑے ضلعوں میں تقسیم کر کے حکومت کی جاتی تھی۔ اور کبھی یہاں مختلف خاندان ہباری بنو سامہ، بنو منبہ حکمرانی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سنہ ۴۱۶ھ (۱۰۲۵ء) میں سلطان محمود غزنوی نے اس پر قبضہ کر لیا، اور یہ پورا علاقہ غزنوی سلطنت کا جزو بن گیا، لیکن سندھ زیادہ دنوں تک غزنوی سلطنت کا صوبہ نہ رہ سکا، محمود کی وفات کے چند سال کے بعد ہی وہ پنجاب کے غزنوی گورنر کے تسلط سے آزاد ہو گیا۔ قرامطہ نے بالائی سندھ میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ جن میں ملتان اور اوچھ وغیرہ اہم شہر تھے

---

[1] بلاذری ص ۴۴۴ [illegible]

شہاب الدین غوری کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا[1]

اسی طرح زیریں سندھ میں جس کا پایۂ تخت دیبل تھا۔ محمود کی وفات کے بعد ہی ایک مقامی قبیلہ سومرا کی سلطنت قائم ہوگئی جو سنہ ۴۴۴ھ سے سنہ ۷۵۲ھ کے بعد چند سال تک کسی نہ کسی طرح قائم رہی، یہ عرب نومسلم ہندستانی نسل کا مخلوط قبیلہ تھا، محمد شاہ تغلق کے زمانہ میں اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو پھر ایک دوسرے قبیلہ سمہ کی حکمرانی شروع ہوئی، اور آخر تک سلاطین دہلی سے مختصر دائرے میں سہی نبرد آزما رہی، جام نظام الدین (سنہ ۸۶۶ھ - سنہ ۹۱۰ھ) اس خاندان کا ممتاز حکمران گزرا ہے، سنہ ۹۱۶ھ میں اس کا خاتمہ ہوا[2]، اور چنگیزی خاندان کے شاہ بیگ ارغون پھر اس کا بیٹا شاہ حسین ارغون حکمران ہوا، سنہ ۹۶۲ھ میں اس کا انتقال ہوا تو اسی قبیلہ کے دوسرے سردار جن کا لقب ترخان تھا حکمرانی کرتے رہے، یہاں تک کہ سندھ کی خود مختاری کا خاتمہ سنہ ۱۰۰۰ھ / ۱۵۹۱ء میں ہوا اور یہ مستقل طور پر سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ بن گیا[3]۔

(فروری سنہ ۱۹۴۹ء)

---

[1] منہاج ص ۱۲۷، فرشتہ ج ۱ ص ۵۶، [2] فرشتہ ج ۲ ص ۳۱۶، ۳۲۰، الیٹ ص ۱۹۱ بیچ نامہ ص ۲۶۷، (طاہری) فیروز شاہی ص ۱۹۹، ۲۴۷ [3] انسائیکلو پیڈیا ج ۲۵ ص ۱۴۳، الیٹ ص ۴۹۶

سندھ کے اسلامی حملوں کے قیدی

(۱)

عرب جا کر ابھرے

سندھ کے اسلامی حملوں میں جو ابتدا اغراض پر کئے گئے بہت سے سندھی قیدی بھی گرفتار کر کے عرب لے جائے گئے۔ اور اس زمانے کے دستورِ جنگ کے مطابق غلام بنائے گئے۔ لیکن عرب، یونانیوں، اور رومیوں کے برخلاف غلاموں کے ساتھ غیر معمولی حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے، وہ آزاد ہو کر ان کے قبیلہ کے افراد بن جاتے تھے اور انہیں اپنی ہر قسم کی شخصی ترقی حاصل کرنے کا کامل اختیار حاصل تھا چنانچہ ان سندھی قیدیوں نے آزاد ہو کر اگر عرب میں توطن اختیار کر لیا اور وہ علمی و سیاسی و ملکی مرتبے حاصل کئے جو خود فاتح قوم کو حاصل تھے۔ بلکہ وہاں انھوں نے یا ان کی اولاد نے علوم و فنون میں ایسا کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے علماء و ائمہ ان کی مسند درس سے فیض یاب ہو کر اٹھے۔ ذیل میں ہم اپنے ہی سندھی غلاموں اور ان کی اولاد کا تذکرہ کرتا ہوں، جو سندھ کے اسلامی حملوں میں گرفتار کر کے عرب لے جائے گئے تھے۔

السندی | عرب میں سندھی کو السندی کہتے ہیں، سمعانی لکھتا ہے کہ ہٰذہ النسبۃ الیٰ السند و ہی من بلاد السند یہ نسبت سندھ کی طرف ہے جو ہندوستان کے شہروں میں سے ہے۔

غلاموں کو یہ انتساب اتنا بھایا کہ انھوں نے اپنے بچوں کے نام بھی السندی رکھے، جیسے السندی بن شاہک یا شیخ ابو بکر جعفر امنی کے جد اعلیٰ کا نام السندی تھا۔ اسی طرح بعض لوگوں کا لقب وہ السندی قرار پایا، جیسے ابن عبید بیہ رازی السندی کے لقب سے مشہور ہو گئے پھر بعد میں ان کی اولاد اپنے جد اعلیٰ کی نسبت

سے بھی السندی کہلائے۔

اس لیے عربی تاریخوں اور رجال کی کتابوں میں جن لوگوں کے نام السندی کے انتساب سے نظر آئیں، ان کے لیے ضروری نہیں کہ وہ سندھ ہی کے رہنے والے ہوں۔ اس لیے ذیل میں صرف ان ہی چند اشخاص کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کے سندھ کی طرف منسوب ہونے کی تصریح مل چکی ہے اور جن کے کچھ نہ کچھ علمی ادبی و تعلیمی کارنامے ہیں:۔

ابو معشر سندھی

ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن دوسری صدی ہجری میں حدیث کے مشہور راویوں میں ہیں، اپنے وطن سندھ کے انتساب سے السندی اور جائے قیام کے لحاظ سے مدنی کہے گئے۔

یہ کسی جنگ میں گرفتار کر کے حجاز لے جائے گئے۔ اور وہاں فروخت کیے گئے یہاں تک کہ ام موسیٰ بنت منصور نے انھیں خریدا، پھر بنو ہاشم کی میراث میں آئے کچھ دنوں کے بعد نیم آزاد ہوئے، اور بنو مخزوم کی ایک عورت کے مکاتب بنے اور پھر مقررہ رقم ادا کرنے کے بعد آزاد ہو گئے۔

یہ جس خاندان میں رہے، اس میں علوم و فنون کی تحصیل کرتے رہے، ان کے آقاؤں نے ان کی تحصیل علم میں مدد دی، یہاں تک کہ ممتاز علما میں گنے گئے، اور ایسا علمی مرتبہ حاصل کیا کہ لوگوں کو ان کے عرب ہونے کا دھوکا ہوا اور خود ان کی حیات میں لوگوں میں ان کے عرب و غیر عرب ہونے کی بحث چھڑ گئی، چنانچہ بعض لوگوں نے انھیں یمنی بتایا، لیکن جب انھوں نے سنا تو فوراً اس کی تردید کی اور کہا۔

"بنو ہاشم کے غلاموں میں ہونا میرے نزدیک زیادہ محبوب (اور لائق فخر) ہے

اس سے کہ میرا نسب بنو حنظلہ میں ہو"

اس کے بعد خطیب بغدادی نے ان کے صاحبزادے محمد بن ابی معشر کا یہ قول

---

۵۱ کتاب الانساب سمعانی ورق ۳۱۳ - ۳۱۴

نقل کیا ہے:-

"ابونعیم نے کہا کہ ہم سے فضل بن ہارون بغدادی بیان کرتے تھے، کہ میں نے محمد بن ابو معشر سے سنا وہ کہتے تھے کہ میرے والد سندھی تھے"

ابو معشر سندھی نے علم حدیث، مغازی اور فقہ میں کمال حاصل کیا خصوصاً فن مغازی میں استاذ شمار کئے گئے،

ان کے شیوخ حدیث میں محمد بن کعب قرظی، سعید بن ابی سعید مقبری، ابو بردہ بن ابی موسیٰ، ہشام بن عروہ، موسیٰ بن یسار، نافع ابن منکدر اور محمد بن قیس وغیرہ ہیں جامع ترمذی میں ان کی روایت موجود ہے۔ ان روایتوں میں ان کے شیخ کا نام سعید آیا ہے۔ گمان تھا کہ وہ سعید بن مسیب ہیں، چنانچہ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اسی بنا پر سعید بن مسیب کو بھی ان کے شیوخ حدیث میں شمار کیا ہے، لیکن علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے سعید بن مسیب سے روایت کرنے کی تردید کی ہے اور جامع ترمذی میں ان کے شیخ کا جو نام سعید آیا ہے اسے سعید مقبری قرار دیا ہے۔

ان کے تلامذہ میں بھی جلیل القدر علماء اور ائمہ کے نام آتے ہیں چنانچہ محمد بن ابی معشر، عبدالرزاق، ابونعیم، محمد بن بکار، منصور بن ابی مزاحم، لیث بن سعد، عبداللہ بن ادریس، ہشیم، ابن مہدی، ابو نصر ہاشم بن قاسم، وکیع، ہوذہ بن خلیفہ، عثمان بن عمرو، محمد بن سواء، محمد بن عمر واقدی، ابو ضمرہ، سعید بن منصور، عاصم بن علی، ابو ربیع زہرانی اور فن حدیث و فقہ کے مشہور امام سفیان ثوری ان کے تلامذہ میں ہیں۔

ائمہ فن نے ان کے علمی مرتبہ کا اعتراف کیا ہے، اگرچہ حافظہ کسی قدر کمزور ہو گیا تھا، اس لئے محتاط محدثین نے ان کی روایتیں قبول کرنے میں احتیاط کی بلکہ کہا گیا ہے کہ یہ صورت حال آخر عمر میں پیدا ہوئی تھی۔

علامہ ذہبی ان کے متعلق کہتے ہیں۔

"وہ اپنے حافظہ کی کمزوری کے باوجود علم کے مخزن تھے"

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں :-

"فن مغازی میں بصیرت رکھتے تھے، سچے تھے لیکن سلسلہ اسناد یاد نہ رکھ سکتے تھے"

خطیب بغدادی کا بیان ہے،

"فن مغازی کے بڑے واقف کاروں میں سے تھے"

ابومعشر سندھی کے اس علم وفضل کے باوجود ان کا تلفظ درست نہیں ہوا تھا اور ان کے تلفظ سے ان کے قدیم وطن کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔

ابونعیم کہتے ہیں :-

"ابومعشر سندھی تھے، اور ان کے عربی الفاظ کا تلفظ صحیح نہ تھا، وہ حدثنا محمد بن قعب کہتے اور قعب سے مراد کعب ہوتی تھی"

یہ جلیل القدر سندھی عالم اپنے حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے جرح کا نشانہ بھی بنا۔ امام بخاری ومسلم نے اپنی صحیحین میں اسی باعث ان کی روایت نہیں لی۔ ابوداؤد اور نسائی نے بھی ان کی تضعیف کی، لیکن بقول علامہ ذہبی امام نسائی اپنی سنن میں ان کی روایت سے حجت لائے ہیں اور امام ترمذی نے ان کی حدیثیں درج کی ہیں، مگر تصریح کردی ہے کہ بعض اہل علم نے ان کے حافظہ پر کلام کیا ہے، امام احمد بن حنبل ان کی حدیثیں لکھ لیتے تھے مگر ضعف اسناد کی وجہ سے ان کی روایت نہ کرتے تھے، اسی طرح یحییٰ بن معین اور دوسرے ائمہ فن میں سے بعض نے ان کے اسناد ہی کے لحاظ سے ان کی حدیثوں کو ضعیف کہا ہے۔

ان کی تکذیب میں بجز ایک غیر معروف روایت کے اور کسی کا قول موجود نہیں وہ روایت ابوحزہ نصر بن طریف کی ہے۔ مگر دوسرے اہل علم نے یہ روایت بیان کرکے اس کی تردید کردی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ نے ثقاہت کی توجیہ میں ناشرکہ ...... کہ باوجود

ان کی روایتیں قبول کر لیتے تھے۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ ان کا حافظہ متن حدیث کی یاد داشت میں کمزور نہیں، صرف سلسلہ اسناد میں غلطیاں ہو جاتی تھیں، مگر اس میں بھی وہ جان بوجھ کر غلط بیانی نہ فرماتے تھے، جو سند روایت کرتے، اسے صحیح اور حق جان کر بیان کرتے چنانچہ ابن عدی کہتا ہے۔

"ان سے ثقات نے روایت کی ہے اور ان کے ضعیف ہونے کے باوجود ان کی حدیثیں لکھی جاتی تھیں"

خلیلی کا بیان ہے:-

"ابو معشر کو علم (دین) اور تاریخ میں ایک مقام حاصل تھا، ائمہ ان کی تاریخی روایتیں قبول کر کے ان سے حجت لائے ہیں اور حدیث کی روایتوں میں ان کی تضعیف کی ہے"

علم حدیث کے علاوہ فن مغازی کے امام مانے گئے ہیں، ان کی تصنیفات میں ان کی کتاب المغازی شہرت رکھتی ہے ابن ندیم نے الفہرست میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور کہتا ہے:-

"وہ تاریخ و سیر کے عارف اور محدثین میں سے ایک تھے، ان کی کچھ کتابیں ہیں، جن میں سے ایک کتاب المغازی ہے"

مولانا شبلی مرحوم نے مقدمہ سیرت میں ان کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:-

"ابو معشر نجیح المدنی (سنہ ۱۷۰ھ) ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے ثوری اور واقدی نے ان سے روایت کی ہے، گو محدثین نے روایت حدیث میں ان کی تضعیف کی ہے، لیکن سیرت و مغازی میں اُن کی جلالت شان کا اعتراف کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فن میں صاحب نظر تھے، ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے کتب سیرت میں ان کا نام کثرت سے آتا ہے (جلد ا ص ۲۲)

ابو معشر کا رنگ گندم گوں اور جسم فربہ تھا۔ خلیفہ مہدی ان سے تلمذ فیض

کا قدردان تھا، اس سے اس کی انسیت کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی ماں کے جو ام موسیٰ بنت منصور کے نام سے مشہور ہیں، غلام رہ چکے تھے ایک مرتبہ حج کے موقع پر ان دونوں کا ساتھ ہو گیا مہدی نے ان کی قدر افزائی کا حکم دیا کہ یہ شاہی خیمہ میں بلائے جائیں اور اس قافلہ کے لوگ ان سے فقہ کا فیض حاصل کریں پھر مہدی نے ان کی خدمت میں ایک ہزار دینار کا تحفہ پیش کیا۔ اس کے بعد مہدی ۱۶۰ھ میں انھیں اپنے ساتھ مدینہ سے عراق لایا اور ۱۶۱ھ میں بغداد میں لاکر ٹھہرایا اور علم و تعلیم کی خدمت ان کے سپرد کی اور یہیں مستقل قیام اختیار کیا۔

وفات سے دو سال پیشتر حواس میں کچھ فرق آگیا تھا، رمضان ۱۷۰ھ میں وفات پائی، خلیفہ ہارون الرشید نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور بغداد کے مقبرۂ کبیر میں یہ فخر سندھ مدفون ہوا۔[1]

ابو عبد الملک محمد بن ابو معشر سندھی

ابو عبد الملک محمد، ابو معشر سندھی کے لائق صاحبزادے تھے اور اپنے عہد کے ممتاز اہل علم میں تھے۔ خلیفہ مہدی انھیں بھی مدینہ منورہ سے بغداد لے آیا تھا۔ علم حدیث سے انھیں بھی مناسبت تھی۔ یہاں ابن ابی ذئب اور ابوبکر ہذلی سے سماع ثابت ہے، اپنے والد کی کتاب المغازی بھی ان سے روایت کی ہے، ان کے تلامذہ میں ان کے صاحبزادے داؤد اور حسین ان سے روایت کرتے ہیں، ان کے علاوہ ابو حاتم محمد بن ادریس رازی، محمد بن اللیث الجوہری، اور ابو یعلی موصلی نے ان کی روایت کی ہوئی حدیثیں بیان کی ہیں۔ ابو حاتم نے ان کی توثیق کی ہے۔ انھوں نے ۹۹ سال کی عمر میں ۲۴۹ھ میں وفات پائی۔[2]

؎۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۲، تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۹، کتاب الانساب سمعانی ورق ۳۱۳، تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۳ ص ۴۲۷، شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۷۸، الفہرست ابن ندیم ص ۱۳۶ طبع مصر

؎۲ کتاب الانساب ورق ۳۱۳، تاریخ خطیب بغدادی ج ۳ ص ۲۶۳۔

امام اوزاعی

شیخ الاسلام عبدالرحمٰن بن عمرو امام اوزاعی ان ائمہ اسلام میں ہیں جو فقہ کے ایک مذہب کے بانی بنے اور شام اور اندلس میں زمانۂ دراز تک ان کے پیرووں کی کثیر تعداد موجود رہی اور فقہ کی تاریخ و خلافیات میں آج تک یہ مذہب معلوم و مشہور رہی۔

امام اوزاعی ۸۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۶ھ میں وفات پائی یہ نسلاً سندھی تھے، علامہ ذہبی اور ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔

وکان اصلہ من سباء السند — ان کا خاندان سندھ کے قیدیوں میں سے تھا

امام اوزاعی دمشق کے کسی گاؤں میں پیدا ہوئے، اور آخر عمر میں بیروت میں قیام فرمایا، ان کے شیوخ و تلامذہ کی لمبی فہرست ہے جن میں چند مشہور اکابر حسب ذیل ہیں۔

شیوخ میں عطار بن ابی رباح، قتادہ، شداد، نافع، مولیٰ عمر، زہری اور محمد بن سیرین وغیرہ ہیں اور تلامذہ میں مالک، شعبہ، ثوری، ابن مبارک، اور یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ ہیں۔ پھر ان کے شیوخ میں سے امام زہری، یحییٰ بن کثیر، اور قتادہ وغیرہ نے بھی ان سے روایتیں کیں۔

ان کے علم و فضل کے بیان میں ائمہ فن کی بڑی روایتیں ہیں۔ ابن مہدی کہتے ہیں

"حدیث کے چار امام ہیں اوزاعی، مالک، ثوری، اور حماد بن زید اور شام میں سنت کا جاننے والا اوزاعی سے بڑھ کر کوئی نہ تھا"

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:-

"ایک مرتبہ سفیان ثوری اور اوزاعی امام مالک کے پاس پہنچے جب وہ واپس گئے تو انھوں نے فرمایا۔ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے ساتھی سے علم میں زیادہ ہے لیکن ان میں کا پہلا (یعنی ثوری) مذہب کی امامت کی اہلیت نہیں رکھتا، اور دوسرا (یعنی اوزاعی) امام بننے کی صلاحیت رکھتا ہے"

امام ابو اسحٰق فزاری کہتے ہیں:-

"میں نے ان دونوں شخصوں اوزاعی اور ثوری کے مثل کسی کو نہیں پایا، ان
میں سے اوزاعی شخصیت عامہ کے مالک ہیں اور ثوری شخصیت خاص رکھتے ہیں۔
اگر میں اس امت کے لیے کسی کو چنتا تو وہ اوزاعی ہوتے۔"

اسمٰعیل بن عیاش کہتے ہیں:-

"میں نے ۱۴۰ھ میں لوگوں کو کہتے سنا کہ اوزاعی اس زمانہ میں امت
کے عالم ہیں۔"

اسی طرح عبداللہ بن مبارک کا ارشاد ہے:-

"اگر مجھ سے کہا جاتا کہ اس امت کے لیے کسی کو منتخب کروں تو میں ثوری اور
اوزاعی کو منتخب کرتا اور پھر ان دونوں میں سے اوزاعی کو چن لیتا۔"

"اور خود امام ابوسفیان ثوری کا یہ واقعہ ذکر کرنے کے لائق ہے کہ ایک مرتبہ حج کے
موقع پر انھوں نے مقام ذی طویٰ میں امام اوزاعی کو اونٹ پر گزرتے دیکھا تو
فرط محبت و عقیدت سے دوڑ پڑے اور ان کے اونٹ کی نکیل ہاتھ میں پکڑ کر یہ صدا
دیتے ہوئے پیادہ پا چلے کہ "شیخ کے لیے راستہ دو، شیخ کے لیے راستہ دو۔"

امام اوزاعی کی ساری زندگی علم و دین کی خدمت میں گذری، دنیاوی جاہ و حشم
سے نفور رہے، قضا کی پیشکش کی گئی مگر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

خلیفہ منصور نے بنو امیہ کے قتل عام پر ان کی رائے پوچھی انھوں نے بیباکی سے
حق بات منصور کے منہ پر کہہ دی، منصور نے بحث کی۔ امام اوزاعی نے اسے اپنے دلائل سے قطعی
لاجواب کر دیا، تو غیظ و غضب سے اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو گئیں اور غصہ
میں مجلس سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ دربار خلافت سے نکل کر کچھ دور پہنچے تھے کہ پیچھے
سے ایک سوار تیزی سے بڑھتا ہوا آتا دکھائی دیا یہ سمجھے کہ سر لینے آ رہا ہے۔ وہیں کھڑے
ہو کر دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی کہ آخری دم سجدہ شکر ادا کر لیں۔ [illegible] امام پھیر [illegible]
سوار نے دیناروں کی تھیلی نذر کی انھوں نے اسے قبول کر لیا مگر گھر پہنچنے سے پہلے

راستہ ہی میں سب کو خیرات کر دیا۔

امام اوزاعی اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہما اللہ دونوں ہم عصر تھے، امام اعظم بھی ان کی قدر فرماتے تھے اور ان کے علم کے معترف تھے۔

امام اوزاعی کی وفات حمام میں نادانستہ آگ سے جل کر ہوئی، سال وفات میں اختلاف ہے، مورخین عموماً سنہ ۱۵۶ھ کی روایت زیادہ لکھتے ہیں۔ مذہب اوزاعی دو تین صدیوں تک شام واندلس میں باقی رہا اور اس مذہب کے ماننے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود رہے۔[1]

(حافظ ابو محمد خلف بن سالم سندھی)

ابو محمد خلف بن سالم مخاطب بہ محمود سندھی حدیث کے مشہور حافظوں میں تھے، یہ سندھ سے عرب لے جائے گئے اور آل مہلب کے غلام بنے، پھر علوم کی تحصیل کی، اور علم حدیث میں نام پیدا کیا۔ بغداد کے محلہ مخرم میں قیام تھا۔ اس نسبت سے مخرمی بھی کہلائے۔

خطیب لکھتا ہے:-

"خلف بن سالم ابو محمد مخرمی مہالبہ کے موالی میں تھے، اور یہ سندھی تھے"

ذہبی کا بیان ہے:-

"خلف بن سالم حافظ محمود ابو محمد سندھی مولی آل مہلب بغداد کے اعیان حفاظ حدیث میں تھے"

ابن حجر نے بھی انھیں السندی البغدادی الحافظ لکھا ہے

ان کے شیوخ حدیث میں حسب ذیل محدثین ہیں جن سے انھوں نے روایتیں کیں، ہشیم، ابن بشر، یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مہدی، اسمٰعیل بن علیہ سعد بن ابراہیم بن سعد، یعقوب بن ابراہیم، معن بن عیسیٰ، ابو نعیم فضل بن دکین

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۰، تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۳۸، شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۴۱

محمد بن جعفر غندر، یزید بن ہارون، وہب بن جریر، عبد الرزاق بن ہمام، اور ابن نمیر وغیرہ،

تلامذہ میں اسمٰعیل بن ابی حارث، حاتم بن لیث، یعقوب بن شیبہ، احمد بن ابی غیثمہ، جعفر طیالسی، عباس دوری، یعقوب بن یوسف مطوعی، حسن بن علی عمری، احمد بن حسین بن عبد الجبار صوفی، ابو القاسم بغوی، احمد بن علی آبار، اور عثمان دارمی وغیرہ ہیں،

امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، مسدد، حمیدی، یعقوب بن شیبہ، اور حمزہ کنانی نے ان کی توثیق کی ہے، امام نسائی نے بھی انھیں ثقات میں جگہ دی ہے۔

وہ طبعاً نہایت سادہ دل تھے اور مختلف علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

یوم دوشنبہ ۲۲ رمضان ۲۲۱ھ میں ۷۹ سال کی عمر میں بغداد میں وفات پائی[1]

ابو العباس فضل بن سکین بن سخیت سندھی

ابو العباس فضل بن سکین بن سخیت سندھی قطیعی معروف بہ سندی بھی حدیث کے مشہور راویوں میں ہیں، صالح بن بیان ساحلی اور احمد بن محمد رملی سے حدیث روایت کی، اور ان سے محمد بن موسیٰ بن حماد بربری، ابو یعلی موصلی، ابراہیم بن شبیب مخرمی اور محمد بن مخلد عنبری روایت کرتے ہیں؛

یحییٰ بن معین نے ان پر جرح کی ہے، ان کے سلسلۂ سند سے عبد الرزاق راوی سے بھی بعض حدیثیں بیان کی جاتی ہیں، لیکن یحییٰ بن معین نے اس کی تردید کی ہے[2]

ابو نصر فتح بن عبد اللہ سندھی

ابو نصر فتح بن عبد اللہ سندھی آل حکم کے موالی میں تھے، جنھوں نے انھیں آزاد کر دیا انھوں نے مختلف علوم فقہ و کلام وغیرہ میں مہارت حاصل کی، فقہ کی تحصیل ابو علی ثقفی

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۸ ص ۹۳۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۶۵، تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۵۲

[2] تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۲ ص ۳۶۲، لسان المیزان ج ۴ ص ۴۴۱

سے کی تھی، اور حدیث کی روایت حسن بن سفیان وغیرہ سے کی اور فقیہ و متکلم کا لقب پایا اور دینی و علمی مرتبہ ایسا حاصل کیا کہ تلامذہ و معتقدین کا گروہ ان کا حلقہ بگوش رہتا تھا۔ وہ اپنے ہندستانی ہونے کا برملا ذکر کرتے تھے، حافظ عبد اللہ نے ان کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جسے سمعانی اور مقدسی نے بہ روایت مسلسل نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں :-

ایک مرتبہ ابو نصر سندھی کے ساتھ جا رہا تھا ان کے معتقدین و تلامذہ کا ایک مجمع اُن کے پیچھے تھا۔ راہ میں ایک عرب نشہ میں چور زمین پر پڑا دکھائی دیا۔ ابو نصر کو اس شان سے جاتے دیکھ کر اس نے بدمستی میں بعض نا ملائم الفاظ کہہ کر کہا :-

"اے غلام ذرا مجھے دیکھ میں زمین پر پڑا ہوں، اور تو معتقدین کا ایک گروہ ساتھ لیے شان سے جا رہا ہے"

شیخ ابو نصر نے برجستہ جواب دیا۔

"اے شریف زادے! جانتے ہو یہ ایسا کیوں ہوا، بات یہ ہے کہ ہم تمھارے اجداد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور تم میرے باپ داداؤں کے پیچھے ہو لیے ![1]"

(ابو العطا سندھی)

ابو العطا سندھی کا نام ہر عربی خوان نے سُنا ہوگا۔ اس نے عربی ادب میں ایسا کمال پیدا کیا، کہ قادر الکلام عرب شعرا کے پہلو میں جگہ پائی، ابو تمام نے اپنی مشہور کتاب حماسہ میں اسے بھی جگہ دی ہے۔

ابو عطا سندھی کا نام افلح اور اس کے باپ کا نام یسار تھا، یسار مع اپنے لڑکے کے غلام بنا کر سندھ سے عرب لے جایا گیا اور بنو اسد کا غلام بنا، کوفہ میں قیام تھا، افلح کی ابتدائی نشو و نما کوفہ میں ہوئی، اس کے بعد وہ عنترہ[2] بن سماک بن حصین اسدی کا غلام بنا،

جب افلح کی جودت طبع کے جوہر کھلے اور شعر و شاعری کرنے لگا، تو اس کے

---

[1] کتاب الانساب سمعانی ورق ۱۴۳۰۔ کتاب الانساب مقدسی ص ۹۷۔ [2] بہ روایت عمرو

آقا عنترہ بن سماک نے اس کے ذوق ادب کی قدر کرکے اسے آزاد کردیا۔ لیکن جب رفتہ رفتہ ملک میں اس کی قدردانی ہوئی اور صاحب ثروت ارباب ذوق اس کی شاعری کا اسے صلہ دینے لگے اور معاشی حیثیت سے اس نے خاصی ترقی کرلی تو اس کے آقا عنترہ بن سماک کو لالچ پیدا ہوئی، اس نے نئے سرے سے اس کے غلام ہونے کا دعویٰ کیا اب دشواری یہ تھی کہ اس کا کوئی ثبوت نہ تھا، کہ وہ واقعی آزاد ہوچکا ہے، یہ قصہ اہل ادب و شعر کو ناگوار گزرا، ان لوگوں نے افلح کی حمایت کی اور اس پر معاملہ طے کردیا، کہ وہ چار ہزار کے معاوضہ پر مکاتب بنالیا جائے۔ یعنی جب وہ چار ہزار ادا کردے تو وہ آزاد ہوجائے۔ عنترہ نے یہ شرط منظور کرلی۔

اس کے بعد افلح ایک ممتاز رئیس حرب بن عبداللہ قرشی کے پاس پہنچا، اور قصیدہ میں یہ صورت حال بیان کی اس نے ادب نوازی کا ثبوت دیا اور اسی وقت چار ہزار نقد دے دیئے، کہ جاکر اپنی گلو خلاصی کرائے چنانچہ وہ رقم ادا کرکے آزاد ہوگیا۔ آزادی کے بعد اس نے عنترہ کی شان میں بڑی سخت ہجو لکھی اور اس کے حرص کا اسے پورا مزہ چکھایا۔

افلح کا باپ سیاہ رنگ آخر عمر تک عربی زبان صحیح طور پر نہ سیکھ سکا۔ صرف ٹوٹی پھوٹی زبان میں اپنا مفہوم ادا کرلیتا تھا۔ لیکن جیسا گزرا افلح کو بچپن سے زبان سیکھنے کا موقع ملا اور آگے چل کر ایسا قادر الکلام شاعر بنا کہ اس کے آگے زبان دان عرب شرمانے لگے، لیکن اس کے باوجود اس کے لب و لہجہ اور تلفظ میں ہندیت کا اثر باقی رہ گیا تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ وہ جیم کو زے اور شین کو سین کرتا تھا۔ مثلاً اس نے ایک مرتبہ ایک موقع پر کہا، وبیک فینا مدحتها انسبا [illegible]

یعنی

[illegible]

اس لیے اشعار پڑھنے [illegible] [illegible] آلی [illegible]

اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ [illegible] کہتے تھے [illegible]

ان کا کلام سنا یا کرتے تھے [illegible] دربار کا رشتہ

کیا اور اس کی شان میں ایک طویل قصیدہ سنایا اور اس میں اپنے عجمی ہونے اور تلفظ
کے صحیح نہ ہونے کا عذر کیا، اور اپنے ملکۂ شعری کا ذکر کر کے ایک راوی کے عطا کیے جانے
کی ضرورت جتائی۔

سلیمان بن سلیم نے اس کی درخواست منظور کی اور ایک زبان دان بربری غلام عطا
کیا جو بہترین طریقہ سے صحیح لب و لہجہ میں قصائد پڑھتا تھا، افلح نے اس کا نام عطا رکھا
اور اس کے نام پر اپنی کنیت ابو العطا اختیار کی اور اُسے اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ اور اس کے بعد
ابو العطا السندی کے نام سے مشہور ہوا۔

اب جب محفلوں میں قصیدہ پڑھنے کی ضرورت پڑتی عطا بڑے جوش و خروش سے
پڑھتا اور ساری محفل وجد میں آجاتی،

ابو العطا مخضرمی شعراء میں گنا گیا ہے۔ اگرچہ اس نے عشقیہ قصائد بھی لکھے، تاہم
اس کا خاص موضوع حماسہ تھا، بنو امیہ کا ثنا خوان تھا، ان کے مفاخر اور جنگی کارنامے
بڑے ذوق سے بیان کرتا، اس لیے بنو امیہ کے خاص شعراء میں شمار کیا جاتا، بلکہ بنو عباس
اور بنو امیہ کی لڑائی میں بھی شریک ہوا، اور اس کا راوی عطا اس جنگ میں مارا گیا۔
بنو امیہ کے خاتمہ پر اس نے بڑے پردرد مرثیے لکھے۔

اس کی اس حرکت سے خلیفہ ابو جعفر منصور اس سے ناراض تھا لیکن اس کے لیے فرمانروائے
وقت کی اطاعت ضروری تھی، اس لیے دربار میں حاضر ہوا کہ قصیدہ سنائے، ابو جعفر منصور
اُسے دیکھ کر سخت برہم ہوا اور سخت الفاظ میں خطاب کر کے اس
سے کہا۔۔

"تو وہی ہے دشمن خدا فاجر و فاسق نصر بن سیار اموی کا مرثیہ کہا ہے"

اور مرثیہ کے چند اشعار پڑھے اور پھر کہا۔

"خدا کی قسم میں اس کے بعد تیرے ساتھ کوئی سلوک نہیں کر سکتا"

ابو العطا دربار سے نکل آیا، اور پھر چند قصائد کہے جن میں بنو امیہ کے محامد
بیان کیے، ان کے مصائب پر خون کے آنسو بہائے، اور پھر ان میں بھی کھل کے

ابوجعفر منصور کی ہجو کی اور وہ قصائد دار الخلافہ کے بچے بچے کی زبان پر آگئے،

نصر بن سیار اموی جس کی محبت کے جرم میں وہ منصور کے دربار سے نکالا گیا تھا، اس کا بڑا قدردان تھا، ان دونوں کے دلچسپ شاعرانہ لطائف کتابوں میں مذکور ہیں اس نے اس کے قصائد پر بڑے حوصلہ سے انعامات دیئے۔ کسی قصیدہ پر دس ہزار کسی پر چالیس ہزار، اسی طرح ایک موقع پر ایک خوبصورت قندھاری کنیز ہبہ کی۔

دوسرے امرا بھی اپنی ادب نوازی کا ثبوت دیتے رہتے تھے، ایک مرتبہ ابوالعطا مکہ کے راستہ میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس کا خیمہ راستے کے کنارے پر سمٹا سمٹایا پڑا تھا، ادھر نہیک بن معبد عطاردی کا گزر ہوا۔ اس نے پوچھا یہ کس کا خیمہ ہے، لوگوں نے بتایا "ابوالعطار سندھی کا" اس نے غلاموں کو کچھ سازوسامان اور کپڑے دے کر بھیجا کہ اس کا خیمہ قرینہ سے کھڑا کر کے اسے مرتب کر دیں، ابوالعطا نے جب یہ سازوسامان دیکھا تو اس کی شان میں ایک مدحیہ شعر بلند آواز سے پڑھا، اور وہ شعر قافلہ والوں میں مشہور ہو گیا،

اس کے بعد ان دونوں کی ملاقات ہوئی، نہیک نے کہا "ابوالعطا اس شعر پر کچھ اضافہ کرو۔ اس نے برجستہ جواب دیا۔

میں نے تمہیں اتنا عطا کیا جتنا تم نے مجھے عطا کیا تھا، اگر تم اپنے عطیہ کو بڑھاؤ گے

تو میں بھی اپنے عطیہ میں اضافہ کردوں گا"

معاصر شعرا سے اس کی معاصرانہ چشمکیں بھی رہتی تھیں، اس عہد میں ابودلامہ مشہور عرب شاعر تھا۔ ان دونوں میں خاصی نوک جھونک رہتی ابوعطا نے ابودلامہ کے ایک خچر کی ہجو مزاحاً لکھی، اس نے اپنا خچر فوراً فروخت کر ڈالا اور پھر ابوالعطا کی شان میں ایک طویل ہجویہ نظم لکھ ڈالی۔ اہل ادب نے دونوں قصیدوں سے خوب لطف اٹھایا۔

ابوالعطا نے خلیفہ منصور کے زمانہ میں وفات پائی[۱]

(مئی ۱۳۵ھ ۱۹۶۳ء) ت

---

[۱] کتاب الاغانی ج ۱۶ ص ۸۲، ۸۴ کتاب الشعر و الشعراء ابن قتیبہ ۲/۲۱، ۲۳ و تذکرہ دیوان حماسہ ج ۲ ص ۳۰

سندھ و ملتان کی عربی حکومتیں

اور ان کے اثرات

دورِ ولایت سندھ اور ملتان کی تسخیر کی مہم محمد بن قاسم ثقفی کے ہاتھوں پہلی صدی ہجری میں مکمل ہو گئی تھی، اس کے بعد تقریباً سوا سو برس یہ ملک دمشق پھر بغداد کی حکومت کا جزو رہا، سندھ پر حملہ آوری کی مہم عراق کے والی کی سرکردگی میں انجام پائی تھی۔ اس لیے سندھ کی حکومت والی عراق ہی کے ماتحت رہی اور وہیں سے خلیفۃ المسلمین کی رسمی منظوری کے بعد وقتاً فوقتاً ولاۃ نامزد ہو کر آتے رہے، چنانچہ جیسا کہ اوپر گزرا محمد ابن قاسم کے بعد یزید بن کبشہ کی تقرری اور اس کی وفات کے بعد حبیب بن مہلب کے تقرر سے سندھ کے داخلی امن و امان کو نقصان پہونچا۔ خلیفۂ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ۹۹ھ میں مہلب کو معزول کر کے عمرو بن مسلم باہلی کو امارت پر بھیجا اور سندھ کے نامسلمانوں میں سے ارباب اقتدار کو تبلیغی دعوت نامے براہ راست بھیجے جس سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا جن میں راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی تھا[۱]۔ اس کے بعد جب آل مہلب نے خلافت سے بغاوت کی تو اپنے سابق اثرات سے فائدہ اٹھا کر سندھ کو اپنا مرکز قرار دیا، وداع ابن حمید یہاں ان کا سرغنہ بنا، مگر ہلال بن احوذ تمیمی کی سرکردگی میں لشکر آیا جس نے آل مہلب کا خاتمہ کیا[۲]۔ ۱۰۷ھ میں عمرو بن مسلم باہلی کے بجائے جنید بن عبد الرحمٰن المری یہاں کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے امان طلب کر کے برہمن آباد کو اپنا پایۂ تخت بنا کر حکومت کرتا رہا جنید سے اس کے تعلقات خوش گوار نہ رہ سکے، دونوں میں جنگ آزمائی ہوئی جے سنگھ مارا گیا[۳]۔ اس کے بعد اس نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا اور وہ بڑھ کر

---

[۱] نزہۃ الخواطر ص ۹ و ۱۰ بلاذری ص ۴۴۳ [۲] ابن اثیر ج ۵ ص ۴۶ [۳] بلاذری ص

مالوہ اور گجرات گیا، پھر آگے بڑھ کر کشمیر کی سرحد تک پہنچا، سنہ ۱۱۱ھ میں جنید صوبہ خراسان کا والی بنا کر بھیج دیا گیا، اور یہاں کی حکومت کی باگ تمیم بن زید عتبی کے ہاتھ میں آئی، مشہور شاعر فرزدق نے اسی کے نام اپنا مشہور قصیدہ لکھ کر بھیجا تھا۔ تمیم کامیاب حکمران ثابت نہ ہوسکا[1]، اور جلد ہی اس نے وفات پائی، اور ملک میں عام ابتری پیدا ہوگئی، تو سندھ کی حکومت کی باگ عارضی طور پر دوبارہ جنید کے ہاتھ میں دی گئی، وہ خراسان میں رہ کر یہاں کی دیکھ بھال کرتا رہا، مگر حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی، یہاں تک کہ والی عراق کی طرف سے حکم بن عوانہ کلبی امیر سندھ بنا کر بھیجا گیا اور اس نے ایک قلعہ بند شہر کی بنا ڈال کر محفوظہ سے اس کو موسوم کیا اور اسی کو پایۂ تخت بنا کر سندھ میں اسلامی حکومت کا پایۂ تخت اور مسلمانوں کا مرکز قرار دیا، پھر اس نے امن و امان قائم کرنے کے لیے مہمیں بھیجیں، اور ملک میں نئے سرے سے امن و امان قائم کیا، فتوحات سے واپسی میں اس نے دوسرے شہر منصورہ کی بنا ڈالی۔ اور آخر میں یہی شہر اسلامی حکومت کا پایۂ تخت بنا، سنہ ۱۲۱ھ / ۷۳۸ء یا ۱۲۲ھ / ۷۳۹ء میں حکم ایک لڑائی میں مارا گیا، اب عراق کی حکومت یوسف بن عمر ثقفی کے ہاتھ میں تھی، چنانچہ اسلامی حکومت سندھ کی باگ ڈور محمد بن قاسم کے بیٹے عمرو کے ہاتھ میں دی گئی، جو یہاں اپنی شجاعت کے کارنامے انجام دے رہا تھا، عمرو ثقفی کے دور میں بغاوتوں کو فروغ حاصل ہوا، مگر وہ پامردی سے مقابلہ کرتا رہا، یہاں تک کہ دشمنوں کو شکست دی، اسی اثنا میں آل مہلب نے مروان بن یزید بن مہلب کی سرکردگی میں پھر سر اٹھایا، مروان قتل کیا گیا، اور یہ فتنہ بھی رفع ہوا، اسی اثنا میں مسند خلافت پر ہشام کی جگہ ولید آیا۔ اس نے ہشام کے والیوں کو معزول کیا، اور سنہ ۱۲۵ھ / ۷۴۲ء میں عمرو بن محمد ثقفی بھی معزول کیا گیا اور سندھ کی ولایت کی باگ یزید بن عرار کے ہاتھ میں آگئی، یہ سندھ میں اموی سلطنت کا آخری والی تھا اس دور میں دارالخلافت حوادث و انقلابات کا شکار رہا۔ یہاں تک کہ خلافت کا خاتمہ ہوا

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۶ [2] یعقوبی ج ۲ ص ۵۹ [3] تحفۃ الکرام ص ۲۰

اور ۱۳۲ھ سے عباسیوں کے دورِ حکومت کا پرچم لہرانے لگا، عباسیوں کے داعی اور اموی سلطنت کے مخالفین دور دور کے صوبوں میں پہنچ چکے تھے، چنانچہ سندھ میں اموی سلطنت کا چراغ پہلے گل ہوا، منصور بن جمہور کلبی نے جو دار الخلافہ سے فتنہ برپا کرتا ہوا سندھ تک آ پہونچا تھا، ۱۳۲ھ میں ابن اعرار سے مقابلہ کرکے اس کو قتل کیا، اور اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔[1]

منصور بن جمہور کلبی سے سندھ کی اسلامی حکومت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، منصور نے اپنے بھائی منظور کو مغربی سندھ کے علاقہ قندابیل اور دیبل وغیرہ کا حاکم بنایا اور خود حکومت سندھ کے انصرام میں مصروف ہوگیا، اس زمانہ میں خلافت عباسیہ کی طرف سے ابومسلم خراسانی مشرقی ممالک کا انچارج تھا، اس نے سندھ کی ولایت کے لیے ابومسلم عبدالرحمٰن بن مسلم مغلس عبدی کو مامور کیا، وہ فوج لے کر دیبل پہنچا، یہاں منظور کلبی نے مقابلہ کیا، اور مارا گیا، یہ سن کر منصور خود آگے بڑھا، منصورہ کے قریب دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا، مغلس عبدی کو شکست ہوئی وہ گرفتار ہو کر ۱۳۳ھ میں قتل کیا گیا، ابومسلم خراسانی نے یہ روداد سن کر موسیٰ بن کعب تمیمی کو بارہ ہزار فوج کے ساتھ سندھ پر حملہ آوری کے لیے روانہ کیا، اس نے منصور کو شکست دی، وہ فرار ہوا، اور صحرا میں پیاس کی شدت سے جان دی، اس طرح ۱۳۴ھ میں سندھ کی حکومت خلافت عباسیہ کے زیر اقتدار آئی۔[2]

موسیٰ پہلا عباسی امیر سندھ تھا، کچھ دنوں یہاں مقیم رہا، اور فتوحات انجام دیے پھر اپنے بیٹے عیینہ کو اپنا قائم مقام بنا کر عراق واپس گیا، عیینہ کامیاب حکمران ثابت نہیں ہوا، ملک کے مقیم عرب باشندوں میں قبائلی جنگ شروع ہوگئی، قحطانی و نزاری قبیلے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، اس نے سب کو قتل کرا دیا، پھر اس کے خلاف بعض سازشیں بھی ہوئیں، بالآخر خلیفہ منصور نے ۱۴۲ھ میں عمر بن حفص ہزار مرد کو سندھ

---

[1] ابن اثیر ج ۵ ص ۷، ۲۱ یعقوبی ج ۱ ص ۳۴۴ و نزہۃ الخواطر ص ۹۴ [2] ابن اثیر ج ۵ ص ۱۷ یعقوبی ج ۳ ص ۹۴، نزہۃ الخواطر ج ۱ ص [illegible] [illegible] منصور ۹۴ و عراء ۴۴۴ و کعب [illegible]

کا والی بنا کر بھیجا، عیینہ بغاوت پر آمادہ ہوا، عمر بن حفص نے کامیاب پیش قدمی کی اور امان دے کر منصورہ پر قبضہ کیا، اور عیینہ کو گرفتار کر کے دارالخلافہ بھیج دیا۔ لیکن وہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی راہ میں قتل کر دیا گیا۔[١٩]

عمر بن حفص کا دورِ حکومت کئی حیثیتوں سے اہم ہے، اسی کے عہدِ حکومت میں شیعی اور خارجی دونوں فرقوں کے مبلغین سندھ میں وارد ہوئے، چنانچہ سنہ ۱۴۲ھ/۷۵۹ء میں خارجی فرقہ کا مبلغ حسان بن مجاہد ہمدانی سندھ میں داخل ہوا مگر عمر بن حفص سادات کا طرفدار تھا، خارجیوں کو اس کی حمایت حاصل نہ ہو سکی، اس لیے یہ مبلغین موصل واپس چلے گئے، دوسری طرف حضرت عبداللہ بن محمد معروف بہ عبداللہ الاشتر بن محمد النفس الذکیہ سندھ میں وارد ہوئے، عمر بن حفص نے اپنے فطری رجحانات سے ان سے چشم پوشی کی اس طرح وہ خود سندھ میں شیعیت کی تحریک کے فروغ پانے میں معاون بنا، حضرت عبداللہ بن محمد معروف بہ عبداللہ الاشتر بن محمد النفس الذکیہ کی عقیدت سے پذیرائی کی، اور رازداری کے ساتھ ان کو ایک راجہ کے حدودِ حکومت میں ٹھہرا دیا اور یہ اپنے مشن کی تبلیغ میں مصروف رہے، اور شیعیت کی اشاعت ہوتی رہی، اتفاق سے سنہ ۱۵۱ھ میں خلیفہ المنصور کو حضرت عبداللہ الاشتر کے حالات معلوم ہو گئے، اس نے ان کی گرفتاری کا حکم بھیجا، اس حکم کی تعمیل میں ایک دوسرے فدائی کو الاشتر کا نام دے کر یہاں سے دارالخلافت بھیجا گیا جو وہاں قتل کیا گیا، المنصور کو اس واقعہ کی بھی آگاہی ہو گئی۔ مگر صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ عمر بن حفص کے خلاف کسی جرم کا کوئی ثبوت نہ رکھتا تھا، اس کے ساتھ وہ اس کے تدبر و دانائی کا قائل تھا۔ اس لیے اس نے اس کو سندھ کی ولایت سے ہٹا کر افریقیہ جیسے بڑے صوبہ کی ولایت پر مامور کر دیا، اور سندھ کی ولایت کا پروانہ ہشام بن عمرو تغلبی کو دیا، جس نے سنہ ۱۵۱ھ میں یہاں آ کر زمامِ حکومت سنبھال لی، المنصور نے ہشام کو بھی عبداللہ الاشتر کی گرفتاری کا حکم بھیجا، مگر در پردہ یہ بھی سادات کا ہمنوا تھا، اس نے ان کی گرفتاری سے اغماض کیا، مگر اس کے بھائی سفیح بن عمرو تغلبی نے اچانک

---

١٩ ابن اثیر ج ۵ ص ۴۸۸، یعقوبی ج ۲ ص ۴۴۰، نزہۃ الخواطر ص ۱۲۹ (عیینہ)، ۳۴ (عنکی)

ان کے دستہ کو دیکھ لیا اور حملہ آور ہو کر قتل کر ڈالا، ہشام نے ان کے اہل وعیال
اور محمد بن عبداللہ معروف بہ ابن اشتر کو المنصور کے پاس بھیج دیا جس نے اس
لڑکے کو مدینہ منورہ کے عامل کے سپرد کر دیا، اگرچہ حضرت عبداللہ الاشتر نے
سندھ ہی میں جام شہادت نوش کیا مگر شیعیت کے اثرات فنا نہ ہو سکے اور آگے چل کر
شیعوں کی مستحکم حکومت سندھ میں قائم ہوئی [1] اس کے بعد ہشام تغلبی نے توسیع
مملکت کی فکر کی اور کھبروج، ملتان اور گندہار کو زیر اقتدار لایا، پھر وہ ۱۵۷ھ میں
رخصت لے کر وطن گیا، اور وہیں اس نے وفات پائی، سندھ کی ولایت پر معبد بن
خلیل تمیمی مامور کیا گیا، اس نے ۱۵۹ھ میں وفات پائی تو روح بن حاتم مقرر کیا گیا۔

اس زمانہ میں ہندستان کے خلاف بحری مہم بھی جاری رہی، چنانچہ عربوں
کے جنگی بیڑے ساحل گجرات سے آکر ٹکرائے، خلیفہ مہدی کا بھیجا ہوا ایک عربی بیڑا
گجرات کے ساحل پر عرب تاجروں کے کسی نزاع کے سبب سے آیا تھا اس بیڑے میں حضرت
ربیع بن صبیح سعدی تابعی بھی تھے اور جزائر ہند میں سے کوئی جزیرہ ان کا ابدی
خواب گاہ بنا۔

ادھر سندھ کی ولایت میں جلد از جلد تغیر و تبدل ہوتا رہا، چنانچہ ۱۵۹ھ
میں روح بن حاتم جو والی ہو کر آیا تھا۔ اسی سال واپس بلایا گیا اس کی جگہ بسطام
بن عمر کو دی گئی، مگر ۱۶۰ھ یا ۱۶۱ھ میں وہ بھی طلب کر لیا گیا، اور روح بن حاتم
کو دوبارہ بھیجا گیا، مگر چند ہی مہینوں میں اس کی ناکامی پھر آشکارا ہوئی تو نصر بن
محمد بن اشعث خزاعی والی سندھ ہو کر آیا۔ مگر وہ بھی اسی سال واپس بلا لیا گیا، اور سندھ
کی زمام سلطنت ایک ہاشمی محمد بن سلیمان بن علی کے ہاتھ میں دے دی گئی جنہوں نے
عبدالملک بن شہاب مسمعی کو اپنا نائب بنا کر بھیجا، جو اس سے پہلے بھی بحری حملہ میں آ چکا
تھا مگر اس کی نیابت بھی قائم نہ رہ سکی اور نصر دوبارہ مقرر ہو کر آیا، پھر زبیر بن عباس

---

[1] ابن اثیر ج ۵ ص ۲۵۵، ۲۵۶، نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۳۷ (عمر بن حفص) ص ۴۰ (ہشام تغلبی)
ص ۴۲ (عبداللہ الاشتر) ص ۴۰ (ابن الاشتر)

اس عہدہ پر بھیجا گیا، اس کے بعد مقیح بن عمر تغلبی کے ہاتھوں میں اس کی ولایت کی باگ آئی، اس دور میں یہاں یمنی و حجازی نزاع شباب پر پہنچ گئی تو نصر بن محمد بن اشعث تیسری مرتبہ یہاں والی ہوکر آیا، اور ۱۶۱ھ سے ۱۶۴ھ تک کامیاب حکمرانی کرکے وفات پائی۔[1]

اس کے بعد خلیفہ مہدی نے اپنے غلام لیث بن طریف کو اس عہدہ پر مامور کرکے بھیجا مگر سندھ میں داخلی بدامنی کا دور دورہ ہو چکا تھا۔ اس نے اس کو فرو کیا تو جاٹوں نے منظم بغاوت کی، خلیفہ مہدی نے لشکر بھیج کر لیث کی مدد کی، ۱۶۵ھ میں یہ بغاوت فرو ہوئی اس کے بعد ہارون رشید کی خلافت کا دور آیا۔ اس نے ۱۷۰ھ میں سالم یونسی کو والی بناکر بھیجا[2] اس نے چار سال حکمرانی کی، اس کے بعد ۱۷۴ھ میں اسحاق بن سلیمان ہاشمی آیا، وہ اسی سال وفات پاگیا تو اس کا لڑکا یوسف بن اسحٰق اس کا قائم مقام بنا،

اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے طیفور بن عبداللہ بن منصور کو والی بناکر بھیج دیا، اور ملک میں قبائلی لڑائی پھر شروع ہوگئی تو جابر بن اشعث طائی آیا، اس کی ناکامی پر سعید بن سلیم بن قتیبہ مقرر کیا گیا، اس نے اپنے بھائی کثیر بن مسلم کو اپنا نائب بناکر بھیج دیا، تو مزید بدامنی پیدا ہوئی اس لیے عیسیٰ بن جعفر بن منصور عباسی کو اس ولایت کی مہم سپرد ہوئی۔ اس نے محمد بن عدی ثعلبی کو اپنا قائم مقام بنایا، اس نے سندھ میں ناکامی کے بعد ملتان کا رخ کیا، وہاں بھی ناکام رہا تو عبد الرحمٰن [illegible] کا والی بناکر بھیجا گیا، پھر ایوب بن جعفر بن سلیمان آیا۔ ان پے در پے ناکامیوں کے بعد ہارون رشید کی نگاہ انتخاب آل مہلب پر اٹھی اور اس نے ۱۸۴ھ/۸۰۰ء میں داؤد بن یزید بن حاتم مہلبی کو سندھ کی عنان حکومت دی،

داؤد مہلبی نے بیٹے مغیرہ کو اپنا نائب بناکر بھیجا، سندھ میں ان دنوں عربوں کی قبائلی خانہ جنگی برپا تھی، مغیرہ نزاریوں کو مطیع کرنے میں ناکام رہا اور وہ وفات کی اطلاع داؤد کے پاس بھیجی، تو وہ خود سندھ آیا اور اپنی سخت گیریوں سے سندھ

۱؎ ابن اثیر ج ۵ ص ۱۷۷، ۲۰۲، ۲۴۴ [illegible] ص ۴۴۴ [illegible] (طبقہ) ۳۲۲ (سمعی) ۳۰ (مہلبی ثعلبی)، ۲؎ نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۴۰

سے نزاریوں کی طاقت کا خاتمہ کیا، اور تقریباً ۲۰ سال تک امن وامان سے حکومت کرتا رہا، سنہ ۲۰۵ھ/۸۲۰ء میں اس کی وفات کے بعد مامون نے اس کے بیٹے بشر کو یہاں کی سندھ ولایت بھیجی، اور دس لاکھ درہم (۲ ½ لاکھ روپیہ) سالانہ خراج مقرر کیا بشر چند سال حکمرانی کرتا رہا، مگر پھر خراج کا بھیجنا بند کردیا، اور اطاعت سے انحراف کیا، تو مامون نے پہلے سنہ ۲۱۱ھ/۸۲۶ء میں حاجب بن صالح کو بھیجا بشر نے اس کو شکست دی تو سنہ ۲۱۳ھ/۸۲۸ء میں غسان بن عباد مہلبی اور اس کے بھائی محمد بن عباد کو سندھ کے معاملات درست کرنے کے لیے بھیجا، انھوں نے آکر سنہ ۲۱۴ھ/۸۲۹ء میں سندھ کو اپنے اقتدار میں لے لیا، پھر یہاں کے معاملات کو ٹھیک کرکے وہ بشر کو ساتھ لے کر سنہ ۲۱۶ھ/۸۳۱ء میں بغداد واپس آگیا، اور مامون کے حکم کے مطابق سندھ کی حکومت کی عنان ہارون رشید کے مشہور وزیر خالد برمکی کے پوتے موسیٰ بن یحییٰ برمکی کے سپرد کردی، اور وہ حسن انتظام سے خدمت انجام دیتا رہا، سنہ ۲۲۱ھ/۸۳۵ء میں اس نے وفات پائی، تو اس کے بیٹے عمران کو یہاں کی حکومت تفویض ہوئی، اس نے مغربی علاقوں کے جاٹوں کی قوت توڑ دی، اسی طرح مید قوم کی طاقت کا خاتمہ کیا۔ نیز چند دوسری بغاوتوں کو سر کیا، اور بعض نئے شہروں پر قابض ہوا، سندھ کے مشہور شہر البیضا کی تعمیر اس کے ہاتھوں انجام پائی پھر سندھ میں یمنی و نزاری فتنہ اٹھا تو عمران یمانیوں کی طرف مائل ہوگیا، عمر بن عبدالعزیز ہباری نے جو رفتہ رفتہ حجازیوں کا سردار بن گیا تھا، اور قریشیوں کو خصوصاً اپنے گرد اکٹھا کرلیا تھا عمران کو سنہ ۲۲۶ھ/۸۴۱ء میں قتل کردیا، اس کے بعد عنبسہ بن اسحٰق ضبی سندھ کی ولایت پر بھیجا گیا۔

سندھ اس زمانہ میں مصر کے والی کی نگرانی میں سمجھا جاتا تھا، خلیفہ متوکل نے یہاں کے ترکی والی ایتاخ کو گرفتار کرایا۔ تو عنبسہ کو اپنا مستقبل تاریک نظر آیا، وہ سندھ میں ایتاخ ہی کا فرستادہ تھا، وہ بلا طلب دربار خلافت میں حاضر ہوگیا، خلیفہ نے سنہ ۲۳۲ھ/۸۴۶ء میں ہارون بن خالد مروزی کو سندھ کا والی بنایا۔

اس اثنا میں سندھ میں حجازی طاقت در ہو چکے تھے ان کے سردار عمر بن عبدالعزیز

ہباری نے نمایاں اقتدار حاصل کر لیا تھا، اس نے موقع پاکر سندھ کے والی ہارون
بن خالد کو بھی قتل کرا دیا اور خلیفہ المتوکل کی خدمت میں عرضداشت بھیجی، کہ ہارون
میں انتظام سلطنت کی صلاحیت نہیں تھی، اگر سندھ کی سند ولایت اس کو عطا کی
جائے، تو وہ یہیں کا رہنے والا ہے، کامل وفاداری سے امور مملکت کو سنبھال لے
گا، اس زمانہ میں المتوکل جا بجا کی بغاوتوں سے پریشان تھا، اس نے ہباری کی درخواست
کو غنیمت جانا، اور اس کے نام سند ولایت لکھ کے بھیج دی، اس نے خلیفہ کی برائے
نام اطاعت قائم رکھ کر اپنی خودمختار حکومت قائم کر لی، اور وہی سندھ میں ہباری
سلطنت کا بانی بنا جس میں اس کے اخلاف یکے بعد دیگرے سریر سلطنت پر آتے گئے[1]

اس طرح تیسری صدی کے بیچ میں مرکز کی کمزوری سے یہاں عرب گورنروں نے
خودمختاری اختیار کر لی، اس کے بعد کہیں ہندو راجاؤں نے کسی حصہ پر قبضہ کر لیا،
کہیں مسلمانوں نے اپنی ریاستیں کھڑی کر لیں، سندھ میں ممتاز عرب قبائل قریش، کلب
تمیم، اسد اور یمن و حجاز کے بہت سے قبیلے مختلف شہروں میں آکر آباد ہو گئے
تھے، دراصل انہی کی حکومتیں جا بجا قائم تھیں اور سندھ کی مرکزی عربی سلطنت
انھیں اپنا باجگزار بناتی۔ پھر یہاں بھی دوسرے ملکوں سسلی، اسپین، اور افریقہ کی
طرح جو قبائلی جھگڑے دور ولایت ہی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، خصوصاً یمنی و حجازی
قبیلوں کی خانہ جنگی سے یہاں کے عربوں میں غیر معمولی کمزوری آگئی، بہت سے علاقے
ہاتھ سے نکل گئے۔ صرف دو بڑی حکومتیں ایسی تھیں، جو کچھ دنوں تک قائم رہیں،
ایک سندھ کے سرے پر منصورہ میں، دوسری سندھ کے خاتمہ پر ملتان میں۔

ماہران فن و اعیان | سندھ میں گورنروں کی حکومت کا زمانہ سوا سو برس
سے زیادہ رہا اس زمانہ میں ہندوستان سے مرکزی حکومت بغداد کے گوناگون

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۴۹۴، ۵۸۸، ۵۸۵، ۵۹۹، فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۵، ۳۷۴، ابن اثیر ج ۷ ص ۲۵۶، المسالک و الممالک ابن خرداذبہ ص ۵۷، نزہۃ المشتاق [illegible]
[illegible]

تعلقات استوار ہوئے، خصوصاً یہاں کے اطبا اور وید بغداد میں بلائے گئے اور ممتاز عہدوں پر سرفراز کئے گئے، خلیفہ ہارون رشید نے اپنی علالت کے زمانہ میں یہیں کے اطبا سے اپنا خاص طور پر علاج کرایا اور ہندستان کے مختلف علوم و فنون سنسکرت سے عربی و فارسی زبان میں منتقل کئے۔

عرب مورخین نے ابن دہن ہندی کے نام سے ہندستان کے ایک ماہر طبیب کا ذکر کیا ہے۔ وہ بغداد کے بیمارستان برامکہ کا افسر تھا اس نے عربی زبان کی بھی تحصیل کی، طب کی کئی کتابوں کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا، ابن ندیم نے اپنی فہرست میں ان کا تذکرہ کیا ہے،

ایک دوسرے ماہر فن صالح بن بہلہ ہندی کا ذکر امتیاز سے آیا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے اپنی طبقات الاطبا میں اور قفطی نے اخبار الحکما میں اس کا تذکرہ کیا ہے اس کی مہارت فن کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے، ہارون رشید کا چچا ابراہیم بن صالح بیمار تھا، اطبا اس کے علاج سے مایوس ہوئے، آخری ساعتیں آگئیں اس موقع پر ابن بہلہ نے اس کا معائنہ کیا اور یقین کے ساتھ اس کے صحت یاب ہونے کی پیشین گوئی کی، ہارون رشید نے کہا کہ وہ غیب کے علم کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس نے جواب دیا، غیب کا علم تو وہ ہے جو بلادلیل یقین کے ساتھ کہا جائے میں ان کے صحت یاب ہونے کے دلائل رکھتا ہوں، ہارون رشید مطمئن ہو گیا، کچھ دیر کے بعد قاصد ابراہیم کے گھر سے اس کی وفات کی خبر لے کر آیا، ہارون رشید سخت برہم ہوا، چچا کے گھر پر پہنچا اس کو غسل دے کر کفنایا جا چکا تھا، ابن بہلہ خاموش رہا پھر جرأت کر کے اس نے کہا، میں اب بھی کہتا ہوں اس کی موت نہیں آئی ہے۔ مجھے صرف اندر جانے کی اجازت دی جائے۔ لاش کے پاس پہنچ کر دائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں اس نے سوئی چبھوئی۔ اس میں حرکت پیدا ہوئی اور ہارون رشید کو بلا کر دکھایا، پھر غسل دلایا کہ کفن اور حنوط میں اپنے کو دیکھ کر اس کے قلب کی حرکت بند نہ ہو جائے، پھر فوری علاج کیا، اور وہ صحت یاب ہو کر بستر سے اٹھ بیٹھا

ابراہیم اس کے بعد مدتوں زندہ رہا، عباسہ بنت مہدی سے اس کی شادی ہوئی اور مصر و فلسطین کی ولایت پر مامور رہا، اور وہیں وفات پائی، ہارون رشید خصوصًا اس واقعہ کے بعد ہندستانی اطبار اور ویدوں کی حذاقت و مہارت فن کا غیر معمولی طور پر اعتراف کرنے لگا۔

اسی طرح منکہ ہندی کے نام سے ایک مشہور ماہر فن ہندستانی طبیب تھا، خلیفہ ہارون رشید نے اس کی مہارت فن کی شہرت سُن کر اس کو اعزاز و اکرام سے بغداد میں خود اپنے علاج کے لیے بلوایا اور مایوس ہونے کے بعد صحت یابی حاصل ہوئی، منکہ ہندستان کے ممتاز ذی علم فلاسفہ میں سے تھا، عربی و فارسی زبانوں پر بھی عبور حاصل کیا، اور بہ کثرت کتابیں سنسکرت سے عربی و فارسی زبانوں میں منتقل کیں، ابن ابی اصیبعہ اور ابن ندیم وغیرہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے، اور اس کی تصنیفات اور ترجموں کی فہرست نقل کی ہے،

اس عہد میں سندھ کے ممتاز اعیان و علمار میں منصور بن حاتم نحوی کا ذکر آیا ہے، وہ آل خالد بن اسید کے موالی میں سے تھا اور ہندستان میں مقیم تھا بلاذری نے اپنی فتوح البلدان میں ہندستان کے متعلق معلومات اس کی روایت سے نقل کئے ہیں۔

شیخ ابوعلی سندھی اس دور کے ممتاز مشائخ میں سے تھے، مشہور شیخ طریقت ابویزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی متوفی ۲۶۱ھ کے شیوخ میں سے تھے، حضرت بسطامی فرماتے ہیں "مجھے توحید و حقائق کی تعلیم ان ہی نے دی" شیخ ابونصر عبد اللہ بن علی سراج طوسی نے بھی ان کا تذکرہ اپنی مشہور تصنیف کتاب اللمع میں کیا ہے[۵۱]

فرمانروایان ہباریہ: ہبار بن اسود قبیلۂ قریش کی ایک شاخ بنو اسد میں سے تھا اس کی اولاد میں سے منذر بن زبیر، سندھ کے والی حکم بن عوانہ کے ساتھ سندھ آیا۔ عمر بن عبدالعزیز رح اس کا پوتا تھا جس نے قبائلی نزاع

---

[۵۱] نزہتہ الخواطر ج ا ص ۵۱) (ابن دہن) ۵۳ (ابن بہلہ) ۰۴ (منکہ) (منصور النحوی) ۵۰ ابوعلی سندھی۔

ہندوستانی طرز کا ملا جلا تھا۔[١]

خلافت بغداد سے تعلق | ہباریوں کے دور حکومت میں سندھ میں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، خلفائے عباسیہ اس کو اپنی ولایت میں تصور کرتے تھے، چنانچہ ٢٥٧ھ (٨٧١ء) میں خلیفہ معتمد نے یعقوب صفاری کی سند ولایت میں سندھ کے علاقہ کو بھی داخل کیا ہے، جس کے معنی یہ تھے، کہ اب سندھ کا تعلق حاکم یمن سے علیحدہ ہو کر حاکم کرمان و سجستان سے قائم کیا گیا، مگر یہ محض رسمی تعلق تھا،[٢]

عرب و ہند کے تعلقات میں اضافہ | باایں ہمہ اس زمانہ میں سندھ و عرب کے تعلقات میں اضافہ ہوا، بہ کثرت عرب سیاح ہندوستان آئے۔ اور یہاں کے معلومات کو اپنی تصنیفات میں قلم بند کیا اور آج تنہا وہی ماخذ ہیں جن سے اس عہد کے حالات معلوم کئے جا سکتے ہیں۔[٣]

قضاءت | سندھ کے عہدۂ قضاءت کے لیے ٢٨٣ھ (٨٩٦ء) میں شیخ محمد بن ابو الشوارب کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس منصب کے لیے وہ خلیفہ بغداد کی طرف سے منتخب کئے گئے تھے، مگر چند مہینوں سے زیادہ اس خدمت کو انجام نہ دے سکے اور سندھ ہی میں وفات پائی۔[٤] اس کے بعد یہ منصب بھی ان کے خاندان میں موروثی ہو گیا، اور آل ابی الشوارب ہی کے ذی علم افراد اس منصب پر مامور ہوتے رہے۔

منصورہ کے قضاۃ میں شیخ ابو العباس احمد بن محمد صالح منصوری سندھی کی جلیل القدر شخصیت بھی گذری ہے، یہ مذہب داؤد ظاہری کے متبع تھے، حافظ ابو عبد اللہ حاکم صاحب المستدرک کے شیوخ میں سے تھے، حاکم نے اپنی المعجم میں

---

[١] مروج الذہب ج ١ ص ٣٧٨، ٣٨١، احسن التقاسیم ص ٤٧٩، ٤٨١، بلاذری ص ٤٤٥، ٤٤٦ ابن اثیر ج ٩ ص ٣٤٣، ابن خلدون ج ٢ ص ٣٢٦ [٢] ابن خلدون ج ٣ ص ٣٤٣ [٣] مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے اپنی تاریخ سندھ میں ان کو یکجا کیا ہے، یہ کتاب سندھ کے ان حالات کے اختصاراً قلم بند کرنے میں راقم سطور کے سامنے بھی رہی ہے۔ [٤] ابن اثیر ج ٧ ص ٣٣٤

ان کا تذکرہ کیا ہے، مقدسی ان سے منصورہ میں ملا تھا، وہ اپنی تصنیف احسن التقاسیم میں لکھتا ہے۔

"میں قاضی ابو العباس منصوری سے ملا، وہ داؤدی اور اپنے مذہب میں امام ہیں، درس و تدریس کا شغل ہے اور صاحب تصانیف ہیں۔ کئی اچھی کتابیں انھوں نے تصنیف کی ہیں"

ابن ندیم نے ان کی تصنیفات کی ستائش کرکے ان کی تین کتابوں، کتاب المصباح کتاب الہادی و کتاب النیر کا تذکرہ کیا ہے، سمعانی کی کتاب الانساب میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔[۱]

شیخ موسیٰ بن یعقوب ثقفی سندھی ارور کے قاضی تھے، پھر سندھ کے قاضی القضاۃ ہوئے التمش کے زمانہ تک ان کا خاندان ارور میں عہدۂ قضا پر مامور رہا، کمال الدین اسمٰعیل بن علی محمد ثقفی ۶۱۳ھ (۱۲۱۶ء) میں ارور کی قضا پر مامور تھے، مشہور تاریخ چچ نامہ انہی کے بزرگوں نے لکھی تھی، جس کو ابن علی کوفی نے فارسی میں ترجمہ کیا۔[۲]

سندھ کے چند دوسرے حکمران خاندان اور ان سے سلطنت ہباریہ کے تعلقات | سلطنت ہباریہ منصورہ نے گویا سندھ کی مرکزی حکومت کی حیثیت اختیار کرلی تھی

اس کے ساتھ، سندھ کے مختلف علاقوں میں جابجا دوسرے مسلمان اور نامسلمان حکمران بھی اپنی حکومت سنبھالے تھے ان کا ذکر ابن حوقل نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے، یہ حکمران گویا سلطنت ہباریہ کے باج گزار تھے، ان میں سے بیشتر سے اس کے تعلقات خوش گوار تھے، اور غیر مسلم حکمران اسلام کے متعلق بھی استفسار کرتے رہتے، اور دعاۃ ان کے پاس جاتے اور وہ اسلام کی تعلیم ان کے سامنے پیش کرتے، ۲۷۰ھ (۸۸۳ء) میں ایک غیر مسلم راجہ نے جس کا نام عرب مورخین نے "مہراک بن رامک" لکھا ہے، سندھی

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۶۵ بحوالہ مقدسی و ابن ندیم و سمعانی، [۲] چچ نامہ ص ۹۰، ۸۲ و تاریخ سندھ ص ۵۱، ۳۵

زبان میں اسلام کی تعلیمات لکھ کر طلب کیں، وہ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہوا پھر سندھی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھوا کر پڑھتا رہا، اور دل سے اسلام لے آیا۔ اس نے سلطنت کے زوال کے خطرہ سے اگرچہ اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا، مگر عبادت کے لیے ایک علیحدہ عمارت بنوائی اور اس میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہنے لگا۔[1]

خاندان سومرہ | سومرہ سندھ کی مخلوط النسل قبیلہ سے تھے، جنھوں نے چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے اوائل میں عروج حاصل کیا، اور سندھ کے بعض علاقوں پر ایک زمانۂ دراز تک حکمرانی کرتے رہے، یہ ابتداً سلاطین ہباریہ کے ماتحت تھے آگے چل کر شیعی عقیدے قبول کئے، پھر ہباریہ سلطنت کو ان کے ہاتھوں زوال آیا لیکن منصورہ زیادہ دنوں تک ان کے قبضہ میں نہ رہ سکا، سنہ ۴۱۶ھ میں محمود غزنوی نے ان کے ہاتھوں سے اس کو چھین لیا۔

بایں ہمہ ان کی حکمرانی کا زمانہ پانچ سو پانچ برس تک جاری رہا (تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۴۳) ملتان بھی ان کے زیر اقتدار آگیا تھا، شہاب الدین غوری نے اس کو ان سے چھینا۔[2]

بنو سامہ | ملتان کی یہ حکومت سندھ کی مذکورۂ بالا حکومت کے حدود ہی سے کٹ کر قائم ہوئی تھی، اس کے حدود کی وسعت پچھم طرف مکران اور دکھن میں منصورہ کے حدود تک تھی، جس میں ایک لاکھ بیس گاؤں آباد تھے[3]، یہاں تیسری صدی ہجری کے آخر میں (سنہ ۲۹۰ھ / ۹۰۲ء) بنو سامہ نے اقتدار حاصل کیا، وہ مامون کے زمانہ سے معتصم (سنہ ۲۲۷ھ) کے دور تک سندھ کے شہر سندان کے حکمران تھے، اور وہی ملتان پر قابض ہوئے، سنہ ۳۰۰ھ / ۹۱۲ء میں یہاں کا حکمران

---

[1] عجائب الہند بزرگ بن شہریار ص ۳ سنہ ۲ھ مروج الذہب ج ۱ ص ۳۷۸، ۳۸۱، احسن التقاسیم ص ۴۷۹، ۴۸۱، بلاذری ص ۴۴۵، ۴۴۶، ابن اثیر ج ۹ ص ۲۴۳ ابن خلدون

[illegible]

ابو اللباب منبہ بن اسد قریشی تھا اس کی نسبت سے ان کو بنو منبہ بھی کہا جاتا ہے، سنہ ۳۷۵ھ میں اسماعیلیوں نے اس سلطنت کا خاتمہ کیا،

اسماعیلی قرامطہ | سندھ میں مصر کے فاطمی اسماعیلیوں کا پہلا داعی سنہ ۲۷۰ھ/۸۸۳ء میں آیا، اور مخفی طور پر یہ کام انجام دے کر جب یہاں زمین تیار ہوگئی، تو فاطمی خلیفہ عبد العزیز باللہ نے سنہ ۳۸۶ھ/۹۹۶ء میں جلم بن شیبان کی سرکردگی میں فوج بھیجی، جس نے اچانک حملہ کرکے سنہ ۳۶۶ھ/۹۷۶ء میں بنو سامہ کی حکومت ختم کرکے اپنی حکومت قائم کرلی،

اس اسماعیلی سلطنت کا رشتہ مصر کے فاطمی خاندان سے قائم ہوگیا، سنہ ۳۷۵ھ/۹۸۵ء میں شیخ حمید، سنہ ۳۹۰ھ/۹۹۹ء میں شیخ نصر، پھر اس کا لڑکا ابو الفتوح داؤد تخت نشین ہوا، داود سنہ ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں محمود کے خلاف بجے رائے کی مدد میں صف آرا ہوا، اس لیے محمود دوسرے سال سنہ ۳۹۶ھ/۱۰۰۵ء میں اس کی گوشمالی کے لیے آیا، اس نے اس کی اطاعت قبول کرلی مگر چند ہی سال بعد جب راجہ لاہور کی سرکردگی میں سنہ ۳۹۹ھ/۱۰۰۸ء میں محمود کا مقابلہ کیا گیا، تو ابو الفتوح داؤد نے پھر فوجی کمک کے ساتھ اس لڑائی میں محمود کے خلاف شرکت کی اس لیے محمود نے سنہ ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں ملتان پر حملہ کیا، ابو داؤد کو پکڑ کر غزنی لے گیا، اس کے بعد اسماعیلیوں نے منصورہ پر قبضہ کرلیا، جس کا خاتمہ محمود غزنوی نے سنہ ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں کیا، اور سندھ و ملتان دونوں کی حکومتیں غزنوی سلطنت کا حصہ بن گئیں، لیکن آگے چل کر غزنوی سلطنت میں کمزوری آنے کے بعد قرامطہ نے سندھ میں پھر سر اٹھایا، بالآخر شہاب الدین غوری نے ان کا خاتمہ کیا،

نظام حکومت اور تمدن و تہذیب

ہندستان میں سندھ و ملتان کی ان عربی حکومتوں کے مستقل اثرات یہاں قائم ہوئے، ان کا طرز عمل خیبر کے دروں سے آنے والے مسلمانوں سے مختلف تھا، ——— (۱) پہلا مستقل نظام

بانی جلم بن شیبان نے ملتان کے قدیم مندر کو ڈھا کر جامع مسجد بنا لیا، اور محمد بن قاسم کی جامع مسجد کو بند کر دیا، لیکن رفتہ رفتہ آس پاس کے ہندو راجاؤ سے ان کا ربط و ضبط بھی قائم ہو گیا، جو اتنا آگے بڑھا، کہ جب محمود غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا تو راجہ جے پال کی مدد کے لیے جو فوجیں آئیں ان میں جلم کے جانشین داؤد کی فوجیں بھی تھیں،

اس دور میں نامور علماء و محدثین بھی پیدا ہوئے، صنعت، و حرفت، تجارت زراعت، میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے، مقدسی و ادریسی کے بقول وہ نہایت شائستہ شہری تھے، ہندو مسلمانوں کے میل جول سے اسی زمانہ میں "ہندی اسلامی تمدن" کی آمیزش سے ایک نیا تمدن اور "سندھی عربی" کے ملنے سے ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑی جو آگے چل کر ہندوستانی تمدن اور ہندوستانی زبان سے موسوم ہوئی، اصطخری (سنہ ۳۴۰ھ) نے لکھا ہے کہ ملتان کا امیر ہاتھی پر سوار ہو کر جمعہ کی نماز کے لیے جامع مسجد جاتا ہے، یہ ہندو راجاؤں کے پرشان شکوہ جلوس کی ایک نقل تھی، پھر کہتا ہے کہ ملتان کے لوگ پاجامہ پہنتے ہیں، اور اکثر لوگ فارسی اور سندھی بھی بولتے ہیں، اس طرح ہندو مسلمانوں میں زبان اور لباس کی یکسانی پیدا ہونے لگی تھی، ابن حوقل (سنہ ۳۶۷ھ) یہاں کے طرز زبان اور لباس کے متعلق لکھتا ہے۔

> "یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کا لباس ایک ہی طرح کا ہے، اور بالوں کے چھوڑنے کا بھی وہی ایک طریقہ ہے، اور اسی طرح ملتان والوں کی وضع ہے۔۔۔۔ عربی و سندھی بولی جاتی ہے۔۔۔۔ کرتوں کا لباس نمایاں ہے مگر تاجر قمیص اور چادر استعمال کرتے ہیں"

بشاری سنہ ۳۷۵ھ میں آیا تھا، اس نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہاں کے اخلاق و معاشیات کا اندازہ ہوتا ہے، لکھتا ہے:-

> "۔۔۔ گچ کی منزل کے مکانات ہیں۔ یہاں بدکاری اور شراب خواری

نہیں .... سرسبزی اور دولت ہے۔ بیوپار کی حالت بھی اچھی ہے
تکلف و تنعم نمایاں ہے، حکومت منصفانہ ہے، بازار میں کوئی عورت
بناؤ سنگار کئے ہوئے نہیں ملے گی اور نہ کوئی اس سے علانیہ رستہ
میں بات کرتا ہے، زندگی عیش ومسرت اور خوش دلی اور مروت کی ہے
...... جسم میں تندرستی ہے، لیکن شہر گندا ہے، مکانات تنگ ہیں،
ہوا خشک اور گرم ہے، رنگ گندم گوں اور سیاہ ہے[۱]"

اہل علم و اعیان سندھ اور ملتان کی ان حکومتوں کے دور میں ممتاز اہل علم پیدا ہوئے، جنھوں نے مختلف علوم حدیث، تفسیر، فقہ، نحو ادب اور شعر وشاعری میں تبحر حاصل کیا اور ہندوستان کے اس بالائی حصہ میں علم کی روشنی پھیلائی، یہ دور عالم اسلام میں علم حدیث کی اشاعت و فروغ کا تھا اس لیے ہندوستان میں بھی ممتاز محدثین پیدا ہوئے اور اپنے علم کے سرچشموں سے ہندوستان کو سیراب کیا اور ہندوستان کے مختلف علمی مرکزوں کی روایتیں ہندوستان میں لائے اور ہندوستان سے روایتوں کو عالم اسلام میں لے گئے۔

چنانچہ اس دور کے محدثین میں سے شیخ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن عبداللہ دیبلی سندھی کا تذکرہ سمعانی نے کتاب الانساب میں اور یاقوت حموی نے معجم البلدان میں کیا ہے۔ ان کے شیوخ حدیث میں موسیٰ بن ہارون اور محمد بن علی صائغ وغیرہ تھے شیخ علی بن موسیٰ دیبلی ممتاز محدثین میں سے تھے۔ ان کے ارشد تلامذہ میں شیخ خلف بن محمد موازینی دیبلی تھے شیخ خلف بن محمد موصوف نے بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں اپنے شیخ کی روایتیں بیان کرتے تھے، شیخ ابوالحسن احمد بن محمد بن عمران ابن جندی ان کے تلامذہ

---

[۱] ابن حوقل ص ۲۳۲، احسن التقاسیم مقدسی ص ۴۸۰ عرب و ہند کے تعلقات -
پانچواں باب، تاریخ ہند ہاشمی ج اٹھارواں باب

ہیں تھے، سمعانی نے کتاب الانساب میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

شیخ ابوالقاسم شعیب بن محمد معروف بہ ابن ابی قطعان دیبلی چوتھی صدی کے محدثین میں سے تھے، مصر میں وارد ہوئے، وہاں کے محدثین نے ان کی روایتیں لیں، شیخ ابوسعید بن یونس ان کے تلامذہ میں سے تھے، سمعانی نے تذکرہ کیا ہے۔

اس زمانے میں ہندستان میں علم حدیث کا ایسا چرچا پھیلا کہ سرباتک ہندی کے افسانے نے شہرت حاصل کی، عرب مورخین نے سرباتک کو قنوج کا حکمران لکھا ہے شیخ سرباتک کا دعویٰ تھا کہ وہ عہد رسالت میں موجود تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حذیفہ و حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کو ان کے پاس اسلام کی دعوت لے کر بھیجا اور انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس روایت کی عالم اسلامی میں شہرت ہوئی اور فن رجال کی کتابوں میں ان کا ذکر آیا، چنانچہ علامہ ابن اثیر نے اسد الغابہ میں حافظ نے اصابہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، شیخ اسحٰق بن ابراہیم طوسی ہندستان آئے، اور سرباتک ہندی سے مل کر صورت حال کی تحقیق کی سرباتک نے ان سے اپنی عمر ۷۲۵ سال بیان کی، حضرت حذیفہ و اسامہ کے پاس آنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوت نامہ پر اسلام قبول کرنے کا تذکرہ کیا، اسی طرح شیخ ابوحاتم بلوی نے بہ سلسلہ روایت ابوسعید مظفر بن اسد حنفی کی یہ روایت نقل کی ہے کہ سرباتک نے ان سے بیان کیا، کہ وہ دو مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل چکے ہیں، ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ منورہ میں، علامہ ذہبی نے تجرید میں ان پر جرح کی ہے، سرباتک نے ۳۳۳ھ میں وفات پائی۔

شیخ ابوجعفر محمد بن ابراہیم دیبلی مکہ معظمہ میں سکونت پذیر تھے، یاقوت حموی اور سمعانی نے ان کا تذکرہ کیا ہے، انھوں نے ابن عیینہ کی کتاب التفسیر شیخ عبداللہ سعید بن عبدالرحمٰن مخزومی سے روایت کی، اسی طرح ابن مبارک کی مشہور کتاب البر والصلہ ابو عبداللہ حسین بن حسن مروزی سے روایت کی ہے؛ ان کے تلامذہ میں عبدالحمید بن صبیح ابوالحسن احمد بن ابراہیم بن فراس مکی) اور ابوبکر محمد بن ابراہیم بن علی بن مقری وغیرہ تھے

ابو محمد عبد اللہ بن جعفر منصوری کو علوم قرآن میں مہارت حاصل تھی۔ مقری کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے حسن بن مکرم وغیرہ سے حدیثیں سنیں، حاکم نے ان کی روایتیں مستدرک میں لی ہیں۔

زہاد | اس عہد کے مشائخ طریقت میں جن کی دستاروں میں علم حدیث و دیگر علوم دین میں مہارت کا بھی طغرائے امتیاز موجود تھا، شیخ ابو العباس احمد بن عبد اللہ دیبلی کا اسم گرامی سرفہرست آسکتا ہے۔ انھوں نے نشو و نما و ابتدائی تعلیم کے بعد عالم اسلام کے علمی مرکزوں کا سفر کیا، اور وہاں کے ممتاز اساتذہ و شیوخ وقت سے حدیث کی روایتیں لیں، چنانچہ ان کے شیوخ حدیث میں قاضی ابو خلیفہ بصرہ، جعفر بن محمد فریابی بغداد، مفضل بن محمد جندی و محمد بن ابراہیم دیبلی مقیم مکہ، علی بن عبد الرحمن و محمد بن زبان مقیم مصر، ابو الحسن احمد بن عمیر دمشق، ابو عبد الرحمن مکحول بیروت ابو عروبہ حسین بن ابو معشر حران، احمد بن زہیر، تستر، مکرم عبدان بن احمد حافظ عسکر اور ابو بکر محمد بن اسحق بن خزیمہ نیشا پور وغیرہ تھے، اور تلامذہ کی صف میں امام حافظ ابو عبد اللہ حاکم صاحب المستدرک کا جلیل القدر اسم گرامی بھی ہے، نیشاپور میں قیام اختیار کیا، یہیں خانقاہ میں مقیم رہ کر رشد و ہدایت اور علم و فن کی خدمت انجام دیتے رہے، لباس صوف اختیار کر لیا تھا، کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرتے تھے، نیشاپور ہی میں ۳۴۳ھ میں وفات پائی، اور مقبرہ الحیرہ میں دفن کئے گئے سمعانی نے اپنی کتاب الانساب میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

اسی طرح اس عہد کے زہاد و صالحین میں شیخ ابو العباس محمد بن محمد عبد اللہ وراق دیبلی کا اسم گرامی ہے، ان کے شیوخ حدیث میں ابو خلیفہ فضل بن حباب جمحی، جعفر بن محمد فریابی، عبدان بن احمد عسکری، محمد بن عثمان بن ابی سوید بصری، وغیرہ ہیں۔ اور تلامذہ میں شیخ حافظ ابو عبد اللہ حاکم، صاحب المستدرک کا اسم گرامی ہے اس عہد میں زہد و ورع سے متصف تھے اور "زاہد" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے جو اس زمانہ میں صوفیہ کے لیے استعمال ہوتا تھا، ۳۵۴ھ میں وصال فرمایا، شیخ

ابو عمرو بن نجید نے نماز جنازہ پڑھائی۔[۱]

شعراء ہارون بن عبد اللہ ملتانی بنو ازد کے موالی میں سے تھے، شعر و شاعری کا ذوق تھا، ابو دلف نے اپنے سفرنامہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔[۲]

ابو ضلع سندھی ایک ممتاز ہندوستانی شاعر ہے۔ عربی زبان میں ہندوستان کی تعریف میں غالباً سب سے پہلی نظم اسی کے قلم سے نکلی جس میں اس نے ہندوستان کی خوبیاں بیان کی ہیں اور اس کی پیداواروں کی ستائش کی ہے، کہتا ہے:

"میرے دوستوں نے انکار کیا اور یہ بہتر نہیں جب ہندوستان کی اور ہندوستان کے نیزے کی معرکہ میں تعریف کی جا رہی تھی۔"

"میری جان کی قسم یہ وہ سرزمین ہے کہ جب اس میں پانی برستا ہے تو وہ ایسے موتی اور یاقوت اس سے اگتے ہیں اُن کے لیے جو آرائش سے خالی ہیں۔"

"اسی کی خاص چیزوں میں مشک، کافور، عنبر، عود اور قسم قسم کی خوشبو ان کے لیے جو میلے ہوں،"

"اور قسم قسم کے عطریات اور جائے پھل اور سنبل اور ہاتھی دانت اور ساگون کی لکڑی اور خوشبودار لکڑی اور صندل ل۔"

"اور اس میں توتیا سب سے بڑے پہاڑ کی طرح ہے۔ اور یہاں شیر ببر اور چیتے اور ہاتھی اور ہاتھی کے بچے ہوتے ہیں۔"

"اور یہاں پرندوں میں کلنگ، اور طوطے اور مور اور کبوتر ہیں اور درختوں میں یہاں ناریل اور آبنوس اور سیاہ مرچ کے درخت ہیں۔"

"اور ہتھیاروں میں تلواریں ہیں جن کو کبھی صیقل کی حاجت نہیں، اور ایسے نیزے ہیں کہ جب وہ ہلیں تو فوج کی فوج ان سے ہل جائے۔"

"تو کیا بیوقوف کے سوا کوئی اور بھی ہندوستان کی ان خوبیوں کا انکار کر سکتا ہے۔"[۳]

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۴۲ (ابو ابراہیم دیبلی) ص ۶۵ (خلف بلی) ص ۶۷ (شعیب) ص ۶۶ (سرباتک) ص ۷۰ (ابو جعفر) ص ۶۷ (مقری) ۶۳ (ابو العباس احمد) ص ۷۰ (ابو العباس محمد) [۲] سیر البلاد والاقلیم ج ۲ و تاریخ سندھ ص ۲۵۷ [۳] آثار البلاد قزوینی ص ۸۵ و عرب و ہند کے تعلقات ص ۹۴ تا ۹۶

غزنوی سلاطین ہند

۳۲۲ھ — ۵۸۲ھ
۹۳۴ء — ۱۱۸۶ء

ہندستان اور درۂ خیبر کے پار ملکوں کے درمیان ہمیشہ سے صلح و جنگ کے تعلقات قائم رہے۔ اسلام کے پہلے بھی جب کبھی کابل کے حکمران کو موقع ملا، اس نے پشاور تک قبضہ کر لیا، اور جب رائے لہارو (لاہور) کو موقع ملا، کابل و قندہار تک قبضہ جما لیا۔ جب ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی فتوحات کا دائرہ بڑھا، اور مختلف نئی قوموں اور نسلوں نے اسلام قبول کر لیا، اور مرکزی سلطنت بغداد میں کمزوری آ گئی تو ماوراء النہر میں بخارا دارالسلطنت بنا، اور صفاریہ اور سامانیہ حکومتوں نے کابل و قندہار تک قدم بڑھائے، امیر الپتگین ایک ترک افسر بخارا سے نکل کر غزنین چلا آیا، اور یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ یہ شہر کابل سے پچھتر میل جنوب میں کوہستان بابا کی شاخ گل کوہ پر واقع ہے۔

سبکتگین سبکتگین (۳۶۶ھ — ۳۸۷ھ، ۹۷۶ء — ۹۹۷ء) جو الپتگین کا داماد تھا، اس کی وفات کے بعد اس نئی سلطنت کا امیر بنا، پنجاب کے راجہ جے پال اور امیر سبکتگین میں وہی پرانی سرحدی نزاع تازہ ہوئی کہ پشاور سے جلال آباد تک کا علاقہ جو لمغان کہا جاتا ہے، پنجاب و غزنین کی حکومتوں میں سے کس حکومت کے زیر اثر رہے۔

راجہ جے پال کا جارحانہ حملہ اور مغربی درہ سے ہندستان غزنین کی پہلی لڑائی

آخر پنجاب کے راجہ جے پال نے اس نزاع کا فیصلہ کرنے کے لیے سلطنت غزنین کا قصہ پاک کرنے کے لیے ایک طوفانی لشکر لے کر ہاتھیوں پر سوار چلا اور وادی لمغان میں اتر گیا، ادھر سبکتگین بھی اور اس کا نوعمر لڑکا محمود تازہ دم ترکوں کے ساتھ میدان میں آیا۔ دونوں داد شجاعت دے رہے تھے، کہ اچانک برق و باران کا طوفان امنڈ آیا اور راجہ جے پال کا منصوبہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا۔ آخر کار صلح کی بات چیت شروع ہوئی، اور

راجہ جے پال دس لاکھ درم اور پچاس ہاتھی دینے پر آمادہ ہوگیا، یہ تھی وہ پہلی لڑائی جس نے ہند کی قسمت کا فیصلہ سیکڑوں برس تک کے لیے کردیا تھا

راجہ جے پال کی وعدہ خلافی اور سبکتگین کا حملہ ہندوستان

اس کے بعد راجہ جے پال نے واپس آکر رقم ادا کرنے کے بجائے ان سفیروں کو جو رقم ساتھ لے جانے کے لیے آئے تھے، گرفتار کرکے جیل خانہ میں بند کردیا، سبکتگین یہ سنتے ہی بجلی کے مانند تیزی سے ہندوستان کی سمت چل کھڑا ہوا، ادھر راجہ جے پال نے دہلی، قنوج اور کالنجر کی فوجی مدد لی، اور مقابلہ کے لیے نکل پڑا، درہ خیبر اور پشاور کے درمیان لڑائی ہوئی، ہندی فوجوں نے شکست کھائی اور پشاور تک اٹک پار کے ملک پر غزنی سلطنت کا قبضہ ہوگیا

غزنی کو دہلی کالنجر اور قنوج تک ترکتازی کا حق

اب غزنیں کے نومسلم ترکوں کے لیے ہندستان کا راستہ کھل گیا تھا، اور دہلی، کالنجر اور قنوج تک انھیں اپنی ترکتازیوں کا حق تھا، کہ یہ ممالک دشمن کے ساتھ صف آرا ہوکر ان پر حملہ آور ہوچکے تھے۔

محمود

محمود (۳۸۷ھ / ۹۹۷ء تا ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) اپنے باپ سبکتگین کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا، اس کو نوزائیدہ سلطنت غزنین کو وسعت و استحکام دینا تھا وہ اپنی ۳۳ سال کی حکمرانی میں اسی خدمت کو انجام دیتا رہا،

محمود کی ترکتازیاں

اس نے اپنے چاروں طرف کی سلطنتوں کو چاہے وہ مسلمانوں کی ہوں، یا نامسلمانوں کی ہلا ڈالا اور اپنی حکومت کے حدود آگے بڑھاتا گیا، اس نے غزنی کی ایک طرف کاشغر کی اسلامی ایلخانی حکومت کو، دوسری طرف خود اپنے آقا سامانیوں کی سلطنت، تیسری طرف دیلمیوں اور طبرستان کی حکومت آل زیاد کو، مشرق کی سمت میں غوریوں کی سرزمین کو جن میں سے کچھ مسلمان ہوچکے تھے اور کچھ اپنے پرانے دین پر قائم تھے، پھر اسی مشرقی سمت میں ملتان اور سندھ کی عرب حکومتوں کو اور ادھر لاہور اور ہندستان کے بعض دوسرے راجاؤں

کی سلطنتوں کے کھنڈر پر اپنی غزنی کی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی یہ تھیں اس بدنام "بت شکن" کی ترک تازیاں جس نے بجز ہندستان کے ساری اسلامی سلطنتوں کا قلع قمع کیا تھا، اس سے اندازہ ہو گا کہ غزنی کے سلاطین کی یہ لڑائیاں ہندستان سے کسی مذہبی جذبہ کے ماتحت تھیں، یا محض جغرافی ماحول اور نئی حکومتوں کے شکست و تعمیر کے زیر اثر پیش آئیں۔

محمود کے حملے ہندستان پر محمود کو دوسری سمت کی مخالف حکومتوں سے جب فرصت ملتی، ہندستان پر چڑھ آتا، وہ اپنے دور میں سب سے پہلے ۳۹۰ھ/۱۰۰۰ء میں ہندستان میں داخل ہوا، جنوبی ہند کے جاٹوں کی سرکوبی کی اور چند سرحدی ضلعوں پر قبضہ کیا، دوسرے سال پھر آیا۔ پشاور کے آگے خیمہ زن ہوا، زور کا رن پڑا، راجہ جے پال نے شکست کھائی، اور گرفتار کر لیا گیا، محمود نے بڑھ کر دوسرے شہر دہیند پر قبضہ کر لیا۔ جے پال نے خراج دے کر رہائی حاصل کی، اور سلطنت انند پال کے سپرد کر کے چتا میں بیٹھ کر جل مرا، ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں بجی رائے والی بھیرہ سے جنگ آزمائی کی اس نے بھی فرار کی حالت میں خودکشی کر لی، اور بھیرہ اور اس کے مضافات سلطنت غزنی میں ملا لیے گئے، اسی طرح جیسا کہ گزرا ملتان کے والی ابو الفتوح نے بجی رائے کی مدد کی ناکام کوشش کی تھی، ۳۹۶ھ/۱۰۰۵ء میں محمود اس کو سزا دینے آیا، رائے انند پال ابو الفتوح کی مدد کے لیے آیا مگر ناکام ہو کر فرار ہوا، ابو الفتوح نے محمود کی اطاعت قبول کی، محمود نے انند پال کے بیٹے سکھ پال کو بھیرہ کا گورنر بنا دیا تھا، وہ اسلام لے آیا تھا، پھر وہ منحرف ہو گیا، محمود ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء میں اس کی سرکوبی کے لیے آیا۔ اور حبس دوام کی سزا دی۔

پھر ۳۹۹ھ/۱۰۰۸ء میں معرکہ آرائی ہوئی، اس مرتبہ انند پال کی مدد پر اجین، گوالیار کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر کے راجہ اور ملتان کے والی داؤد فوجیں لے کر آئے حب الوطنی کا عام جذبہ پیدا ہوا، اور عورتوں نے اپنے زیور بیچ بیچ کر چرخے کات کر اور محنت مزدوری کر کے لڑائی میں [illegible]

ہندستانی راجاؤں کی پچھلی تخاتہ جنگیوں کا غبار دل سے دور نہیں ہوا تھا، وہ کسی ایک کی کمان میں فوجوں کو نہ دے سکے، محمود نے راج پوتوں کے اس ٹڈی دل فوج کا مقابلہ کیا، ہندستانیوں کے قدم اکھڑ گئے، محمود کے خلاف یہ آخری مشترکہ قومی مظاہرہ تھا جس میں نہ صرف ہندو بلکہ ہندستان میں عربوں کی واحد حکومت کا حکمران بھی شریک تھا مگر ہندستان کو شکست ہوئی اس کے بعد رایان ہند یکے بعد دیگرے مغلوب ہوتے گئے اور بیش بہا خزانے خصوصاً مندروں کے جواہرات فاتح کے ہاتھ آتے گئے۔

اس حملہ میں محمود نے نگر کوٹ (کانگڑہ) کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سنہ ۴۰۱ھ (۱۰۱۰ء) میں وہ ابوالفتوح داؤد کا خاتمہ کر کے ملتان آیا۔ اور اس کو گرفتار کر کے ساتھ لے گیا اس کے بعد اس نے سنہ ۴۰۴ھ (۱۰۱۴ء) میں راجہ بھیم پال سے قلعہ نندونا لیا، سنہ ۴۰۵ھ (۱۰۱۴ء) میں تھانیسر پر قبضہ کیا، پھر سنہ ۴۰۶ھ (۱۰۱۵ء) میں کشمیر کی ناکام مہم پیش آئی، اس کے بعد سنہ ۴۰۹ھ (۱۰۱۷ء) میں قنوج اور متھرا پر قبضہ کیا، پھر سنہ ۴۱۲ھ (۱۰۲۰ء) میں کشمیر پر دوبارہ حملہ آور ہوا، سنہ ۴۱۳ھ (۱۰۲۱ء) میں وہ پورے پنجاب کو غزنین کا صوبہ بنانے کی نیت سے انتظامات کے ساتھ آیا اور پنجاب کا الحاق غزنی سے کر لیا، انند پال کے لڑکے تر لوکن پال کا انتقال ہو چکا تھا راجہ بھیم اس کا جانشین تھا، وہ پنجاب کو چھوڑ کر رائے اجمیر کے پاس چلا گیا۔ جہاں سنہ ۴۱۷ھ (۱۰۲۶ء) میں اس نے وفات پائی، محمود نے لاہور کا پہلا حاکم ایاز کو بنایا۔

اس کے بعد سنہ ۴۱۴ھ (۱۰۲۲ء) میں گوالیار اور کالنجر کو قبضہ میں لیا، پھر سنہ ۴۱۶ھ (۱۰۲۵ء) میں سومنات کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ اور اس مہم میں گجرات کی فتح کی تکمیل سنہ ۴۱۶ھ (۱۰۲۶ء) میں کی، پھر اسی سال سنہ ۴۱۶ھ (۱۰۲۶ء) میں ملتان کے قزاقوں کی سرکوبی کی، اور سنہ ۴۱۹ھ (۱۰۲۷ء) میں جاٹوں کی چھیڑ چھاڑ کا بدلہ لینے کے لیے آیا، اور کامیاب رہا، اس طرح محمود کے براہ راست قبضہ میں پنجاب، سندھ اور ملتان کے صوبے آئے، اور کشمیر، قنوج کالنجر، گوالیار، اور گجرات اس کے باج گزار بنے،

مندروں پر حملہ آوری کا حقیقی سبب۔ محمود نے ہندستان کے ان حملوں میں

بے شمار دولت حاصل کی، یہاں کے مندروں میں پشت ہا پشت کے چڑھائے ہوئے زر و جواہر کا انبار لگا تھا، اس نے اپنے ان حملوں میں مندروں کو خاص طور پہ نشانہ بنایا، تاکہ صدیوں کی جمع کی ہوئی دولت اس کے ہاتھ آ سکے، سومناتھ میں دو سو من وزنی سونے کی زنجیر لٹکتی تھی، جس میں گھنٹیاں آویزاں تھیں جس حجرے میں بت تھا اس کی قندیلوں کو روشن کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ روشنی کے لیے اس میں جواہر و الماس جڑے ہوئے تھے، جن کی جگمگاہٹ سے ہمہ دم روشنی رہتی تھی، محمود کے یہ حملے، بت شکنی کے لیے نہیں، حصول زر کے لیے تھے اور اس مقصد میں وہ اپنی توقعات سے زیادہ کامیاب

صوبہ پنجاب کا نیا نظم | بہرحال محمود نے پنجاب کو سلطنت غزنین کا ایک صوبہ قرار دیا، اس نے اس صوبہ کے مرکز سے دور دراز ہونے کی وجہ سے یہاں ایک نیا نظم قائم کیا۔ ایاز کے بعد فوجی اور انتظامی اختیارات علیحدہ علیحدہ حکام کے سپرد کئے، انتظامی امور ابوالحسن علی المعروف بہ قاضی شیرازی کے سپرد کئے اور سپہ سالاری کے عہدہ پہ علی اری یارک کو مامور کیا، لیکن گورنر اور سپہ سالار دونوں کا ایک دوسرے سے سروکار نہ رکھا، یہ دونوں براہ راست غزنین کے ماتحت تھے، اور پرچہ نویسی پر ابوالحکم نام کے ایک افسر کو مقرر کیا۔

محمود کو ہندستان سے ایک رابطہ | اگرچہ محمود نے ہندستان کو اپنا وطن نہیں سمجھا۔ اس کو غزنین پیارا تھا، اور اسی کو اس نے آباد کیا، تاہم ہندستان سے اس کو ایک رابطہ پیدا ہو چکا تھا، ہندستان کے جنگی ہاتھیوں پر اس کو ایسا ناز تھا، کہ وہ خلیفہ بغداد کو بھی اسی اعتماد پر دھمکی دینے سے باز نہ آیا۔ اور الفیل ما الفیل کا عبرت آموز جواب پایا۔

محمود کی رواداری | اس نے اپنی ساری عمر میں کبھی کسی ایک ہندو کو بھی جبر سے مسلمان نہیں بنایا، اور نہ امن کی حالت میں کسی ایک مندر کو توڑنے اور "بت شکنی" کرنے کا کوئی واقعہ پیش آیا، اس نے ہندستانی مقبوضات کے لیے اپنا سکہ ہندی زبان میں جاری کیا، اور اپنی فوج میں ہندوؤں کو معزز عہدوں پہ بھی سرفراز کیا،

سوبندرائے اس کی فوج میں اعلیٰ کمان دار تھا، ہندستانیوں کا ایک بڑا لشکر اس کے ماتحت تھا۔

سلطان محمد | سلطان محمد (۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) محمود کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھا، اس کے بھائی مسعود نے جب اس پر فوج کشی کی تو اس نے اسی ہندستانی سپہ سالار سوبندرائے کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ مگر وہ اس جنگ میں کام آیا، تاہم معلوم ہوا کہ اس لشکر کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ وہ تاج و تخت کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ سوبندرائے کے مارے جانے کے بعد سلطان محمد خود فوج لے کر گیا اور میدان جنگ میں گرفتار کر لیا گیا۔

سلطان مسعود | سلطان مسعود (۴۲۱ھ - ۴۳۲ھ / ۱۰۳۰ء - ۱۰۴۱ء) کو ہندستان کے نظم حکومت میں محمود کے قائم کئے ہوئے دو عملی نظام سے سابقہ پڑا، یہ دو عملی نظام پنجاب میں نہ چل سکا، قاضی شیرازی اور علی اریارک میں اختلاف پیدا ہوا، وزیر غزنی نے یارک کو شیریں گفتاری سے پایۂ تخت بلوایا اور ۴۲۳ھ / ۱۰۳۱ء میں بلخ میں اس کو قید کر دیا، پھر پنجاب کی سپہ سالاری پر احمد نیالتگین بھیجا گیا۔ اس کے بعد سلطان مسعود نے ۴۲۴ھ / ۱۰۳۲ء میں کشمیر کے قریب قلعہ سرستی پر فوج کشی کی اور اس کو فتح کر لیا۔

احمد نیالتگین | مسعود کے واپس جاتے ہی لاہور میں انتظامی و فوجی حکام کی جنگ پھر شروع ہو گئی مگر وزیر اعظم غزنی نے اس مرتبہ نیالتگین کی حمایت کی اس نے قاضی شیرازی سے بے پروا ہو کر ہندستان پر فوجی حملہ کر دیا اور سرعت سے بڑھتا ہوا بنارس تک پہنچ گیا اور اس شہر کو بھی لوٹا۔ قاضی شیرازی نے غزنین اطلاع دی، کہ نیالتگین نے بے شمار دولت حاصل کی ہے، خود مختاری کی طرف مائل ہے، اپنے کو محمود کا بیٹا کہتا ہے، نیالتگین نے واپس آ کر قاضی کو قلعہ میں قید کر دیا، گویا اس طرح دربار غزنین میں قاضی شیرازی کی بھیجی ہوئی خبر کی تصدیق ہو گئی۔

سپہ سالار ناتھ | سلطان مسعود نے ۴۲۵ھ / ۱۰۳۴ء میں احمد نیالتگین کی سرکوبی کے لیے ایک ہندو سپہ سالار ناتھ کو بھیجا مگر وہ ناکام رہا، اس

کے بعد اس کی سرکوبی کے لیے ایک دوسری فوج بھیجنی چاہی، مگر مہم کی دشواریوں کو دیکھ کر کوئی آمادہ نہیں ہوا، اور آخر ایک دوسرا ہندو سپہ سالار تلک آگے بڑھا اس نے اس مہم کو انجام دینے کا بیڑا اٹھالیا۔

سالار تلک سالار تلک سوہند رائے کی جگہ غزنی کی ہندو فوج کا سپہ سالار تھا، اور اس کے اعزاز میں ہندو سرداروں کے دستور کے مطابق اس کے مکان پر نوبت بجتی تھی اور غزنین کے سپہ سالار کی طرح اس کو بھی علم، خیمہ اور چتر عطا ہوا تھا۔ تلک لاہور آیا تو نیا لتگین فرار ہو چکا تھا اس نے اس کی سرکی قیمت پانچ لاکھ درہم مقرر کی، پھر چن چن کر اس کے سپاہیوں کو اس وقت تک مارا جب تک انھوں نے نیا لتگین کا ساتھ چھوڑنے کا وعدہ نہیں کر لیا، پھر جاٹوں نے بحر سندھ عبور کرتے ہوئے نیا لتگین کو بھی پکڑ لیا اور اس طرح اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح گویا غزنوی سلطنت کے استحکام میں ہندوؤں اور جاٹوں نے رضا کارانہ حصہ نہیں لیا۔

ہندستان کا خزانہ ہندستان کو واپس اس کے بعد سلطان مسعود نے ۴۲۹ھ / ۱۰۳۷ء میں ہندستان کا رخ کیا اور قلعہ ہانسی اور سونپت پر قبضہ کیا، اور اپنے لڑکے مجدود کو پنجاب کا گورنر بنا کر غزنین واپس گیا اور ایاز کو اس کا اتالیق مقرر کیا، اسی زمانہ میں دوسری طرف سلجوقیوں کو عروج حاصل ہو رہا تھا، اور ان کا سیلاب بڑھتا ہوا غزنین تک آرہا تھا، مسعود نے اس ابھرنے والی نئی طاقت کا مقابلہ کیا، اور ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء میں مرو کے میدان میں اس کو فاش شکست ہوئی، مستقبل کا نقشہ اس کی نگاہ میں آیا، اس نے غزنین سے اپنے پایہ تخت کو پنجاب میں لے آنے کا فیصلہ کیا، تین سو اونٹوں پر زر و جواہر اور مال و دولت کا انبار لاد کر چلا۔ ہندوستان کی دولت ہندوستان میں واپس آرہی تھی، کہ اثنا ئے راہ میں اس کے ترک اور بیشتر ہندو سپاہیوں نے اس سے بے وفائی کی، خزانہ لوٹ لیا، سلطان کو حراست میں لے لیا، اور اس کے نابینا بھائی سابق سلطان محمد کو قید سے نکال کر تخت نشین کر دیا، اور چند دنوں کے بعد مسعود قتل کر دیا گیا،

غزنی و ہندستان کے امرا کی پالیسی میں اختلاف

سلطان مسعود کے قتل ہونے کے بعد اس کے بیٹے مودود نے غزنین میں تخت نشینی اختیار کی اور ۴۳۲ھ / ۱۰۴۱ء حملہ کر کے محمد کا خاتمہ کیا، ہندستان کے امرا مودود اور محمد کی کشمکش میں محمد کے طرفدار تھے، اس طرح پایۂ تخت غزنین اور ہندستان کے امرائے غزنین کی پالیسی میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

سلطان مودود

سلطان مودود (۴۳۲ھ / ۱۰۴۱ء – ۴۴۱ھ / ۱۰۴۹ء) اس کے باوجود ہندستان کے امرائے غزنین سے مرعوب نہیں ہوا اس نے ابونصر محمد بن احمد کو لاہور کا حاکم مقرر کیا اور خود ملتان سے لاہور آیا اور ہانسی اور تھانیسر تک کا دورہ کر کے واپس گیا، اس اثنا میں مغرب میں سلجوقیوں کا زور بڑھتا گیا اور مودود کو ادھر متوجہ ہونا پڑا۔ یہ دیکھ کر اس کے بھائی مجدود نے مودود سے ناراض ہو کر امرا کی مدد سے پنجاب پر قبضہ کر لیا، مودود نے ۴۳۵ھ / ۱۰۴۲ء میں پنجاب پر فوج کشی کی، مگر مجدود نے لاہور کو بچا لیا۔ لیکن اسی اثنا میں مجدود اپنے خیمہ میں مردہ پایا گیا، اس کا دست راست ایاز بھی مرگیا۔ اور مودود کے قبضہ میں پنجاب آگیا

ہندستان میں وطن اور دھرم کو بچانے کا نیا جذبہ

دوسری طرف غزنویوں کی خانہ جنگی اور سلجوقیوں سے ان کی معرکہ آرائی سے ہندستان کے راجپوتوں نے پورا فائدہ اٹھایا، ان میں وطن اور دھرم کو بچانے کا نیا جذبہ پیدا ہوا، جو لوگ ترکوں کے خوف سے جنگلوں میں پناہ گزین تھے۔ خود اعتمادی کے ساتھ نکل پڑے، تقدیر نے یاوری کی، راجہ دہلی کی سرکردگی میں ۴۳۵ھ / ۱۰۴۴ء ہی میں ہانسی اور تھانیسر پر قبضہ کر لیا۔

نگرکوٹ کی بازیافت اور ہندستان میں جذبۂ مسرت

محمود نے ہندوؤں کے مقدس مقامات میں سے جن کو فتح کیا تھا۔ ان میں سے صرف نگرکوٹ پر اپنا قبضہ رکھا تھا۔ انھوں نے اس کو بھی واگذار کر لیا، جس سے ہندوستان میں مسرت کی عام لہر دوڑ گئی۔ جاتری جوق جوق تیرتھ کے لئے آنے لگے، اب

راجپوتوں کے دل بڑھے ہوئے تھے؛ دہلی اور مضافات کے علاقے تو غزنویوں
کے ہاتھ سے نکل چکے تھے وہ لاہور کا فیصلہ کر لینے کے لیے آگے بڑھے، یہ دیکھ
کر غزنوی امرا میں بھی نئی حرارت آئی، اختلافات کو بھلا دینے کا عزم کر کے اٹھے
راجپوتوں کا لشکر بغیر لڑے واپس چلا گیا۔

مودود نے سنہ ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء میں اپنے لڑکے ابو القاسم محمود کو لاہور کا حاکم بنا کر بھیجا
اور ابو علی کو ہند کا سپہ سالار بنایا جس نے پشاور، کشمیر، اور ملتان کی بغاوتیں فرو
کیں، لیکن ہانسی، تھانیسر اور نگر کوٹ کے قلعے قبضہ میں نہ آ سکے۔

سلطان عبد الرشید | مودود کی وفات کے بعد علی بن ربیع ایک امیر نے
اس کے تین چار برس کے بچے مسعود ثانی کو تخت پر بٹھا دیا، مگر دوسرے امراء نے
مودود کے بھائی علی بن مسعود کی اطاعت کی، اور علی بن ربیع ایک جماعت کے
ساتھ ہندستان چلا آیا، اور پشاور سے سندھ تک کے علاقہ کو قبضہ میں لے
لیا، اسی اثنا میں سلطان مودود کے چھوٹے بیٹے عبد الرشید (سنہ ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء - سنہ ۴۴۴ھ/۱۰۵۲ء)
نے غزنی کے تخت پر قبضہ کر لیا، اس نے ربیع کو غزنی واپس بلایا اور اس کی جگہ نوشتگین
کرخی کو ہندستان اور سندھ کا والی بنا کر بھیجا۔

نوشتگین حاکم پنجاب | غزنوی حکمرانوں کی خانہ جنگی کے بعد نوشتگین گویا
ہندستان کا باضابطہ سرکاری حاکم تھا، اس کے ساتھ مستحکم فوج بھی آئی تھی اس نے
قلعہ نگر کوٹ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

سلطان فرخ زاد | اسی اثنا میں غزنی میں پھر انقلاب حکومت ہوا
جس کے بعد فرخ زاد بن مسعود (سنہ ۴۴۴ھ/۱۰۵۲ء - سنہ ۴۵۰ھ/۱۰۵۹ء) تخت نشین ہوا، اس نے
کسی کو ہندستان کا والی بنا کر نوشتگین کو اپنی وزارت کے منصب کے لئے طلب کر لیا۔

سلطان ابراہیم | اس کے بعد سلطان ابراہیم بن مسعود (سنہ ۴۵۰ھ/۱۰۵۹ء - سنہ ۴۹۲ھ/۱۰۹۸ء)
تخت نشین ہوا۔ اس نے چالیس برس حکمرانی کی، لیکن اپنے پورے دور حکومت میں
اس نے ہندستان پر صرف دو مرتبہ چڑھائی کی، آخری مرتبہ سنہ ۴۷۲ھ/۱۰۷۹ء میں آیا اور

اجودھن (پاک پٹن) پر قبضہ کیا پھر قلعہ روپر پر دھاوا کیا، اسی طرح روپال اور نیتی کال کو قبضہ میں لایا اور بڑھتا ہوا سہارن پور کے ضلع تک آیا اور کئی قلعوں پر قبضہ کرکے واپس گیا

سلطان مسعود بن ابراہیم | سلطان مسعود بن ابراہیم (۴۹۲ھ / ۱۰۹۸ء - ۵۰۸ھ / ۱۱۱۴ء) اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا، اس زمانہ میں ہندستان کا والی طغاتگین بنایا گیا

طغاتگین حاکم پنجاب | گنگا کو عبور کرکے مختلف مقاموں کو قبضہ میں لایا، اور کثیر دولت کے ساتھ لاہور واپس گیا۔

سلطان ارسلان | مسعود بن ابراہیم کی وفات کے بعد سلطان ارسلان (۵۰۸ھ / ۱۱۱۴ء - ۱۱۱۸ء) کا دور آیا۔ اس زمانہ میں غور و خوارزم میں دو نئی طاقتیں ابھر رہی تھیں۔ ایک نے سلجوقیوں کی جگہ لی اور دوسری نے غزنویوں کا خاتمہ کیا۔ ارسلان کے زمانہ میں سنجر سلجوقی نے غزنی پر قبضہ جما لیا، تو وہ ہندستان چلا آیا، اور یہاں سے ہندستانی لشکر فراہم کرکے غزنی پر چڑھائی کی اور اپنے پایہ تخت کو واپس لے لیا، لیکن سنجر نے واپس آکر پھر غزنی پر قبضہ جما لیا، ارسلان پہاڑوں میں چھپ رہا، جہاں سے پکڑ کر لایا گیا، اور قتل کیا گیا۔

محمد باہلیم والی پنجاب | اس زمانہ میں ہندستان کی ولایت کی زمام محمد باہلیم کے ہاتھ میں تھی، وہ اپنی دانشمندی سے پنجاب کو بچائے رہا، اور پایہ تخت غزنی کے انقلابات کے اثر سے یہ صوبہ محفوظ رہا۔

بہرام شاہ | اس کے بعد بہرام شاہ بن مسعود (۵۱۱ھ / ۱۱۱۸ء - ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء) سلطان سنجر کی بخشش کے طور پر جو بہرام کا ماموں بھی تھا، غزنی کے تخت پر بیٹھا، محمد باہلیم نے غالباً ارسلان کی ہمدردی میں ہندستان میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مگر بہرام نے غفلت نہ برتی، فوراً کوچ کرکے (۵۱۴ھ / ۱۱۲۰ء) میں ہندستان آیا، محمد باہلیم کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوا۔ مگر پھر خطا معاف کرکے ہندستان کی حکومت اسی کے سپرد کرکے واپس چلا گیا۔

قلعہ ناگور پر قبضہ | اس کے بعد محمد باہلیم نے قلعہ ناگور فتح کیا، اس کو مستحکم کرکے اپنا مامن بنایا، اور ایک عظیم الشان لشکر فراہم کر لیا اور مختلف راجاؤں سے معرکہ آرا رہا۔

محمد باہلیم کی بغاوت اور زوال | اس اثنا میں اس کو اپنی طاقت پر پھر اعتماد ہوگیا اور غزنی کی کمزور سلطنت کے ماتحت رہنا جو خود قوی دشمنوں کے نرغہ میں تھی، پسند نہیں کیا سلطان بہرام اس کو سزا دینے کے لیے پھر آیا، ملتان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ محمد باہلیم شکست کھا کر مارا گیا۔

حسین بن ابراہیم والی پنجاب | سلطان بہرام ہندستان میں حسین بن ابراہیم علوی کو حاکم بنا کر چلا گیا، جب غوریوں کا حملہ غزنی پر شروع ہوا تو بہرام مقابلہ کی طاقت نہ دیکھ کر ہندستان چلا آیا، پھر موقع پاکر واپس گیا، اور غزنی پر قبضہ کیا۔

غزنی کی بربادی | لیکن پھر ۵۴۴ھ/۱۱۵۱ء میں علاء الدین حاکم غور نے غزنی پر قبضہ کرلیا، اور شہر میں آگ لگادی، اسی سے "جہاں سوز" کا لقب پایا، سلطان بہرام غزنی کی بربادی کا صدمہ برداشت نہ کرسکا اور اسی غم میں ہندستان واپس آکر ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء میں اس دنیا سے چل بسا۔

خسرو شاہ | اس کے لڑکے خسرو شاہ (۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء - ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء) نے غزنی ہی میں اپنا تخت بچھانا چاہا مگر غوری آموجود ہوئے، اس لیے وہ نامراد ہندستان واپس آیا۔

غزنوی سلاطین کا مامن ہندستان | اب غزنویوں کا مامن یہی ہندستان تھا، جو بہت سی قوموں کو اپنے سینہ سے لگا چکا تھا اور ان کا پایۂ تخت غزنی کے بجائے لاہور تھا۔

ملک خسرو | خسرو شاہ نے ۵۵۵ھ میں لاہور میں وفات پائی ملک خسرو (۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء - ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء) میں اس کا جانشین ہوا۔ اور اس نے بیس برس امن و امان سے اپنے مقبوضات ہند پر حکمرانی کی۔

راجہ جموں کی دعوت شہاب الدین غوری کو | اس اثنا میں سلطان شہاب الدین غوری کا آفتاب اقبال طلوع ہو چکا تھا، غزنوی سلطنت لاہور کی سرحد مشرق میں سیالکوٹ تک تھی اور یہیں راجہ جموں کی سرحد آکر اس سے ملتی تھی، یہاں کے راجہ چکر دیو نے سلطان شہاب الدین کو پنجاب کا خاتمہ کرنے کی دعوت دی، [illegible]

کے حملے ہندستان پر شروع ہو گئے، اور پشاور، ملتان اور سندھ کو اس نے فتح کر لیا، پھر ۵۷٦ھ (۱۱۸۰ء) میں لاہور پر فوج کشی کی، خسرو ملک قلعہ بند ہو گیا اور شہاب الدین کو واپس جانا پڑا، ۵۸۱ھ (۱۱۸٦ء) میں وہ پھر ہندستان آیا، اور سیالکوٹ کے قلعہ کو فتح کر کے اس کو مستحکم کیا۔

آل سبکتگین کا زوال

اس کے بعد ۵۸۲ھ (۱۱۸٦ء) میں وہ پھر لاہور آیا اور خسرو ملک اور اس کے پورے خاندان کو گرفتار کر کے غزنی لے گیا۔ اور وہاں سے زابلستان کے قلعہ میں قید کر دیا جہاں اس نے ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں وفات پائی۔

غزنوی سلطنت کے خاتمہ میں ہندو و مسلم حکمرانوں کا اشتراک

اس طرح ہندو و مسلم دونوں حکمرانوں کی باہمی صلاح و اشتراک عمل سے ہندستان میں آل سبکتگین کی غزنوی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

غزنوی سلاطین کے دور میں ہندستان میں علوم وفنون کی ترقی

غزنوی سلاطین کی علم پروری شہرت عام رکھتی ہے، ہزاروں شعراء اس سلطنت کے دور میں دربار سے وابستہ رہے، اور فارسی و عربی ادب میں ان کے نقوش تازہ ہیں۔ غزنوی سلاطین میں بیشتر خود صاحب علم وفضل تھے، سلطان محمود کی فتح مندیوں اور کشورکشائیوں کے ساتھ اس کے علم وفضل کا شہرہ بھی کچھ کم نہیں، کہا جاتا ہے کہ شاعری پر اس نے شاہانہ توجہ کی، ایک مستقل محکمہ قائم کیا، ...... "اس کے خوان کرم سے چار سو شاعر بہرہ یاب تھے فردوسی، اسدطوسی، عجدی، عفاری، فرخی، حکیم سنائی، منوچہری، و امغانی وغیرہ میں سے ہر ایک اقلیم سخن کا تاجدار تھا" دوسری طرف جلیل القدر عربی گو شعراء اس کے دامن فیض سے وابستہ تھے مگر ان کے کلام کا عام جو ہر نگاہوں کے سامنے نہ آسکا۔ بلکہ غزنوی عہد کی تاریخ سے ان کے نام و نشان بھی رفتہ رفتہ محو ہو گئے مگر عرب تذکرہ نگاروں نے تتمۃ الیتیمہ، دمیۃ القصر اور شذرات الذہب وغیرہ میں ان کا تذکرہ محفوظ رکھا ہے، اگر محمود، صاحب تاج وتخت نہ ہوتا تو اس کا شمار پانچویں صدی کے ممتاز اہل علم میں ہوتا

سلہ یہ کتاب میں کچھ دن گزرے چھپ کر شائع ہوئی ہے، یا "غزنوی دربار کے چند عرب شعراء" کے عنوان سے ایک مقالہ راقم سطور نے لکھا۔

نے اپنی مخزن الاسرار اس کے لیے لکھی، کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ عربی سے فارسی میں اس کے لیے کیا گیا، اور ابو المجد مجدود بن آدم سنائی نے کتاب الحدیقہ تصنیف کی۔[1]

شعراء غزنوی سلاطین کی علم پروری سے ہزاروں شعراء اس سلطنت کے دور میں دربار سے وابستہ رہے اور فارسی و عربی ادب میں ان کے نقوش تازہ ہیں۔ پنجاب میں ان کے پچاس ساٹھ سال کی حکمرانی کے دور میں یہاں فارسی گو ہندوستانی شعراء بھی پیدا ہو گئے۔ چنانچہ عوفی نے اپنے تذکرہ میں ان کے لیے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ ان میں ابو الفرج بن مسعود (متوفی ۴۹۲ھ) رونی، اور مسعود سعد بن سلمان اور روزبہ بن عبد اللہ لاہوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

رونی کی شہرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انوری جیسا قصیدہ گو شاعر اس کا متبع تھا۔ رونی کا انتساب لاہور کے ایک قصبہ رون کی طرف تھا۔

مسعود بن سعد کو سلطان ابراہیم نے [illegible] میں ہندوستان بھیجا اور مستوفی الممالک کے عہدہ پر مامور کیا، اور وہ یہاں کے ممتاز امراء میں سے تھا۔

مسعود بن سعد بن سلمان اصلاً ایرانی نسل تھا، وہ لاہور ہی میں پیدا ہوا اور یہیں نشو و نما پائی، سلطان ابراہیم کے عہد میں شہرت و امتیاز حاصل کیا، علوم میں دستگاہ حاصل کرنے کے بعد فن شعر کی طرف متوجہ ہوا، حکومت کی طرف سے مختلف عہدوں پر مامور رہا۔ اور شعراء کی قدر دانی کرتا رہا، ۴۸۰ھ میں شاہی عتاب میں آ گیا، اور چند سال کے بعد جب معافی ملی تو ہندوستان آ گیا [illegible] اس کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کا پہلا شاعر ہے جس نے عربی، فارسی کے ساتھ ہندوی یا ہندوستانی زبان میں بھی شاعری کی، اور ان تینوں زبانوں میں مستقل دیوان اپنی یادگار چھوڑا۔ عبد القادر بدایونی کے زمانے تک یہ موجود تھا۔

ابو العلاء عطا بن یعقوب (متوفی [illegible]ھ) اس عہد کے ممتاز شعراء میں سے تھا، وہ بھی شاہی عتاب میں آ گیا تھا۔ وہ عربی [illegible] دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھا

---

[1] نزہۃ الخواطر ص ۱۰۲ (بہرام شاہ)

عربی و فارسی تذکروں میں عموماً اس کے حالات ملتے ہیں، نیز تصوف کا بھی ذوق تھا کشف المحجوب میں ذکر آیا ہے۔

علماء و محدثین قضاۃ

اسی طرح اس عہد میں ہندستان میں ممتاز علمائے اسلام اور مشائخ صوفیہ کے فیض و برکات کا سرچشمہ جاری ہوا چنانچہ شیخ ابو المنصور بن علی غزنوی کو جو ممتاز اہل علم میں سے تھا، سلطان مسعود غزنوی نے ۴۲۶ھ میں ہندستان بھیجا، لاہور میں قیام تھا یہاں دیوان الانشاء کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

ابو الریحان محمد بن احمد البیرونی جو علوم ہندسہ، ہیئت، نجوم، اور فلسفہ ہنود میں استاد فن مانا گیا، اسی عہد میں گذرا ہے، بیرون سندھ ہی کا ایک گاؤں تھا، جس سے منسوب کیا گیا۔ وہ شیخ بو علی سینا کے معاصرین میں سے تھا۔ اور ان دونوں میں مراسم قائم تھے، وہ سالہا سال ہندستان میں قیام پذیر رہا، اس کی تصنیفات کتاب الہند جو خاص ہندستان کے موضوع پر لکھی گئی۔ کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ وغیرہ شہرت عام رکھتی ہیں۔

شیخ ابو الحسن علی بن عمر لاہوری [illegible] فی ۵۲۹ھ اس عہد کے نامور محدث، ادیب اور شاعر تھے، شیخ [illegible] ان کے تلامذہ میں سے ابو سعد سمعانی صاحب کتاب الانساب کے شیخ حدیث تھے۔

اسی طرح شیخ ابو جعفر عمر بن [illegible] لاہوری اس عہد کے ممتاز عالم و شاعر تھے، عوفی نے [illegible] تذکرہ کیا ہے اور کلام کا نمونہ درج کیا ہے۔

شیخ [illegible] لاہوری [illegible] فی ۵۰۱ھ فقیہ و محدث تھے، حافظ ابو موسیٰ مدینی ان کے تلامذہ میں سے تھے۔

شیخ ابو القاسم محمود بن [illegible] لاہوری اس عہد کے ممتاز محدثین میں سے تھے فقہ میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ابو المظفر سمعانی سے حدیث و فقہ کی تحصیل کی، حموی نے معجم البلدان میں اور سمعانی نے کتاب الانساب میں تذکرہ کیا ہے، ۵۴۰ھ کے قریب وفات پائی۔

نواحی ملتان میں آسودۂ خواب ہوئے۔

شیخ جمال السنہ ثقۃ الدین یوسف بن محمد دربندی افاضل روزگار میں سے تھے خسرو ملک کے زمانے میں رتبۂ امارت پر سرفراز ہوئے، پھر تارک دنیا ہوئے اور لاہور میں اصلاح خلق کی خدمت میں مصروف ہو گئے، جوانی میں شعر و شاعری کا بھی مذاق تھا۔ لاہور ہی میں وفات پائی اور رحلت کے بعد ان کی قبر زیارت گاہ خلائق ہے، اور لوگ برکت حاصل کرتے ہیں۔

اسی طرح شیخ جمال الدین یوسف بن احمد کردیزی کا اس عہد کے اکابر فقہا میں سے تھے، عبادت و ریاضت کی طرف رجوع ہو گئے اور مرجع خلائق بنے، ۵۳۱ھ میں ملتان میں وفات پائی۔

ممتاز اعیان غزنوی عہد کے ان ممتاز اعیان میں جن کا تعلق ہندستان سے وابستہ ہو گیا، احمد بن نیالتگین متوفی ۴۲۵ھ تھا جس کا ذکر اوپر تفصیل سے گزر چکا۔ اسی طرح ارپاروق حاجب بھی محمود کا غلام تھا، اس کے زمانہ میں لاہور کا والی بنایا گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد المقتول ۴۳۲ھ لاہور کا حاکم تھا، محمود کا مشہور غلام ابوالنجم ایاز غزنوی کا تعلق بھی ہندستان سے وابستہ ہو گیا تھا۔ ان سے شیخ افضل الدین محمد کاشانی نے علوم کی تحصیل کی تھی۔ ایاز، محمود کے واقعات عام شہرت رکھتے ہیں وہ سلطان مسعود کے زمانہ میں محمود کے ساتھ ۴۲۳ھ میں ہندستان آیا۔ وہ محمود کا اتالیق تھا، محمود کا انتقال ہوا اور لاہور میں ۴۴۹ھ میں وفات پائی، نوشتگین حاجب کا ذکر اوپر گزرا جس کو سلطان عبدالرشید نے ہندستان میں مامور کیا تھا۔ طغانتگین مشہور غزنوی سپہ سالاروں میں سے تھا اس کا ذکر بھی اوپر گزر چکا۔ اسی طرح حاجب متوفی ۵۱۱ھ کا ذکر بھی گزر چکا ہے، حضرت سالار مسعود غازی المقتول ۴۲۴ھ جن پر ایک مستقل مضمون اس کتاب کے ایک حصہ میں چھپا اس عہد کے ممتاز اعیان و سالار فوج میں سے تھے۔

---

[۱] لباب الالباب ج ۲ ص ۲۶۲ باب ۱۰ ذکر شعرائے غزنہ و لاہور۔ [۲] منتخب التواریخ بدایونی ج ۱ ص ۲۴

حضرت سالار مسعود غازی رحمہ اللہ!

جناب حکیم محمد بہار الدین صاحب صدیقی (متصل مسجد دیانت گنج بہرائچ)
کا حسب ذیل استفسار آیا تھا اس کے جواب میں ایک تقریر شایع کی گئی، سوال و جواب
سے حضرت سالار مسعود غازی (معروف بہ غازی میاں) کے حالات روشنی میں آتے ہیں
وہ درج ذیل ہیں۔ موصوف دریافت فرماتے ہیں:۔

سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سالار ساہو
متوفی ۴۲۳ھ کے صاحبزادے اور ۴۰۵ھ میں بمقام اجمیر پیدا ہوئے تھے
بعد وفات سالار ساہو تقریباً ۹ ماہ بقید حیات رہے۔ اپنی تمام عمر میں ۳ بار کافروں
سے متحارب ہوئے۔ اسی سلسلہ میں بہرائچ پہنچے اور بتاریخ ۱۴ ماہ رجب ۴۲۴ھ
(تیسری جنگ) میں شہادت پائی۔ (مفتاح التواریخ ولیم بیل، ایڈیشن ۱۸۶۷ء نولکشور
پریس) ملخص۔

مرآۃ مسعودی سے بھی اسی بیان کی تائید ہوتی ہے، ممکن ہے مفتاح التواریخ
کا ماخذ مرآۃ مسعودی ہو، مگر بعض دوسرے مورخین نے بحوالہ ابوالفضل لکھا ہے کہ
"او خویش وند سلطان محمود غزنوی است"، اور بحوالہ تاریخ فرشتہ تحریر کیا ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲) خزانہ عامرہ ص ۱۴، ۱۵ (۱۰) عرب و ہند کے تعلقات ذکر محمود غزنوی، سلطان محمود غزنوی (پروفیسر حبیب) تاریخ سندھ وشی ج ۱ باب ۱۳ (۱۱) نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۶، (سلطان ابراہیم) ۷۷ (بنالگین) ۷۹ (ارتق) (۸۰) (درونی) ۸۱ (ابوالمظفر ایاز) ۸۳ (رزنیہ) ۸۴ (مسعود سالار) ۸۵ (عطا) ۸۶ (بیرونی) ص ۱۱۴ (مسعود بن سلمان) ۹۰ (سلطان محمود) ۹۶ (مسعود) ۹۹ (نوشتگین) ۸۲ (زنجانی) ۸۹ (ہجویری) (۱۰۲) بہرام شاہ (۱۰۶) (طغا تگین) ۱۰۷ (عبدالصمد) ۷۷ (دمشقی) ۷۷ (علی بن عمر) ۱۰۸ (ترمذی) ۷۶ (ابراہیم) ۱۰۹ (عبدالملک) ۱۱۰ (جوزجانی) ۱۱۱ (محمود) ۷۶ (ابوالقاسم لاہوری) ۷۷ (مخلص) ۱۱۳ (مسعود سالار) ۱۱۷ (مدرسہ اللہ) ۱۱۹ (دہ مندی) ۱۰۰ (زرین) ۱۱۹ (گردیزی)۔

سے ملقب نہیں کیا گیا ہے، مولانا عبدالرحمٰن چشتی نے انھیں سید الشہداء کے لقب سے یاد کیا ہے اور غالباً اسی راہ سے سید کا لقب ان کے نام کا جزو بن گیا ہے ایک روایت ان کے افغانی النسل ہونے کی متعلق بھی آئی ہے۔ لیکن وہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ نسلاً علوی تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اسم گرامی ان کے شجرۂ نسب میں بارہویں پشت میں ہے، ان کے علوی ہونے کے باوجود ان کا محمود غزنوی کے رشتہ داروں میں سے ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، اس زمانہ میں ایسی رشتہ داریاں ہوتی تھیں، ان کا ننہالی تعلق محمود غزنوی کے خاندان سے ہے ان کی ماں بی بی ستر معلیٰ محمود کی بہن تھیں، خواہ سگی ہوں، یا کسی دوسرے قریبی رشتہ کی۔

حضرت سالار مسعود غازی کے والد ماجد سالار ساہو ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں قندھار اور ٹھٹھہ کی راہ سے اجمیر پہنچے اور سالار مسعود غازی کی پیدائش یہیں اجمیر میں ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء میں ہوئی تاریخ فرشتہ میں ۵۵۵ھ میں شہید کیے جانے کا جو ذکر آیا ہے، اس کو کسی حال میں صحیح نہیں کہا جاسکتا تاریخ فرشتہ میں سنین کی غیر معمولی غلطیاں ہیں، اس لیے اس کے سنین وہی معتبر سمجھے جاسکتے ہیں، جن کی تصدیق دوسری تاریخوں سے ہوتی ہو یا جن کی تردید میں کوئی دوسری روایت براہ راست یا بالواسطہ موجود نہ ہو ۵۵۵ھ میں غزنویوں کا آخری دور تھا، خسرو ملک حکمران تھا، اس کے لیے اپنے تخت کا سنبھالنا دشوار تھا، [illegible] غزنی سے یہیں باہر کیا جاتا اس لیے حضرت سالار مسعود غازی کی وفات کو ۵۵۵ھ میں کہنا نہ صرف عام تاریخوں کی روایتوں کے خلاف ہے، بلکہ سلطنت کے داخلی حالات بھی اس کے مخالف ہیں، پھر ہندوستانی راجاؤں کے کتبوں کی شہادتیں اس کے خلاف ہیں، اس لیے ان کا زمانہ ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء سے ۴۲۴ھ/۱۰۳۳ء ہی کے اندر ہے اور انھوں نے اسی عمر میں جام شہادت نوش کیا ہے۔

حضرت سالار مسعود غازی نے ساڑھے ۴ سال کی عمر سے تعلیم شروع کی اور ۱۲ سال کی عمر میں انھوں نے خاصی تعلیم حاصل کرلی۔ یہ تعلیمی زمانہ تقریباً اجمیر ہی میں گزرا سالار ساہو، محمود غزنوی کے حکم سے ۴۱۵ھ/۱۰۲۴ء میں اجمیر سے کالنجر کی مہم پر گئے اور مختلف مہمیں انجام دیتے رہے۔ اور جب [illegible] ان [illegible] بیوی بچے

پہنچے، اب اس دیار کے راجاؤں نے اُن سے آخری فیصلہ کر لینے کا عزم کیا، وہ مختلف
مقاموں سے چل کر یہاں آئے اور سرجوڑ کر ان کے مقابلہ کی تیاری کی، چنانچہ ان سے
بھی کل تین لڑائیاں ہوئیں، پہلی لڑائی میں سالار مسعود کو کامیابی ہوئی۔ دوسری لڑائی
بھی انھوں نے جیتی، مگر ان کے رفقا کی بڑی تعداد جنگ میں کام آگئی اور تیسری ۱۳ ادیبا
رجب ۴۲۴ھ / ۱۰۳۳ء کی صبح کو شروع ہوئی، راجاؤں کی فوجیں بڑی تعداد میں تھیں اور
انھیں کمک بھی ملتی جاتی تھی۔ دونوں فوجوں کا کوئی مقابلہ نہ تھا، چنانچہ حضرت سالار
کے ہمراہی ایک ایک کرکے شہید ہوئے اور ۱۴ رجب ۴۲۴ھ / ۱۰۳۳ء کو انھوں نے بھی جام شہادت
نوش کیا، امیر سید ابراہیم جو کیمپ کی حفاظت پر مامور تھے، لڑائی ختم ہونے کے بعد میدان
جنگ میں آئے اور اُن کی اور ان کے رفقا کی لاشیں سپرد خاک کیں اور وہی مدفن آج
تک مزار اور مرجع خلائق ہے رحمہ اللہ تعالیٰ والسلام

سلطان شہاب الدین غوری

سنہ ۵۹۳ھ ـــــ ۶۰۲ھ
۱۱۹۹ء ـــــ ۱۲۰۵ء
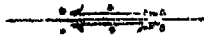
غوری سلطنت کی بنا غزنوی سلطنت کے کھنڈر پر قائم ہوئی۔ اس سلطنت کا بانی عزالدین حسین اسی عربی و ایرانی مخلوط نسل کے قبیلہ سے تھا، جو آل شنسب کہا جاتا ہے اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا اس نے سنہ ۴۹۳ھ (۱۰۹۹ء) میں غور میں اپنی خود مختار حکومت کی بنا ڈالی اور غزنوی سلطان نے اس کی خود مختاری تسلیم کر لی۔

ہندستان میں غوری سلطنت کا بانی اس کا پوتا سلطان شہاب الدین غوری تھا جو پہلے غزنی کی فتح کے بعد وہاں کا صوبہ دار پھر اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کی وفات کے بعد پوری سلطنت کا مالک بنا، وہ محمود غزنوی کا جانشین تھا اور اس کے حدود حکومت کو اپنے قبضہ میں لانے کا حوصلہ رکھتا تھا، چنانچہ سنہ ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) سے سنہ ۶۰۲ھ (۱۲۰۵ء) کے اندر اس نے اپنے پے در پے حملوں اور اپنے قائم مقام فوجی گورنروں کے ذریعہ ایک طرف پشاور سے بنگال تک کے علاقہ کو زیر نگین کیا اور دوسری طرف ملتان و سندھ میں اپنا سکہ جمایا۔

سلطان شہاب الدین غوری کو ہندستان کی اسلامی سلطنت کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، درحقیقت وہی صاحب سیف و سلطنت ہے جو ہندستان میں مسلمانوں کی وسیع سلطنت کے قیام کا بانی بنا، یوں تو سندھ، ملتان، اور پنجاب کی فتح کے بعد غزنویوں نے ہندستان کے ایک حصہ پر [illegible] حکمرانی کی مگر یہ خود ہندستان کی کوئی سلطنت نہ تھی بلکہ ہندستان کا یہ حصہ [illegible] حکومت غزنی کا ایک صوبہ بن گیا تھا۔ اس صوبہ کا پایہ تخت لاہور اور مرکزی حکومت کا دارالسلطنت غزنی تھا۔

سلطان شہاب الدین [illegible]

حکمران اس کا بڑا بھائی سلطان غیاث الدین تھا، اور محمد غوری جس نے آگے چل
کر سلطان شہاب الدین کا لقب اختیار کیا، اس کا سپہ سالار تھا، محمد غوری کی
زندگی کا بڑا حصہ [illegible] ہندوستان کی مہمات میں گزرا، اور اسی سلسلہ میں اس کی زندگی
کا نمایاں کارنامہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا قیام ہے۔

ہندوستان پر حملہ آوری کے مقاصد | سلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستان
پر پے در پے حملے کیے، ان حملوں [illegible] کے حملہ آور ہونے کی کئی مقاصد تھے
اول وہ دیندار مسلمان تھا، اس زمانہ میں ملتان اور سندھ کے بعض حصوں میں
ملحد قرامطہ نے اقتدار حاصل کر لیا تھا، اور ان کے ذریعہ سے بددینی کی اشاعت
ہو رہی تھی، سلطان نے ان کے اقتدار کو ختم کرنا چاہا، دوسرے غوری سلطنت
کی بنیاد غزنوی سلطنت کے کھنڈر پر قائم کی گئی تھی، وہ اپنے اس مقصد کو پورا
کرنے کے لیے پنجاب سے غزنوی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا، تیسرے ہندوستان
میں مستحکم سلطنت کے قائم کرنے کا خیال بھی اس کے پیش نظر تھا، ان ہی گوناگون مقاصد
کے لیے اس نے ہندوستان پر مسلسل حملے کیے، اور یکے بعد دیگرے اپنے مقصد میں
پوری کامیابی حاصل کرتا گیا۔

قرامطہ کی بیخ کنی | چنانچہ سب سے پہلے اس نے ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) میں ملتان پر حملہ کیا، پھر سندھ
کے شہر اوچھ کو فتح کیا، اور ان دونوں مقاموں سے اس نے قرامطہ کی حکومت
کی بیخ کنی کر دی۔

غزنوی سلطنت کو مٹانا | اس کے بعد اس نے ہندوستان سے غزنوی سلطنت
کے نشان کو مٹانے کے لیے پے در پے حملے کیے، اس غرض سے اس نے جموں کے راجہ
چکر دیو سے دوستی کر لی تھی اور اسی کی دعوت پر آ کر غزنوی سلطنت پنجاب کے
خلاف اس نے اپنی فوجی مہم کا آغاز کیا تھا، چنانچہ اسی سلسلہ میں سب سے پہلے اس نے
پشاور کی شہر پناہ پر دستک دی۔ اور ۵۷۵ھ (۱۱۷۹ء) میں پشاور پر قبضہ کر لیا۔ دو سال
کے بعد [illegible] ۵۷۷ھ (۱۱۸۱ء) میں وہ دوبارہ پنجاب آیا اور

اس کے دوسرے سال جلیا کہ اوچ گزرا۔ بالآخر ۵۸۲ھ میں اس نے لاہور فتح کرکے غزنوی شاہزادے خسرو ملک کو گرفتار کرلیا اور ہندستان سے غزنوی سلطنت کا نشان مٹ گیا۔

ہندستان میں مستحکم سلطنت کی بناء تاسیس

تیسرے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے سب سے پہلے ۵۷۴ھ (۱۱۷۸ء) میں گجرات پر چڑھائی کی۔ اور اس کے صدر مقام نہلواڑہ کا محاصرہ کیا۔ مگر گجرات کے راجہ مول راج اور اس کے [illegible] بھیم بگھیلا نے اس کو شکست دی، دوسرا حملہ اس نے ۵۸۶ھ (۱۱۹۱ء) میں بھٹنڈا پر کیا اور اس کو فتح کرلیا، یہ مقام دہلی کے راجہ پرتھوی راج کے قبضہ میں تھا، سلطان کو [illegible] پرتھوی راج نے اس کا تعاقب کیا۔ تراوڑی کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، غوری نے شکست کھائی، اور بھٹنڈا اس کے قبضہ سے نکل گیا ایک سال کے بعد ۵۸۸ھ (۱۱۹۳ء) میں سلطان دوبارہ آیا، اور اسی تراوڑی کے میدان میں [illegible] دوبارہ مقابلہ ہوا۔ پرتھوی راج لڑائی میں مارا گیا اور دہلی اور اجمیر کی سلطنتیں اس کے قبضہ میں آگئیں اور مشہور قلعے سرستی، ہانسی، سامانہ اور کہرام وغیرہ [illegible] سلطنت کے حدود میں داخل ہوگئے [illegible] پرتھوی راج کے قدیم خاندان کے اعزاز کو برقرار رکھا اور اس کے لڑکے کو اجمیر [illegible] تخت پر بٹھا دیا اور اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اپنا نائب السلطنت [illegible] قطب الدین ایبک نے پہلے کہرام پھر دہلی کو اپنا پایہ تخت بنایا۔

اس کے بعد قطب الدین نے اپنے طور پر [illegible] اسی سال میں ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں میرٹھ فتح ہوا، اور ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں علی گڑھ [illegible] اس کے بعد ۵۹۰ھ (۱۱۹۵ء) سلطان شہاب الدین پھر ہندستان آیا اور [illegible] قنوج کے راجہ جے چند کو شکست [illegible] سے بنارس تک کا علاقہ غوری سلطنت [illegible] قطب الدین ایبک نے ۵۹۱ھ (۱۱۹۴ء) میں گجرات [illegible]

کولوٹا، راجہ بھیم نے شکست کھائی، پھر تیسرے سال ۵۹۳ھ (۱۱۹۶ء) میں تیسری مرتبہ گجرات پر حملہ کیا اور اپنے مقبوضات کے لیے نائب حکومت مقرر کر کے چلا آیا، مگر گجرات پھر قبضہ سے نکل گیا، دوسری طرف ۵۹۲ھ (۱۱۹۵ء) میں چندراوتی، آبو اور ناگور کے راجاؤں نے اجمیر پر قبضہ کرنا چاہا، مگر ایبک نے سب کو شکست دے دی، اسی طرح ۵۹۳ھ (۱۱۹۶ء) میں اس نے بیانہ کو فتح کیا اور گوالیار کے محاصرہ میں وہاں کے راجہ نے خراج دینا منظور کیا، پھر اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی کو فوج دے کر بھیجا جس نے ۵۹۶ھ (۱۱۹۹ء) میں بہار کو فتح کیا پھر آگے بڑھ کر بنگال کے پایۂ تخت ندیا پر قبضہ کیا، دوسری طرف کالنجر کے راجہ پرمل پر حملہ ہوا، اس نے اطاعت قبول کی، پھر مہوبہ، کالپی اور بدایوں اسلامی اقتدار میں داخل ہوئے۔ یہاں تک کہ ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) میں سلطان شہاب الدین غوری آخری مرتبہ ہندوستان آیا، اس وقت ہندوستان کی اسلامی سلطنت پشاور سے بنگال تک کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی۔

وفات | سلطان ایک فساد کے فرو کرنے کے سلسلہ میں ہندوستان آیا تھا، اور اتفاقاً واپسی میں اس کی شہادت کا واقعہ پیش آگیا، اور ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا حقیقی بانی اپنی ابدی خوابگاہ میں ہمیشہ کے لیے میٹھی نیند سو گیا۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ

جانشین | سلطان کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، اس کے تین ترک غلام، فوجی گورنر کے منصب کے فرائض اس کی زندگی میں انجام دیتے تھے اور وہی اس کے جانشین بن کر غوری سلطنت کے دعوے دار ہوئے اور وہ سلطان تاج الدین یلدوز، سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان ناصر الدین قباچہ تھے ان میں سے اول الذکر یلدوز نے غور میں اس کی جانشینی کی اور پشاور کے اس پار کا علاقہ اس کے زیر تصرف رہا، قطب الدین ایبک دہلی کی سلطنت پر بیٹھا، اور ناصر الدین قباچہ کا تعلق بھی ہندوستان ہی سے تھا، اس نے سندھ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کیا، ابتداً ان تینوں میں زور آزمائی بھی ہوئی، ۶۰۶ھ (۱۲۱۶ء) میں ایک پڑھائی کرتا ہوا

غزنی تک پر قابض ہو گیا، مگر پھر ناکام واپس ہو کر اپنی سلطنت پر قناعت کرنی پڑی، سات سال کے بعد تاج الدین نے ہندوستان کا رخ کیا۔ مگر قطب الدین کے زور آور پنجوں کی گرفت میں آ گیا اور بدایوں میں قید کر دیا گیا پھر قطب الدین نے غزنی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا اور دلی کو پایۂ تخت بنائے رکھا، دوسری طرف ناصر الدین قباچہ کی نگاہیں بھی پنجاب پر تھیں، اس سے بھی اس کی معرکہ آرائیاں ہوئیں مگر قباچہ پیش نہ پا سکا بالآخر سندھ کی سلطنت بھی اس نے کھوئی، ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں یہ صوبہ بھی دلی کے ماتحت آ گیا، اور قباچہ نے دریا میں ڈوب کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

سیرت و کردار | سلطان شہاب الدین متقی، دیندار، شجاع اور عدل پرور تھا، رعایا کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا اور ان کے معاملات کا منصفانہ فیصلہ کرتا تھا، غزنی کا قاضی ہر ہفتہ میں شنبہ سے سہ شنبہ تک سہ دن اس کی موجودگی میں امیر حاجب و امیر داد کے مشترکہ اجلاس میں مقدمات و معاملات کی سماعت کرتا تھا۔ اور اگر کوئی صاحب معاملہ براہ راست توجہ سلطانی کو منعطف کرانا چاہتا، تو اس کی سماعت خود کرتا تھا، اور قاضی احکام شریعت کے مطابق نافذ کئے جاتے تھے وہ خود صاحب علم تھا، فقہاء و علماء اس کی مجلس میں پابندی سے شریک رہتے اور فقہ و دیگر علوم دین کے مسائل زیر بحث رہتے تھے وہ مذہباً شافعی تھا، مشہور مفسر امام فخر الدین رازی کو سلطان سے تقرب حاصل تھا وہ عقیدت مندی کے ساتھ ان سے پیش آتا۔ ہفتہ میں ایک دن شاہی محل میں مجلس وعظ منعقد ہوتی امام رازی کے بیان سے [illegible] روتے روتے اس کی ہچکی بندھ جاتی تھی۔

علما و مشائخ | غزنی کے دربار میں علما و شعرا اور فضلا [illegible] موجود تھے جن میں سے بعض اہل علم شہاب الدین غوری کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے اور علم و عرفان کی خدمت کے لیے یہیں توطن اختیار کر لیا۔

چنانچہ سید کمال الدین عثمان ترمذی مشہور علماء میں سے تھے وہ سلطان شہاب الدین کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے کیتھل میں اقامت اختیار کر کے علم کی

سُلطان شہاب الدین کے قاتل، مقتل، مرقد

سُلطان شہاب الدین کی شہادت کا واقعہ ہندستان میں پیش آیا، وہ کس مقام پر شہید کیا گیا، اس کے قاتل کون تھے، اور کون سا مقام اس کی ابدی خواب گاہ تھا۔ یہ اور اسی قسم کے سوالات پر مورخین کے اختلافات کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ذیل کے مقالہ میں ان ہی پردوں کو اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے، جس کا موقع اتفاق سے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ایک صاحب ذوق جناب محمد اسلم صاحب (بکرالہ ضلع جہلم) کے بعض استفسار کا جواب دینے کے سلسلہ میں ہاتھ آیا، اس لیے یہ مقالہ دراصل مستفسر موصوف کے اسی استفسار کے جواب میں لکھا گیا، جس میں سلطان کے قاتل، مقتل و مرقد کے متعلق مختلف روایتوں پر نظر ڈال کر کسی ایک نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی گئی۔

پھر اس مقالہ کے چھپنے کے بعد بعض اہل علم نے اس پر مزید گفتگو کی، اوران کے استفساروں کے جواب بھی چھاپے گئے، ان جوابوں کو بھی ذیل میں ایک کڑی میں لے آیا گیا ہے۔

جناب محمد اسلم صاحب اپنے استفسار میں فرماتے ہیں:-

"جناب نواب امتیاز الدین سپرنٹنڈنٹ پولیس جہلم کو تاریخ سے انس ہے، اپنے مختصر قیام ملازمت میں ضلع کے اکثر تاریخی مقامات کا بچشم خود ملاحظہ کیا ہے، اسی شوق نے انھیں سلطان شہاب الدین محمد غوری مرحوم کے مقتل کو بمقام دھمک جو سوادہ اسٹیشن سے بجانب شمال ۳ میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، دیکھنے پر مجبور کیا، وہاں جن لوگوں کی معیت میں وہ گئے تھے، وہ تاریخ سے قطعاً نابلد ہیں، انھوں نے ان کو سلطان موصوف کی قتل گاہ بتانے کے بعد مرحوم کی تربت بھی دکھائی کہ یہاں موصوف کو دفن کیا گیا ہے اور سلطان کے قاتل گکھڑوں کو ظاہر کیا گیا، اس دورہ کے بعد نواب صاحب نے ایک مقالہ

اخبار "نئی زندگی" میں جو جہلم سے شایع ہوتا ہے. شائع کرایا۔ اور ڈپٹی کمشنر صاحب کی معرفت محکمۂ آثار قدیمہ کی توجہ کو اس قبر کی طرف منعطف کرانے کی کوشش کی، کہ اس دیرینہ یادگار کو محفوظ کرنا ازبس ضروری ہے۔ اب اکثر تعلیم یافتہ اصحاب اس داستان کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، اس لیے آپ ازراہ کرم ایک مقالہ معارف میں شائع کریں کہ

(الف) سلطان شہاب الدین مرحوم کو کس نے شہید کیا۔ فرشتہ نے گکھر قوم کی نسبت غلط بیانی سے کام لیا ہے یا دیدہ و دانستہ ایسا کیا گیا، یا اسے غلط فہمی ہوئی، اس کی تصحیح بھی لازمی ہے۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان محمود کے ساتھ گکھڑوں نے مقابلہ کیا جس سے سلطان کی بے شمار فوج ماری گئی اور سلطان شہاب الدین کو قتل کیا، لیکن گکھڑوں کے ایک ممتاز فاضل شخص کا بیان ہے، کہ گکھڑوں نے نہ سلطان کا مقابلہ کیا، نہ شہاب الدین مرحوم کو قتل کیا، بلکہ وہ خود سلطان محمود (غزنوی) کی معیت میں ہندستان میں داخل ہوئے یہ قوم کیانی النسل ہے، اس کے برخلاف بلکہ قوم کھوکھر نے سلطان کا مقابلہ کیا دراصل فرشتہ کو مغالطہ ہوا ہے۔

(ب) شہید کرنے کی وجہ کیا ہے۔

(ج) سلطان موصوف کا مرقد کہاں ہے۔

(د) ہمراہی کس قدر تھے جو قتل ہوئے۔

(ہ) یہ واقعہ کس مقام پر ہوا کیا اس کا تاریخی نام دھمک ہے۔

یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری کے واقعہ شہادت کے متعلق سات آٹھ سو برس گزرنے کے باوجود ابھی وہی روایتیں سینہ بسینہ چلی آرہی ہیں جن سے یک گونہ مورخین کے بیانوں کی تصدیق ہوتی ہے۔

(الف) **قاتل** یہ واقعہ ہے کہ سلطان شہاب الدین کا واقعہ قتل لاہور سے غزنی مراجعت کرتے ہوئے دریائے جہلم کے کنارے پیش آیا لیکن اس کے قاتلوں کے متعلق ابتدا سے دو روایتیں نقل ہوتی آرہی ہیں ایک تو یہ کہ وہ قوم کھوکھر کے جو

مغربی پنجاب کے پہاڑی علاقوں میں آباد تھے، چند جاں باز فدائی جو ان تھے، انھوں نے اپنی قوم کے مقتولوں کا بدلہ لینے کے لیے اپنی جانیں دے کر سلطان کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے باہم حلف اٹھایا تھا، اس لیے کہ سلطان شہاب الدین آخری مرتبہ ہندستان میں خاص طور پر کھوکھروں کا استیصال کرنے کے لیے آیا تھا۔ جنھوں نے اپنی لوٹ مار سے لاہور و غزنی کے درمیان کے رستہ کو اس قدر پرخطر بنا دیا تھا کہ سرکاری محاصل لاہور سے غزنی نہ بھیجے جا سکتے تھے، چنانچہ وہ ہندستان آیا قطب الدین ایبک کو بھی دلی سے بلایا اور کھوکھروں پر سخت حملے کر کے ان کی قوت کا خاتمہ کیا اور انھوں نے اطاعت قبول کی انھیں وہ زیر کر کے لاہور سے غزنی کے قصد سے روانہ ہوا۔ دریائے جہلم کے کنارے ایک منزل "دمیک" میں اترا، یہاں سے ۳ر شعبان کو کوچ کرنے کی تیاری ہو رہی تھی، کچھ خیمے اکھڑ چکے تھے، سلطانی خرگاہ استادہ تھا کہ ۲ر کا دن گزار کر ۳ر کی شب کو عشا کے وقت اچانک ایک چوبدار کو کسی اجنبی نے زخمی کیا۔ لوگ اس کی طرف دوڑ گئے، سلطانی خواب گاہ کی محافظ سپاہ بھی اس ناشدنی واقعہ کو دیکھ کر اپنے فرض منصبی سے غافل ہوئی اور اس زخمی چوبدار کو دیکھنے چلی آئی۔ اس طرح حملہ آوروں کی حکمت عملی کامیاب ہوئی، وہ سلطانی خواب گاہ کا سراپردہ اٹھا کر اندر گھس گئے، سلطان عشا کی نماز پڑھنے کے لیے جانماز پر کھڑا تھا حملہ آوروں نے اطمینان سے چھریوں سے بائیس زخم پہنچائے اور سلطان کی روح پرواز کر گئی۔[1]

[1] ان سطروں کے لکھے جانے کے بعد صوبہ بہار کی شکستہ بکس میں سے ایک کتاب لور پرائمری ہسٹری (راقم لوچپ وثنا حسن ایم اے) میں سلطان شہاب الدین کے واقعہ قتل کے متعلق ایک عجیب نئی روایت دیکھنے میں آئی۔ جو کسی ہندی کتاب سے ماخوذ ہے، کہا گیا ہے کہ غوری پرتھوی راج کو پکڑ کے غزنی لے گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں، چند بردائی مصنف "پرتھوی راج راسو" پرتھوی راج کی تکلیفوں کا حال سن کر غوری سے بدلہ لینے کے لیے غزنی گیا، غوری سے ملاقات کی اور پرتھوی راج کی تیر اندازی کی تعریف کی کہ وہ ایک سومن کے لوہے کی سات پرتوں کو ایک ہی تیر سے چھید سکتا ہے، غوری نے اس کی آزمائش کے لیے اس کا تماشا دیکھنے کا اہتمام کیا ایک میدان میں ایک سومن لوہے کی دبیز سات پرتیں پیچھے بعد دیگرے کھڑی کی گئیں، تماشائی جمع ہوئے اور خود سلطان شہاب الدین غوری ایک اونچی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ادر ادھر چند بردائی نے پرتھوی راج کو پہلے سمجھا دیا تھا کہ میرے اشارے پر شبد بیدھی تیر چلانا یعنی جدھر سے آواز آئے اسی طرف بغیر دیکھے تیر چلایا جائے، چنانچہ پرتھوی راج امتحان میں کامیاب ہوا غوری کی زبان

(بقیہ حاشیہ ۱۱۶ پر)

قاتلوں کے متعلق دوسری روایت یہ ہے کہ اس کو اسمٰعیلی ملاحدہ کے چند فدائیوں نے شہید کیا تھا، اس لیے کہ سلطان اس سے پہلے مختلف مقاموں پر ان کا قلع قمع کر چکا تھا اور یہاں سے واپس جا کر وہ ان کے مرکز پر حملہ آوری کا ارادہ رکھتا تھا۔

سلطان کے قاتل کی حیثیت سے بس ان ہی دو جماعتوں کے فدائیوں کے نام لیے گئے ہیں، سلطان سے قریب عہد کی فارسی تاریخوں میں طبقات ناصری قاضی منہاج (سنہ ۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء) اور تاریخ جہانکشائے جوینی (سنہ ۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ء) میں سے اول الذکر میں اسماعیلی ملاحدہ کو اور موخر الذکر میں ہندو کھوکھروں کو قاتل بتایا گیا ہے، طبقات ناصری میں ہے:-

دراں وقت جماعت متمرداں از کھوکھراں (اور نسخہ ثانی کھوکھرول) دقبایل کوہ جود (در نسخہ ثانی جون) عصیاں آوردہ بودند و سلطان دراں زمستان بہ ہندوستان آمد و آں طائفہ متمرداں را بدوزخ فرستاد و غزو نسبت بہ فرمود و جوئے خون ازاں جماعت براند چون مراجعت بغزنیں کرد، بدست فدائی ملاحدہ در منزل دمیک در شہور سنتہ اثنین و ستمایہ شہادت یافت،[1]

تاریخ جہاں کشائے جوینی میں ہے:-

چوں عنان انصراف معطوف کرد و نیدہ از معبر جیلی (نسخہ جیلی) عبور کرد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵) - واہ واہ کے الفاظ نکلے، چند بردائی نے اسی وقت یہ دوہا پڑھا۔

چار بانس چوبیس گج انگل اسٹ پرمان
اتتے پے سلطان ہے مت چوکے چوہان

یعنی چار بانس چوبیس گز آٹھ انگل پر سلطان ہے، جدھر سے آواز آئی ہے، اسی طرف اتنے فاصلہ پر سلطان ہے، پرتھوی راج نے واہ واہ کی صدا کے فاصلہ کا اندازہ لگا کر تیر چلایا، اور محمد غوری وہیں تڑپ کر رہ گیا، پھر چند بردائی اور پرتھوی راج نے ایک دوسرے کو اپنی تلوار سے مار ڈالا، میں نے اپنے بعض ہندو دوستوں سے سنا ہے کہ یہ حکایت کسی پرانی ہندی کتاب میں بھی درج ہے۔ لیکن ظاہر ہے، کہ یہ تمام بے سر و پا اور گڑھی ہوئی باتیں ہیں اور ایسی من گھڑت ہے کہ اس کی تردید میں کچھ لکھنا تضیع اوقات کرنا ہے، تعجب اس پر ہے کہ چھوٹے بچوں کے ذہن کو فرقہ وارانہ جذبات زہر آلود کرنے والی کہانیاں اس کتاب کے مصنفین نے کیوں درج کیں۔

[1] طبقات ناصری ص ۱۲۳، ۱۲۴۔

وبرشط جیحوں بارگاہ برآوردند، چنانک یک نیمہ از بارگاہ در آب بود۔ و در محافظت آن جانب از فدائیان احتیاط ترک گرفتہ ناگاہ ہندو سے دو سہ میان روز بوقت قیلولہ سلطان چوں آتش از آب برآمدند و در بارگاہ افتادند و از ترقب و ترصد حساد و مکار غافل و از عناد روزگار و اہل روز سپید سیاہ او را بافتادہ شاہ شب نمودند و مذاق طعم حیات را بر او تباہ کردند۔[1]

ان کے بعد ہم دست فارسی تاریخوں میں سب سے قدیم متوفی قزوینی ۷۳۰ھ (۱۳۳۰ء) کی تاریخ گزیدہ ہے اس میں مذکور ہے،

در راہ فدائیان ہندوان کوکری در حالت نماز کردن او را شہید کردند۔[2]

عرب مورخین میں سے ابن اثیر متوفی ۶۳۸ھ (۱۲۴۰ء) سلطان شہاب الدین کا تقریباً ہم عصر ہے، اس نے قتل کو تفصیل سے لکھا ہے اور اصلاً کھوکھروں کو قاتل گردانا ہے۔ ضمناً اسماعیلیوں کی طرف اس واقعہ کے منسوب ہونے کا تذکرہ بھی کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے،

اسی سال (۶۰۲ھ) شعبان کی پہلی رات کو شہاب الدین ابو المظفر محمد بن سام غوری شاہ غزنی و بعض حصۂ خراسان لاہور سے اپنی واپسی میں ایک منزل دمیک میں عشا کی نماز کے وقت قتل کیا گیا۔ اس کے قتل کئے جانے کا سبب یہ تھا کہ کھوکھر کفار میں سے چند نفر اس کو قتل کرنے کا عزم کرکے اس کے لشکر کے ساتھ ہو گئے، ...... پس پاسبانوں کو پاسبانی کی خدمت سے غافل پاکر کھوکھروں کو غنیمت کا موقع ملا اور وہ شہاب الدین کے پاس پہونچنے میں کامیاب ہو گئے

اس کے بعد ان واقعات کی تفصیل ہے جن کو ہم اوپر اجمالاً نقل کر چکے ہیں، اس کے بعد وہ قاتلوں کی گرفتاری کا تذکرہ کرتا ہے کہ

پھر ان کفار کو پکڑ لیا اور انھیں قتل کر دیا اور ان میں سے دو مختون تھے

اس کے بعد لکھتا ہے:-

اور کہا گیا ہے کہ ان ہی اسماعیلیوں نے قتل کیا، اس لیے کہ انھیں اس کے خراسان

---

[1] تاریخ جہاں کشا ج ۲ ص ۵۹ طبع لیڈن ۱۹۱۲ء [2] تاریخ گزیدہ ج ۱ ص ۴۱۲

پرحملہ آور ہونے کا خطرہ تھا۔ اور اس کا لشکر ان کے بعض قلعوں کا محاصرہ بھی کیے ہوئے تھا۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں[12]۔

اسی طرح ابن خلدون نے ان گکھروں کو قاتل قرار دیا ہے، پھر اسماعیلیوں سے متعلق روایت درج کی ہے[13]

اس کے بعد فارسی تاریخوں میں بدایونی (۹۹۷ھ / ۱۵۸۹ء) وغیرہ کا دور آتا ہے، ان کے یہاں اسماعیلیوں کے متعلق روایت موجود نہیں چنانچہ منتخب التواریخ میں ہے:۔

"ہنگام مراجعت در دمیک کہ نام دیہی است از توابع غزنین از دست فدائی کھوکھر شہید شد[14]"

محمد قاسم فرشتہ نے بھی اپنی تاریخ (تکمیل ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۶ء) میں دراصل اپنے پیشروؤں کی تقلید کی ہے لکھتا ہے:۔

بیست نفر از کفار گکران کہ اکثر خویشان و اقربا و فرزندان ایشان در جنگ سلطان شہاب الدین (اس جنگ کی وہی تفصیل جو اوپر گزری درج کر چکا ہے) کشتہ شدہ بودند، ہم عہد و ہم سوگند شدہ و کشتہ شدن بر خود قرار دادہ، در باب کشتن سلطان شہاب الدین تدبیر ہا جستند[15]......

مناسب ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے استفسار کے اس حصہ پر یہاں نظر ڈال لی جائے جس میں فرشتہ کی اس غلط فہمی یا غلط بیانی کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے سلطان کے قاتل کی حیثیت سے کھوکھروں کے بجائے "گکھروں" کا نام لیا ہے تاکہ فرشتہ کے بیان سے سلطان کے قاتلوں میں ایک نئی جماعت کے نام کا اضافہ نہ ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ فرشتہ کا مطبوعہ نسخہ بہت غلط چھپا ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں "کھوکھر" اور "گکھر" میں امتیاز نہ رہ سکا ہے، مختلف مقاموں پر جہاں گکھر ہونا چاہیے "کہکر" چھپا ہے، مثلاً ص ۱۴۱۔ میں "سلطان آدم" کو گکھر کے بجائے "کہکر" کہا گیا ہے، اسی طرح ۷۴۳ھ / ۱۳۴۲ء میں تلک چندر سردار کھوکھر کی بغاوت کا ذکر ہے، اس موقع پر بھی "کہکر" چھپ گیا ہے (ص ۱۳۷)۔

۱۲؎ الکامل ج ۲ ص ۲۸۳ طبع ... ۱۳؎ تاریخ ابن خلدون ج ۴ ص ۴۲۳، ۲۰۹ ۱۴؎ منتخب التواریخ ج ۱ ص ۴۳ ۱۵؎ تاریخ فرشتہ ص ...

اسی طرح جسرت کھوکھر کے لاہور کے صوبہ دار کو مارنے کا ذکر ہے، وہاں بھی کہکر ہے اس کے برخلاف بدایونی وغیرہ میں کھوکھر اور گکھر کے فرق کا لحاظ ہر جگہ موجود ہے اس میں جہاں کھوکھر ہونا چاہیئے، کھوکھر ہے جیسے جسرت کھوکھر (ج ۱ ص ۲۰۹، گل چند کھوکھر (ج ۱ ص ۲۳۱) اور گکھروں کو "کہکر" لکھا گیا ہے، جیسے "سلطان آدم کہکر" (ج ۱ ص ۱۳۹) "برسر کہکران" (ج ۱ ص ۳۸۸) "اول پناہ بہ کہکران" (ج ۱ ص ۳۸۶) وغیرہ، یہ سمجھنا کہ بدایونی ان دونوں قوموں میں امتیاز رکھ سکے اور تاریخ فرشتہ جو چند سال بعد تکمیل کو پہنچی، اس میں ان دونوں کو خلط ملط کر دیا جائے، یہ قیاس سے دور معلوم ہوتا ہے، اس لیے واقعہ یہی ہے، کہ طباعت کے وقت کاتب کے قلم سے سہو ہوا، اور وہ "کھوکھر" اور "گکھر" میں امتیاز قائم نہ رکھ سکا اور اس غلطی سے ایک قوم کا پورا بار گناہ دوسری قوم کے سر آگیا۔

بہرحال سلطان کے قاتلوں کے سلسلہ میں روایات کے اہم سرچشمے اوپر پیش کر دیئے گئے ان میں دیکھا جا سکتا ہے کہ متقدم مورخین میں سے ابن اثیر (۶۳۰ھ/۱۲۳۳ء) جوینی (تصنیف ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء و متوفی ۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء) قاضی منہاج (تصنیف ۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء) اور قزوینی (۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء) کی روایتیں ہیں، ان میں سے ابن اثیر (۶۳۰ھ/۱۲۳۳ء) اور قزوینی (۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء) نے بہ تصریح کھوکھروں کا نام لیا ہے، جوینی (۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء) نے بھی "ہندوؤں" کو بتایا ہے جس سے مراد کھوکھر ہی ہو سکتے ہیں، صرف صاحب طبقات ناصری منہاج (۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء) اسماعیلیوں کو قاتل قرار دیتے ہیں، لیکن قاضی منہاج کی یہ منفرد روایت متاخرین میں مقبول نہیں ہوئی، چنانچہ ملا بدایونی (۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء) اور فرشتہ (۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء) وغیرہ نے صرف اول الذکر بیان کو درج کیا، پھر زمانۂ حال کے مغربی الفنسٹن وغیرہ نے بھی کھوکھروں کے قاتل ہونے کی روایت کو قبول کیا ہے۔[1]

یہاں ایک گمان یہ ہو سکتا ہے کہ سندھ کی اسماعیلی حکومتوں کے کھنڈروں پر ناصر الدین قباچہ نے اپنی حکومت کی بنیادیں قائم کیں ان مقامات سے ان قرامطہ کا انتخاب بخاتمہ

۱؎ تاریخ ہندوستان الفنسٹن ترجمہ اردو، ص ۹۹۷

سلطان غیاث الدین اور شہاب الدین نے کیا تھا، ناصر الدین قباچہ شہاب الدین کا صوبہ دار تھا، سلطان کی شہادت کا واقعہ اچانک پیش آیا تھا اور سیاسی حیثیت سے بعض فریقوں نے اس سے فائدہ بھی اٹھانا چاہا تھا، اس لیے سندھ و ملتان میں اس واقعۂ قتل کو اس زمانہ میں اسماعیلیوں کی طرف سے مزید برگشتگی پیدا کرنے کے لیے ان کی طرف منسوب کیا گیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں اور وہی افواہیں حقیقت بن کر قاضی منہاج کے کانوں میں پہنچی ہوں، اور انھوں نے اپنی تاریخ میں اس کو جگہ دے دی ہو۔ اس سلسلہ میں تعجب کی بات تو یہ ہے کہ مفسدین نے سلطان کے شہید کیے جانے میں حصہ لینے کے الزام سے اس عہد کے فاضل روزگار صاحب کمال امام فخر الدین رازی کے دامن کو بھی محفوظ نہ رکھا، اور یہ افواہ بھی پھیلائی گئی کہ امام موصوف کو اپنی جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا، ابن اثیر لکھتا ہے:-

> اہل غزنی میں سے بعض فتنہ پرداز اٹھے، اور انھوں نے ممالیک سے کہا کہ فخر الدین رازی نے تمھارے آقا کو قتل کیا ہے، اس لیے کہ انہی نے ان کو پہنچایا، جنھوں نے ان کو قتل کیا......... پس وہ (ممالیک) ان (رازی) کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، کہ ان کو قتل کر دیں، چنانچہ وہ فرار ہوئے اور وزیر موید موید الملک کے پاس پہونچے، اس کو صورت حالی سے باخبر کیا اور اس نے ان کو پوشیدگی کے ساتھ ان کی پناہ گاہ میں بھیج دیا۔[۱۵]

حالاں کہ سلطان شہید کے تعلقات امام موصوف سے شگفتہ تھے وہ ان کے علم و فضل کا قدر دان تھا، ان کی مجلس وعظ میں ہر ہفتہ التزام سے شریک ہوتا تھا، ایک مرتبہ انھوں نے سلطان کو اس کے دنیاوی جاہ و حشم پر بر سر منبر نصیحت کے چند کلمات کہے، جن سے وہ متاثر ہو کر آبدیدہ ہو گیا تھا، بایں ہمہ ان کے مخالف انھیں متہم کرنے سے باز نہ آئے، اور مشتعل مجمع کے خوف سے انھیں روپوش ہونا پڑا۔

عجیب کیا ہے کہ اس واقعۂ قتل کے اسماعیلیوں کی طرف منسوب ہو جانے میں لفظ

---

[۱۵] ابن اثیر ج ۲ ص ۸۳

فدائی کو بھی دخل ہو، جیسا کہ اوپر گزرا، کھوکھروں میں سے چند جوانوں نے سرفروشانہ طور پر قتل کی واردات کرنے کا عزم کیا تھا، اس لیے انھیں معنوی طور پر "فدائی" کہا گیا، اور اس زمانہ میں اسماعیلیوں کی وہ جماعت جو جان پر کھیل کر قتل کی واردات کرتی رہتی تھی، "فدائی" ہی کے نام سے موسوم تھی، اس لیے ممکن ہو کہ اس وصف مشترک کے باعث ان قاتلوں کی نامزدگی میں لوگوں کا ذہن اسماعیلیوں کی طرف منتقل ہو گیا ہو، کیونکہ مورخین نے بھی عام طور پر کھوکھروں کی اس قاتل جماعت کو "فدائی" کے لقب سے موسوم کیا ہو، بدایونی کہتا ہی "از دست فدائی کھوکھر" پھر آگے چل کر امام رازی کے واقعہ کے سلسلہ میں لکھتا ہی، کہ "از روئے حسد امام را بشرکت فدائیاں متہم داشتہ" جس سے بدایونی کی مراد ظاہر ہی کہ "فدائیان کھوکھر" ہی۔

ان حالات سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہی کہ واقعۂ قتل کی اصل ذمہ داری کھوکھروں ہی پر ہی، اور روایتہً و درایتہً یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کھوکھروں کو اس واقعہ کے ارتکاب سے بری سمجھا جا سکے، لیکن ان تمام قیاسوں کے باوجود جو اوپر پیش کیے گئے، یہ سمجھنا بھی صحیح نہ ہوگا، کہ اسماعیلی سرے سے اس جرم سے بری ثابت ہوتے ہیں، بلاشبہ وہ تنہا اس کے ذمہ دار قرار نہ پائیں گے، اس موقع پر اس کی تائید میں ابن اثیر کے بیان کا وہ حصہ خاص طور پر ہماری رہنمائی کرتا ہی کہ قاتلوں میں سے دو مختون تھے، اس لیے یہ خیال زیادہ صحیح ہو سکتا ہی کہ سندھ و ملتان کے بعض اسماعیلی فدائیوں نے کھوکھروں سے جو سلطان کے تازہ حملہ سے اس کے دشمن ہو گئے تھے، ساز باز کی ہو، اور سلطان کے شہید کرنے میں یہ دونوں شریک ہوں، اور قاتلوں میں سے گرفتار ہونے والوں میں وہ دونوں مختون اسماعیلی فدائی ہوں، خصوصًا اس لیے کہ ملاحدہ ساز باز کرنے اور قتل و خون ریزی کے خفیہ جرائم کرنے میں مشاق تھے انھوں نے اپنی تدبیروں سے کھوکھروں کے چند جانبازوں کو سلطان کے قتل کرنے پر آمادہ کر لیا ہو، اور اس کو کامیابی سے انجام دینے کی جو حکمت عملی بتائی گئی ہو، وہ ان ہی کے ہاتھوں نیار ہوئی ہو۔ اس لیے ہمارے خیال میں سلطان کے قاتل کی حیثیت سے ان دونوں جماعتوں کے جانبازوں کا نام لیا جانا زیادہ قرین صحت ہی، [illegible]

(ب) شہید کرنے کا سبب | سلطان کے شہید کرنے کی وجہ جیسا کہ اوپر گزرا یہی ہے کہ چونکہ سلطان شہید نے کھوکھروں کا استیصال کیا تھا، اس لیے ان میں کے چند نوجوانوں نے انتقام لینے کا فیصلہ کیا تھا، دوسری طرف وہ اسماعیلیوں پر پے درپے حملے کر چکا تھا، اور آئندہ بھی حملہ آوری کا قصد رکھتا تھا، اس لیے اسماعیلی فدائی بھی اس کے خون کے پیاسے تھے، اس لیے اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان ہی اسباب سے ان دونوں جماعتوں کے فدائیوں نے اس قتل میں حصہ لیا۔

(ج) مرقد | سلطان کے مرقد کے متعلق اس مقام "دھمک" کے دیہی لوگوں نے جس قبر کا نشان بتایا ہے وہ قطعی بے اصل ہے، اس لیے ڈپٹی کمشنر جہلم کے ذریعہ سے اس فرضی قبر کو آثار قدیمہ میں داخل کرانے کی سعی کرنا صحیح نہ ہوگا، کیونکہ تمام مورخین کا بیان بلا اختلاف یہی ہے کہ سلطان کی لاش غزنی لے جائی گئی ان تاریخوں میں جن کے حوالے اوپر گزرے ہیں، اس کی لاش کے مقتل سے غزنی تک پہونچنے کی مفصل روداد مع مختلف تصریحات کے موجود ہیں اگر یہ تصریحی روایتیں موجود نہ بھی ہوتیں تو بھی یہ عقل و درایت سے دور ہے، کہ لوگ اپنے عہد کے ایک ایسے جلیل القدر فرمان روا کو اثنائے راہ میں دفن کر کے آگے بڑھ جائیں، اس لیے وہ تربت جو دھمک میں سلطان شہاب الدین کی بتائی جاتی ہے قطعی جعلی ہے۔

(د) مقتولوں کی تعداد | جیسا کہ اوپر گزرا ہے حملہ آوروں نے پہلے ایک چوبدار کو مار ڈالا، پھر سلطان کو شہید کیا، یہ کوئی فوجی چھاپہ نہ تھا بلکہ فریب سے سلطان کو شہید کرنے کی ایک سازش تھی جو کامیاب ہوگئی۔

(ہ) مقتل | سلطان شہاب الدین کا مقتل تمام مورخین کی تصریح کے مطابق لاہور و غزنین کے درمیان دریا کے کنارے واقع ہے، اس مقام کا نام فارسی و عربی تاریخوں میں "دمیک" آیا ہے چنانچہ ایک قطعہ میں ہے۔

---

[۱] تاریخ فرشتہ ج ۱، ص ۶۰، سنہ ۵ ھ ص ۲۲۸

شہادت ملک بحر و بر (معز الدین ناصری / شہاب الدین بدایونی) | کز ابتدائے جہاں (شہ ناصری / ہم بدایونی) از دنیا مثیل

سوم ز غرہ شعبان بسال شش صد و دو | فتادہ در رہ غزنین بمنزل "دمیک"

فرشتہ میں اس مقام کا نام "برمہیک" چھپا ہے۔ اس کے نسخہ میں طباعت کی غلطیاں معلوم ہیں لیکن جس دریا کے کنارے یہ واقعہ پیش آیا، اس کے نام مورخین نے مختلف لکھے ہیں، فرشتہ میں اس کا نام "نیلاب" ہے۔ یہ اس زمانہ میں دریائے سندھ کا معروف نام تھا۔ اس لیے اس کے بیان کے مطابق دمیک "دریائے سندھ" کے کنارے واقع تھا، ابن اثیر اور دوسری تاریخوں میں دریا کا نام "جیحوں" مندرج ہے لیکن جیحوں لاہور اور سندھ کے درمیان واقع نہ تھا۔ وہ افغانستان کی موجودہ شمالی سرحد کے اس پار رواں ہے، اس لیے گمان ہے کہ جیحوں "جہلم کے بجائے درج ہو گیا ہو، اس زمانہ میں اس کو آب جہلم و آب بہت کہتے تھے، ابن اثیر کے لیے یہ نام غیر معروف تھا، اس نے جہلم کے بجائے جیحوں لکھ دیا ہو، مغربی مورخین نے بھی اس کو جہلم ہی قرار دیا، چنانچہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی تاریخ ہند حصہ اول میں جو فارسی تاریخوں اور مغربی مصنفین کی کتابوں سے مرتب کی گئی ہے لکھتے ہیں۔

اس مہم کے بعد سلطان واپس جا رہا تھا، اور جہلم کو عبور کر چکا تھا کہ ..... (جلد ۱ ص ۱۳۲)

اس سے یہ غیر مشتبہ طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ دمیک دریائے جہلم کے کنارے آباد تھا، جہاں یہ واقعہ شہادت پیش آیا، ضلع جہلم کے گاؤں "دھمک" کے جو جغرافی حالات مستفسر نے لکھے ہیں، ان میں یہ تصریح نہیں کہ یہ مقام دریا کے کنارے آباد ہے، اگر وہ لب دریا واقع ہے تو تاریخی شہادتوں سے اس روایت کی جو سینہ بسینہ آ رہی ہے، تصدیق ہوتی ہے۔ "دھمک" کا فارسی و عربی میں "دمیک" ہو جانا یا دمیک کا سات آٹھ سو برس گزرنے "دھمک" بن جانا کچھ بعید از قیاس نہیں، اگر دھمک میں وہ فرض، تو بیشک لب دریا واقع ہو تو اس سے [illegible]

کہ شاید وہی مقام ہو جہاں اس منزل میں سلطانی قافلہ اترا ہو، اور اسی جگہ یہ واقعۂ قتل پیش آیا ہو، اور لوگوں نے یادگار کے لیے کوئی نشانی قائم کی ہو جو اب تربت کی شکل میں منتقل ہوگئی ہو۔

موضع دھمک کے متعلق کچھ مزید معلومات

مذکورۂ بالا مباحث کے شایع ہونے کے بعد جناب محمد اسلم خاں صاحب (ریجرالہ ضلع جہلم) کا ایک دوسرا مکتوب آیا جس میں موضع دھمک کے متعلق جو سلطان کی قتل گاہ میں متعین ہوا، کچھ مزید معلومات تھے یہ مقالہ معارف ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۴ء میں شایع ہوا، اس سلسلۂ گفتگو میں اس کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں وہ فرماتے ہیں۔

"آپ کے مقالہ کو پڑھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوئی ہے۔ تمام مطلوبہ سوالات کے جوابات تسلی بخش پائے جس سے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، ایسے علمائے کرام کی اس زمانے میں کمی نہیں ہے، جو کسی لاینحل مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل نہ کر سکیں، لیکن ایسے بزرگ اس زمانہ میں عنقا کی حیثیت رکھتے ہیں جو مسائل کی ہر پہلو سے مدد کرتے ہوں، جس محنت شاقہ اور عرق ریزی سے آپ نے مستند حوالہ جات سے جواب مرتب کیا ہے، جناب کی اس بندہ نوازی و علم پروری کا تہ دل سے ممنون ہوں،

مقتل سلطان شہاب الدین نور اللہ مرقدہٗ واقعی یہی موضع دھمک ہے جو سوہاوہ اسٹیشن کے متصل بجانب شمال بفاصلہ تین میل تحصیل و ضلع جہلم میں ہے، تاریخ جہلم سنہ ۱۸۸۰ء میں لکھی گئی ہے اس میں ضلع کے سب دیہاتوں کی فہرست بھی شامل ہے، لیکن بجز اس موضع مذکور کے اس نام کا کوئی اور قریہ اس ضلع میں موجود نہیں، اس وقت ضلع میں مندرجۂ ذیل تحصیلیں تھیں، جہلم، چکوال پنڈ دادنخان، تلہ گنگ، اب آخری تحصیل کو جہلم سے الگ کرکے اٹک سے ملحق کر دیا گیا ہے، اور بھیرہ دریائے جہلم کے کنارے ہے، جو گاؤں آباد ہیں ان میں اس نام کا کوئی دوسرا گاؤں نہیں ملا۔

موجودہ وقت میں دریائے جہلم دھمک سے بہ فاصلہ سات کوس گزرتا ہے اگر آج سے قبل ساڑھے سات سو برس ایک اجنبی مورخ اس کو کنارہ دریا لکھتا ہے۔ تو کوئی تعجب کا مقام نہیں جب کہ کوئی اور مشہور قابل تخصیص جگہ نہ ہو تو اسے دھمک کنارۂ دریا لکھ دیا تو کوئی تعجب نہیں، نیز دھمک کے بالکل قریب سے ایک بڑا پرنالہ گزرتا ہے جو دریائے جہلم کا معاون ہے، بہرصورت سلطان موصوف کو یہیں شہید کیا گیا۔ دھمک کے بالکل قریب ایک راستہ، غوروں کے بھیڑ، کے نام سے اب تک مشہور ہے "بھیڑ" پنجابی میں پشتہ یا ٹیکہ کو کہتے ہیں، مقام تعجب ہے کہ اب تک اس کا نام غوروں کا بھیڑ چلا آتا ہے، حالانکہ مقامی لوگ غوروں سے ناواقف ہیں۔

سلطان کا نام | سلطان کے مقتل و مرقد پر مقالہ شائع ہونے کے بعد ہی ہمارے لائق دوست جناب ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی پروفیسر کالج کا ایک استدراک بھی شائع ہوا، اس میں انھوں نے بعض مزید امور پیش کئے، اور اس سلسلہ میں کچھ مزید باتیں کہی گئیں اس استدراک اور اس کے جواب کے بعض حصے بھی یہاں نقل کئے جانے کے لائق ہیں، فرماتے ہیں:۔

"معارف جون ۴۳ء (ص ۴۶۴ تا ص ۴۶۷) میں ایک مفید اور طویل مقالہ بعنوان "سلطان شہاب الدین کے قاتل، مقتل، مرقد" کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا، جو دراصل ایک استفسار کے جواب میں ادارۂ معارف کی طرف سے علمی رنگ میں جواب ہے اور جس احسن طریق سے ادارہ نے فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے، وہ ضرور قابل ستائش ہے، اس سلسلہ میں مجھے بھی بعض بعض مقام پر اس ادارہ کے نوٹ پر کسی قدر، مزید توضیح کی ضرورت محسوس ہوئی، اسلامی تاریخ ہند میں یہی ایک اہم دور ہے، جب کہ صحیح طور پر اسلامی سلطنت ہند کے قیام کا آغاز ہوتا ہے جس کا تمام سہرا سلطان شہید معز الدین محمد بن سالم

یہ سہرا ہی جس نے اپنے پیشرو سلطان محمود غزنہ کی فتوحات کو مزید قوی بنیادوں پر مستحکم کرکے اسلامی سلطنت ہند کا قیام کیا جو ابھی تک نہیں ہوا تھا،

سلطان شہاب الدین غوری کا نام عام طور پر ہندوستانی فتوحات کے ضمن میں سلطان معزالدین محمد ابن سام غوری بیان ہوا ہے اور یہی بواسطہ طبقات ناصری کتبات اور سکوکات میں بھی میسر آتا ہے، بلکہ آپ کے جانشین سلاطین کو بقول منہاج سراج مصنف طبقات ناصری نے "سلاطین معزیہ" سے تعبیر کیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ اول الذکر نام سے آپ کو پکارتے ہی نہیں تھے، بلکہ ہر دو صحیح ہیں"

ہمارے لائق دوست نے اس موقع پر سلطان کا نام "معزالدین محمد" قرار دیا ہے، اسی طرح وہ سمجھتے ہیں کہ شہاب الدین بھی ان کا نام ہے۔ سلطان کے نام کے متعلق عام طور پر لوگوں کو التباس ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ سلطان کا نام تو محمد ہے اور معزالدین اور شہاب الدین نام نہیں، دونوں لقب ہیں جو کثرت استعمال سے اجزائے نام بن گئے ہیں، مورخین اس سلطان کو ان دونوں لقب سے یاد کرتے ہیں، سلطان شہاب الدین کا یہ لقب ۵۶۹ھ ۱۱۷۳ء میں فتح غزنین کے بعد وہاں کی حکومت سپرد ہوتے وقت سلطان غیاث الدین کی جانب سے اس کو عطا کیا گیا تھا؛ بدایونی میں ہے،

"سلطان غیاث الدین آن ولایت غزنین را در حیز تسخیر آوردہ ...... و سلطان معزالدین محمد را لقب سلطان شہاب الدین داد[1]"

اور معزالدین کا لقب اس سے پہلے ایک دوسرے موقع پر اس کو مل چکا تھا[2]

کیا سلطان کا مرقد غزنین نہیں ہے؟ اس کے بعد ہمارے لائق دوست نے "فتوحات فیروز شاہی" کے ایک اقتباس سے دہلی کو سلطان کے مرقد ہونے کا امکان دکھایا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ امر متفق علیہ ہے کہ سلطان معزالدین کو غزنین جاتے ہوئے دریائے جہلم کے کنارے رات کے وقت اسی کے خیمہ میں دمیک گاؤں میں شہید کر دیا گیا، اور اس کی نعش

---

[1] منتخب التواریخ ج ۱ ص ۴۷ [2] طبقات ص ۱۲۳ و ۱۲۰

کو اس کے ہمراہیوں نے منزل مقصود غزنین پہنچا دیا[۱]۔ اس واقعہ کے قریب ڈیڑھ سو سال بعد جب سلطان فیروز شاہ تغلق ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء میں دہلی کی سلطنت پر متمکن ہوا، تو اس نے اپنے عہد کے متعلق ایک مفید یادداشت بعنوان "فتوحات فیروز شاہی" مرتب کی جو شایع ہو چکی ہے، اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی شایع ہو چکا ہے، اس میں جہاں دہلی کی عمارات کا ذکر ہے، وہاں وہ لکھتا ہے:-

"و مقبرہ سلطان معز الدین سام را کہ دیوار غربی و تختہ ہائے او کہنہ فرسودہ شدہ بود ہم نو کردہ آمد بجائے ...... در ہا و طاقہا زینہا از چوب صندل ساختہ[۲]"

اس تحریر کی موجودگی میں انسان ذرا تامل کرنے لگتا ہے، جہاں تک راقم کے ذاتی علم کا تعلق ہے ابھی تک کوئی ایسی تحریر نظر سے نہیں گزری کہ جس میں یہ پایا جائے، کہ سلطان معز الدین محمد بن سام کا مزار غزنہ میں ہے، یا کسی نے اپنے مشاہدات کی بنا پر اس کو بیان کیا ہو جیسا کہ ہم اکثر سلطان محمود غزنہ و بابر بادشاہ وغیرہ کے متعلق پڑھتے اور سنتے ہیں کہ ان کے مزار ادھر موجود ہیں، اگر کسی صاحب کو علم ہے تو روشنی ڈالیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فتوحات فیروز شاہی کی مذکورہ بالا عبارت شہاب الدین کے مرقد پر گفتگو کرنے میں بلا شبہ نظر انداز کرنے کے لائق نہیں، ہمارے لائق دوست شکریہ کے مستحق ہیں کہ اس سلسلہ کی اہم کڑی نگاہوں کے سامنے لے آئے۔

سلطان شہاب الدین کی لاش کے متعلق فرشتہ کی یہ تصریح موجود ہے کہ وہ غزنین لے جا کر اس کٹہرے میں دفن کی گئی جس کو اس نے اپنی لڑکی کے لیے بنوایا تھا چنانچہ لکھتا ہے:

"القصہ بتاریخ بیست و دوم شہر شعبان نعش سلطان شہاب الدین را بغزنین رسانیدہ در خطیرہ کہ برائے دختر خود ساختہ بود دفن کردند[۳]"

---

[۱] طبقات ناصری ص ۱۲۴، ترجمہ ایلیٹ ص ۲۹۷[۲] بعض کو مقبرہ سلطان معز الدین بہرام شاہ بن سلطان شمس الدین التمش [۳] تاریخ فرشتہ ص ۶۰

اس لیے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس کی تدفین غزنین میں عمل میں آئی۔
اب فتوحات فیروز شاہی کی مذکورۂ بالا عبارت کے دیکھنے کے بعد دو قیاس سامنے آسکتے ہیں، یا تو جیسا کہ موصوف نے گمان ظاہر کیا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو برس کے اندر اس کے کسی قدر دان کے ہاتھوں اس کی لاش غزنین سے منتقل کر کے ہندستان لائی گئی ہو، یا پھر یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ جب سلطان شہاب الدین نے ۵۸۷ھ میں دلی فتح کی، اس کے بعد ۵۹۲ھ میں جب اس نے دلی میں "جامع مسجد" قوت الاسلام تعمیر کی تو اس کو ہندستان سے جو دلی تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے باعث اس نے اپنی ابدی خواب گاہ کے لیے بھی اسی سرزمین کو پسند کیا ہو، جیسا کہ بعض سلاطین کرتے رہے ہیں، اُس نے بھی اپنی زندگی میں اس مسجد کے پہلو میں اپنے مقبرے کے لیے عمارت تعمیر کرائی ہو، چنانچہ فتوحات فیروز شاہی میں اس مقبرہ کا ذکر اس کی تعمیر کردہ "مسجد جامع" اور اس کے "مینار" کے درمیان آیا ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ مقبرہ کی یہ عمارت بھی اسی کے آس پاس ہوگی۔
یہ تو صحیح ہے کہ موجودہ زمانے کے سیاحوں میں سے کسی نے شاید ہی اپنا مشاہدہ بیان کیا ہو کہ اس نے غزنین میں اس سلطان کے مزار کی زیارت کی ہے چنانچہ ابھی حال میں، حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے اپنے سفر غزنین کے مشاہدات معارف بابت ماہ مئی ۱۹۳۴ء میں شایع فرمائے تھے۔ حضرت موصوف کا یہ سفرنامہ بھی غزنین میں سلطان شہاب الدین کے مزار کے موجود ہونے کے ذکر سے خالی ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس سفرنامہ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں قدیم غزنین کا وجود خاک کے ایک تودہ سے زیادہ باقی نہیں رہا صرف سپہ سالار حبیب اللہ خاں کی توجہ فرمائی سے سلطان محمود سبکتگین اور چند دیگر مشاہیر کے مقبروں پر کتبے نصب ہو سکے ہیں ورنہ اب درحقیقت پرانے غزنین کا نام و نشان تک بھی مٹ چکا ہے۔ اس تصریح سے کم سے کم یہ متعین طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ سلطان شہاب الدین کو جس خطیرہ (کٹہرے) میں دفن کیا گیا تھا وہ اب نامعلوم و مخفی

نہیں رہا ورنہ وہ ایک نکتہ رس عالم تاریخ سیاح کی متجسس نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکتا تھا، ـــ لیکن دوسری طرف دلی کے آثار قدیمہ میں بھی کوئی مقبرہ سلطان شہاب الدین کی طرف اس زمانہ میں منسوب نہیں کہ اس کی لاش کو غزنین سے دلّی میں منتقل کرکے لانے کے گمان کی تصدیق کلیتہً کی جاسکے، اس لیے تاوقتیکہ کچھ مزید تاریخی شہادتیں ہم دست نہ ہوں، اس موضوع پر کسی فیصلہ کن رائے تک پہنچنا آسان نہیں ہے اور بظاہر فرشتہ کے بیان کے مطابق یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ غزنین ہی میں اس کی تدفین عمل میں آئی اور وہی اس کا اصل مرقد ہے۔

(جون ۱۹۴۳ء)

مملوک سلاطین دہلی

۶۰۲ھ ——— ۶۸۹ھ
۱۲۰۶ ——— ۱۲۹۰

شہاب الدین غوری کی اچانک شہادت سے ہندستان میں اس کے فوجی افسر ایک نازک صورت حال سے دوچار ہوئے۔ قطب الدین ایبک اس کا نائب السلطنت تھا، اور یہ ملک تین خصوں یعنی پنجاب، شمالی ہند، اور سندھ میں بٹ کر غزنی کے ماتحت تھا اور ملک کی مختلف سمتوں میں یہاں کی قدیم سلطنتوں کے حکمران اپنے مورچے سنبھالے ہوئے تھے، جیسا کہ اوپر گزرا شہاب الدین کے اولاد نرینہ نہ تھی، اُس کا بھتیجا سلطان غیاث الدین محمود غور کا مالک تھا، مگر اس میں رہنمائی کی طاقت نہ تھی، اور خوارزمیوں کے اُٹھتے ہوئے طوفان سے وہ غور و غزنی کو بھی بچانے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس کے تین ترک غلام فوجی گورنروں میں تاج الدین یلدز کرمان و سنکران کا جو افغانستان سے بالائی سندھ کی راہ پر واقع ہیں، مالک تھا، غزنی کا مالک بنا اور اس لحاظ سے اس نے اپنے آپ کو ہندستانی صوبوں کو اپنے ماتحت تصوّر کرنے کا مستحق سمجھا مگر اس کے داماد ناصر الدین قباچہ تنک نے اس کے اس استحقاق کو تسلیم نہیں کیا اور قطب الدین ایبک کے لیے اس کا قبول کرنا زیادہ بعید از تصوّر تھا اس لیے شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد ہی غزنی سے ہندستان کا رشتہ ٹوٹ گیا اور یہاں اس کے نام لیوا غلاموں کی آزاد سلطنت کی بنا قائم ہوگئی۔

۲۔ سلطان قطب الدین ایبک | ۶۰۲ھ ۱۲۰۶ — ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ | شہاب الدین غوری کا نامور ترک سپہ سالار تھا، وہ ہندستان میں اسلامی مساوات و اخوت کا روشن منارہ تھا۔ وہ غلاموں کی صف سے نکل کر سلاطین کے تخت پر بیٹھا اور اس کے بعد غلام و غلام سلاطین دلی کے تخت پر بیٹھتے گئے، قطب الدین پہلی مرتبہ

ترکستان سے نیشاپور میں لایا گیا تھا۔ یہاں کے امام اعظم ابو حنیفہ کے اخلاف میں سے
ایک صاحب علم فخر الدین عبد العزیز کوفی قاضی القضاۃ کے منصب پر سرفراز تھے،
انھوں نے اس بچّہ کو خرید کر اسے اپنی اولاد کے ساتھ مکتب میں بٹھایا جس میں اس
نے علوم کی تحصیل کی، اور شہسواری اور تیر اندازی کے فنون سیکھے۔ قاضی صاحب کی
وفات کے بعد ان کے بیٹوں میں سے کسی نے اس کو فروخت کیا، اور ایک سوداگر نے
اس کو سلطان شہاب الدین غوری کے دربار میں گرانقدر قیمت لے کر فروخت کیا
اور یہیں وہ اپنی ٹوٹی ہوئی کف انگلی کی وجہ سے ایبک سے مخاطب کیا گیا۔ وہ اپنے
آقا کا جان نثار تھا اور غوری کو بھی اس پر غیر معمولی اعتماد تھا، ترائن کی لڑائی کے
بعد کھاندور کی لڑائی میں اٹاوہ کے قریب قنوج کے راجہ جے چند کی آنکھ میں جب تیر
لگا، اور وہ کام آیا تو پھر ایبک کی راہ روکنے والا کوئی موجود نہ تھا۔ بنارس تک
اس نے قبضہ کر لیا، اور بے شمار دولت ہاتھ آئی، اسی موقع پر شہاب الدین نے
"ہندستان" کی حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دی۔ کالنجر کی فتح کے بعد چندیلی
راجاؤں کے پایہ تخت مہوبا پر قبضہ کیا، پھر میرٹھ ہوتا ہوا راجہ گوبند رائے کی راجدھانی
دلی میں پہنچا، جو غوری کی اطاعت قبول کرنے کے بعد منحرف ہو چکا تھا، اس کو نئے
سرے سے فتح کیا پھر اس نے راجہ بھروچ سے اجمیر، راجہ بھیم دیو سے نہروالے لیا
اور راجپوتوں کی آخری جتھا بندی کو توڑا، اور پھر ملکی انتظام میں مصروف ہو گیا
سلطان شہاب الدین غوری نے آخری سفر ہند کے موقع پر ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں اس کو
"ملک" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

سلطان شہاب الدین غوری کے دور تک یہ اس کا غلام تھا، اس کو رسمی آزادی
اس وقت ملی، جب کہ شہاب الدین غوری کے شرعی وارث اور شاہ غور سلطان
غیاث الدین محمود نے اس کو بہ روایت یوم سہ شنبہ ۸ ذی قعدہ ۶۰۲ھ اور
بہ روایت ۶۰۵ھ/۱۲۰۸ء میں "چتر و امارت بادشاہی و خطاب سلطانی و خط آزادی"
عطا کیا۔ اور سلطان ایبک کے لقب سے لاہور میں اس کی تخت نشینی کی رسم انجام

پائی اس کے بعد اپنا پایۂ تخت لاہور سے ہندستان کے قلب اور اس کی پرانی راج دھانی میں لے آیا اور وہی سلاطین دہلی میں سے پہلا سلطان قرار پایا دہلی کی سلطنت بھٹنڈے سے لکھنوتی تک تقریباً ایک ہزار میل طویل اور تقریباً پانسو میل عریض یعنی ۴ ½ لاکھ مربع میل کے رقبہ میں تھی، بنگال و بہار کو اگرچہ اختیارالدین محمد بن بختیار خلجی نے فتح کیا تھا اور وہ اس پورے علاقہ کا صوبہ دار اعلیٰ تھا لیکن اس نے نظم قائم رکھنے کے لیے دلی سلطنت کی سیادت قبول کرلی تھی اور خود قطب الدین سے ملنے دلی آیا تھا، ایبک کا دوسرا حریف بہاءالدین طغرل جو بیانہ اور گوالیار کا فاتح تھا۔ اس کی موت سے وہ علاقہ بھی اس سلطنت کا حصہ بن چکا تھا اگرچہ اس کی زندگی کے آخری دور میں بختیار خلجی کا حادثۂ قتل پیش آیا اور لکھنوتی کو نئی سیاسی صورت حال سے سابقہ کرنا پڑا جس کو سلجھانے کا ایبک کو موقع نہ مل سکا تھا۔ قطب الدین ایبک نے ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں لاہور میں چوگان کھیلتے ہوے گھوڑے سے گر کر وفات پائی اور وہیں اس کا مزار ہے۔

قطب الدین ایبک وہ پہلا سلطان ہے جس نے ہندستان کو اپنا دیس سمجھا، اس کے لیے روئے زمین پر کوئی ایسا دوسرا ملک نہ تھا جس سے اس کا وطنی رشتہ قائم رہ گیا ہو۔ وہی پہلا سلطان ہے جو ہندستان کے پایۂ تخت کو وسط ایشیا کے اٹھا کر دلی میں لایا، اسی نے پنجاب کو جو ہندستان سے مستقل طور پر علیحدہ ہوکر غزنی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا، دوبارہ ہندستان میں ملایا، اسی لیے اس نے اپنی تاج پوشی کی رسم لاہور میں منائی اور وہی فرمانروا تھا، جو راجہ ہرش کے بعد پشاور سے بنگال تک کی سرزمین کو ایک چتر کے سایہ میں لے آیا وہ اب ترکستانی اور غوری نہ تھا، ہندستانی تھا، ترکستان اور غور اس کے لیے اسی طرح غیر تھے، جیسے راجہ ہرش اور اس کے اجداد کے لیے روس کے گھاس کے میدان وہ راجہ ہرش ہی کے نقش قدم پر چلا، اور اس نے اس ملک سے طوائف الملوکی کا خاتمہ کیا اور نہروالہ سے لکھنوتی تک کے باشندے ایک ملک اور ایک سلطنت کے

شہری کہلائے۔

ایبک کا عہد حکومت سلطان ایبک فطرتاً نیک سرشت، سخی اور عدل پرور
تھا اور بے دریغ انعام و اکرام سے لوگوں کو مالا مال کرتا اس کی سخاوت ضرب المثل
تھی، "لکھ بخش" (لاکھ کا بخشنے والا) اس کا لقب مشہور ہوگیا تھا، اس نے نہ
صرف ہندستان میں شہاب الدین غوری کی نیابت کی بلکہ اپنے خسر تاج الدین یلدز
کو غزنی کے تخت سے برطرف کرکے چالیس روز وہاں حکمرانی کی۔ اور اپنی داد و دہش سے
وہاں بھی نام آوری حاصل کی، اس نے دہلی کی تسخیر کے بعد بیس سال تک حکمرانی کی
جن میں آخر کے چار سال چند مہینوں میں صاحب چتر و تاج و تخت رہا، اس کی قلمرو میں
اس کے نام کا سکہ و خطبہ جاری رہا۔ اس نے رعایا کے درمیان عام ہر دلعزیزی حاصل کی
اور لوگوں کے دلوں میں اس کے عہد حکومت کی خوشگوار یاد مدت دراز تک باقی رہی۔

ایبک کے دور کے ممتاز اکابر قطب الدین نیشاپوری کی درس گاہ میں علوم
کی تحصیل کر چکا تھا، اس کا دربار علم و ادب کا مرکز تھا۔ مشہور ادیب و شاعر
بہاء الدین محمد اوشی اور جمال الدین محمد نصیر کے قصیدے اور بعض اشعار
تذکروں اور سیاسی تاریخوں میں موجود ہیں، جن میں ایبک کے جود و سخا، شجاعت
فیاضی اور عدل پروری کو والہانہ انداز میں قلم بند کیا گیا ہے، شیخ صدر الدین
محمد بن حسن نظامی نیشاپوری جو اپنے زمانہ میں انشاء و تاریخ و سیر کا امام سمجھا جاتا
جاتا تھا ایبک کے دامن دولت سے وابستہ تھا، اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب
تاج المآثر جو ملوک سلاطین دہلی پر سب سے پہلی کتاب ہے، ایبک ہی کے حکم
سے ۶۰۲ھ میں لکھنی شروع کی جس میں ۵۸۷ھ سے ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء یا ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء تک کے وقائع
قلم بند کئے گئے ہیں، اسی طرح اس عہد کے دوسرے ممتاز اعیان و علماء میں شیخ
احمد بن علی ترمذی متوفی ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء قاضی حمید الدین علی بن عمر محمودی اور قاضی
وجیہ الدین کاشانی وغیرہ تھے، بعض اہل علم صاحب سیف بھی تھے، چنانچہ شیخ
محمد بن احمد مدنی (مولود ۵۸۱ھ/۱۱۸۵ء متوفی ۶۷۷ھ/۱۲۷۸ء) جنھیں التتمش کے دور میں غیر

معمولی عزت و اکرام حاصل ہوا، ایک کے دور کے صاحب سیف فاتح تھے، کڑا مانک پور اور ہنسوہ وغیرہ کے قلعے انہی نے فتح کئے تھے، اسی طرح شیخ قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی معروف بہ قاضی قدوہ متوفی ۶۰۵ھ/۱۲۰۸ء کے فوجی خدمات کے فشانات اودھ کے ۵۲ گاؤں میں آج بھی شہرت رکھتے ہیں ان کے صاحب زادے اعز الدین عہدۂ قضا پر سرفراز تھے۔

شمالی ہند میں مسلمانوں کے اس ابتدائی دور میں اسلامی علوم وفنون کا ایسا عام چرچا ہوگیا تھا کہ یہاں کے ایک نومسلم صاحب علم نے روایت حدیث میں ایک خاص قسم کی شہرت حاصل کی، ان کا ذکر فن رجال (جس میں حدیث کے راویوں کی سوانح عمری اور جرح و تعدیل ہوتی ہے۔) کی بیشتر اہم کتابوں میں آیا ہے، سرباتک ہندی متوفی ۳۳۳ھ کی طرح اس زمانہ میں شیخ ابو الرضا رتن بن کرپال بن رتن ہندی کو شہرت حاصل ہوئی ان کا ذکر صلاح الکتبی، امام ذہبی، علامہ ابن حجر عسقلانی، صلاح صفدی۔ امام صنعانی اور صاحب بحر زخار نے تفصیل سے کیا ہے رتن بھٹنڈہ میں پیدا ہوئے اور قبول اسلام کے بعد ارباب خیر وصلاح میں شمار کئے گئے عمر طبعی سے بہت زیادہ سن پایا، ان کی اس روایت کا عام چرچا پھیلا کہ وہ عہد رسالت میں موجود تھے ایک مرتبہ وہ تجارت کے سلسلہ میں حجاز گئے ہوئے تھے، ایک موقع پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کے منصب رسالت پر فائز ہونے سے پہلے ملے۔ دوسری مرتبہ نبوت کے بعد انھیں زیارت کا موقع ملا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں عمر کی درازی کی دعا دی اور بعض باتیں ارشاد فرمائیں۔ جب ان روایتوں کی شہرت عالم اسلام میں پہونچی تو بڑے بڑے ائمہ فن ان سے ملنے، روایتیں لینے اور تحقیق حال کرنے کے لیے ہندستان آئے، اور ان کی تصدیق یا تکذیب کی اور یہ فن رجال کا ایک مستقل موضوع بن گیا، اور رجال کی مشہور کتابوں میں یہ جرح و تعدیل ضبط ہیں، اور ائمہ فن نے اپنے محاکمے لکھے ہیں انھوں نے ۶۰۰ھ کے بعد وفات پائی، اور بھٹنڈہ میں مدفون ہوئے

علامہ نظام الدین فرغانی فقہ و اصول کے ماہرین میں سے تھے، ہندستان میں تشریف لائے قسمت نے اس کو بنگال سے وابستہ کیا، محمد بن بختیار خلجی نے ان کی قدردانی کی اور بنگال میں ان کے وجود سے علم کا چراغ روشن رہا۔

<u>صلحائے امت</u> | ایبک کے عہد حکومت کو صلحائے امت میں سے ہندستان کے سرتاج مشائخ حضرت خواجہ سید معین الدین حسن بن حسن چشتی سنجری اجمیری قدس سرہ کی ذات بابرکات کے وجود گرامی کا شرف حاصل ہے، حضرت خواجہ سجستان میں ۵۳۷ھ میں پیدا ہوئے ۱۲، ۱۵ سال کی عمر میں سایہ پدری سر سے اٹھ گیا انگور کا باغ اور ایک پن چکی وراثت میں پائی، کسی مجذوب حال کا باغ سے گزر ہوا اور حضرت خواجہ پر جذب ربانی طاری ہوگیا ترک علائق کر کے حق کی طلب اور جستجو میں اٹھ کھڑے ہوئے سجستان سے سمرقند تشریف لے گئے، قرآن پاک حفظ کیا علوم کی تحصیل فرمائی پھر مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے قریہ ہارون میں حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور شیخ کی خدمت میں اپنی زندگی کے بیس سال گزار دیئے انہی کی معیت میں دیار اسلامی کی سیاحت کی، اور شیخ نے خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا، پھر مختلف مقامات پر اس دور کے ممتاز صالحین امت شیخ نجم الدین کبری، حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی، حضرت شیخ جلال الدین تبریزی وغیرہ اکابر وقت کی صحبت سے فیض یاب ہوئے، آخر میں مدینہ منورہ میں حاضری دینے کے بعد ہندستان کا رخ فرمایا۔ اور لاہور میں آکر حضرت شیخ ہجویری اور حضرت حسین زنجانی کے مزار پر چلہ کش ہوئے پھر ملتان میں تشریف لائے، اور یہاں پانچ برس قیام فرما کر ہندستان کی زبان سنسکرت یا پراکرت سیکھی اور پھر وہاں سے دہلی تشریف لائے اور یہاں سے اجمیر کا قصد فرمایا، اور ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء یا ۵۶۲ھ/۱۱۶۷ء سے وہاں مستقل توطن اختیار فرمایا اس وقت تک یہ مقامات پرتھوی راج کے قبضہ میں تھے مسلمان کشورکشاؤں کے زیر نگین نہیں آئے تھے، مگر ان مرکزی شہروں میں حضرت خواجہ کے فیض صحبت سے اسلام کی روشنی

پھیلی اور توحید اسلام کا نام لینے والوں کی ایک جماعت تیار ہوگئی، خصوصاً اجمیر میں ایک خلق کثیر حلقہ بگوش اسلام ہوگئی جن میں پرتھوی راج کے چند خاص شاہی عمال بھی تھے، جس کی وجہ سے اجمیر کے ارباب حکومت میں سراسیمگی پھیلی اور عمال حکومت حضرت خواجہ کے درپے آزار ہوئے اور اجمیر سے انھیں جلا وطن کرنا چاہا، دوسری طرف دھرم شاستر کے ماننے والے جوگیوں نے یوگ کی تپشیا اور منتقوں سے جو طاقت حاصل کی تھی اس کو حضرت اجمیری کے خلاف استعمال کرتے رہے اور تصوف و سلوک کی ریاضت مجاہدہ اور یوگ کی تپشیا اور منتقوں سے حاصل کی ہوئی قوتوں میں جو معرکہ آرائی ہوئی اس میں حضرت خواجہ اجمیری کو کامرانی حاصل ہوئی اور جوگیوں کے زیر ہونے کے بعد ایک کثیر خلقت اسلام کی آغوش میں آگئی، اسی اثنا میں سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۸ھ ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی کی سلطنت کو قطب الدین ایبک کے سپرد کیا، اور اجمیر کی ولایت پر سید وجیہ الدین مشہدی مامور کیے گئے، جن کی صاحبزادی سے حضرت خواجہ کا عقد نکاح انجام پایا، اور یہ مسلم حکمران خاندان بھی حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں میں داخل ہو گیا اور حضرت خواجہ کے روحانی فیوض و برکات کے ساتھ سیاسی اقتدار سے اسلام کو اس دیار میں مزید تقویت حاصل ہوئی۔

حضرت خواجہ کا وجود گرامی ہندوستان میں روحانی فیوض و برکات کا ایسا مینار ثابت ہوا، جس سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں روشنی پہنچی اور لاکھوں بندگان خدا نے ہدایت حاصل کی، سلسلۂ چشتیہ کا فیض حضرت والا ہی کے توسط سے پہلی مرتبہ ہندوستان میں عام ہوا، اور آج بھی اس کے انوار اقدس سے ہندوستان میں روحانیت کا نظام قائم اور ارباب بصیرت کے لیے اس کے چپہ چپہ میں درخشانی موجود ہے حضرت خواجہ ۶۲۷ھ ۱۲۳۰ء یا بہ روایت ۶۳۳ھ ۱۲۳۶ء یا ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء میں واصل بحق ہوئے، اور اجمیر کی درگاہ ابھی زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت خواجہ اجمیری کی طرف تین کتابیں انیس الارواح، رسالہ در کسب نفس اور دلیل العارفین منسوب ہیں، اول الذکر میں حضرت خواجہ عثمان ہارونی

کے ملفوظات ہیں جن کو غالباً حضرت خواجہ اجمیری کے کسی مرید نے ان سے سن کر یکجا
کیا ہے اور دلیل العارفین میں خود حضرت خواجہ اجمیری کے ملفوظات ان کے ارشد
خلیفہ حضرت بختیار کاکی نے یکجا کئے ہیں اور یہ کتاب اہل صلاح میں متداول ہے
حضرت خواجہ اجمیری کی طرف سیدنا حضرت حسینؓ کی شان میں وہ مشہور رباعی
بھی منسوب ہے جس کا آخری مصرع "حقا کہ بنائے لا الہ است حسین" ہے
حضرت خواجہ اجمیری کے خلفاء و مریدین میں حضرت سید حسین خنگ سوار
کا اسم گرامی بھی ہے وہ حضرت سید وجیہ الدین مشہدی کے بھتیجے تھے، اور ان کے بعد
ایبک کی طرف سے اجمیر کی ولایت پہ مامور کئے گئے، مگر حضرت خواجہ کی نظر توجہ
سے ان کی حالت میں انقلاب آیا۔ وہ حکومت کے فرائض کے ساتھ دین کی اشاعت کی خدمت
بھی انجام دیتے رہے یہاں تک کہ ~~۶۰۷ھ~~ ۱۲۱۰ء میں جام شہادت نوش فرمایا۔
حضرت خواجہ اجمیری نے اپنے خلیفہ رشید حضرت مخدوم سید قطب الدین بختیار
کاکی کو دلی میں قیام کرنے پر مامور فرمایا سلطان ایبک کو ان سے استفادہ کا شرف حاصل
تھا، دلی کی جامع مسجد قوۃ الاسلام کی بنا و تعمیر اس نے ۵۹۲ھ ۱۱۹۶ء میں کی، یہ اس عہد کی
مشہور یادگار ہے مسجد قطب صاحب ہی کی طرف منسوب ہو کر مشہور ہوئی۔
شیخ یعقوب بن علی لاہوری اس عہد کے ممتاز ارباب فضل و صلاح میں سے تھے
۵۳۵ھ ۱۱۴۰ء میں لاہور تشریف لائے ان سے ایک خلق کثیر نے رشد و ہدایت پائی ۶۰۴ھ ۱۲۰۷ء
میں وصال فرمایا، سلطان ایبک کے عہد حکومت کے بھی ممتاز علماء و صلحائے امت سے تھے
اور ان ہی بزرگوں کے سایۂ شفقت کا یہ اثر تھا کہ ایبک خود بھی دینداری و پارسائی
اور زہد و ورع سے مالا مال ہوا۔[۱]

۱؎ طبقات ناصری ص ۱۳۵ تا ۱۴۱، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۷، ۱۹۷، ۲۳۱ ؛ ظفر الوالہ ج ۲ ص ۶۸۳ تا ۷۰۶ ؛ تاج المآثر ص ۸۳، ۲۰۲ ؛ فخر الدین ص ۲۸، ۳۰، ۳۲، ۴۱، ۷۲ ؛ فرشتہ ج ۱ ص ۶۳ ؛ مرآۃ جہان نما ص ۵۳ ؛ لب الالباب ج ۱ ص ۸۱، ۹۰، ۱۸۹ ؛ ۱۱۶ تا ۱۱۷ ؛ نزہتہ الخواطر ص ۹۹ (سوانح ایبک) ۲۱۷ (حسن ضیاپوری) ۱۲۱ (ترمذی) ۱۸۳ - (تمودی) ۲۳۹ (کاشانی) ۱۹۶ (قاضی قدوہ) ۱۴۷ (رتن) ۲۳۷ (فرغانی) ۱۳۷ (حضرت خواجہ) ۱۴۲ (حضرت خنگ سوار) ۲۶۰ (لاہوری) و مونس الارواح و تذکرۃ السالکین وغیرہ، فوائد الفواد [illegible] انڈیا ص ۳ تا ۸ ؛ تاریخ ہندوستان [illegible]

آرام شاہ ۶۰۷ھ

آرام شاہ ایبک کا لے پالک بیٹا تھا، لاہور کے فوجی افسروں نے ایبک کی وفات کے بعد اس کی بادشاہی کا اعلان لاہور میں کیا، مگر قسمت اس منصب کے لیے ایک دوسرے ترک نوجوان شمس الدین التمش (التمش) کو منتخب کر چکی تھی، وہ قطب الدین کا عزیز خادم اور داماد اور اقطاع بداؤں کا گورنر تھا، دلی کے فوجی افسروں نے اس کو مدعو کر کے تخت پر بٹھا دیا، آرام شاہ نے ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ میں دلی پہ فوج کشی کی مگر وہ لڑائی میں مارا گیا اور آٹھ مہینے کے اندر اس کی حکمرانی کا خاتمہ ہو گیا۔

شمس الدین التمش ۶۰۷ھ تا ۶۳۳ھ

شمس الدین التمش ترکی قبیلہ البری کا خان زادہ تھا اس کا باپ دیلم اس قبیلہ کا ایک بڑا سردار تھا، اور التمش سے غیر معمولی محبت رکھتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے رشک و حسد سے اس کو ایک پردیسی کے ہاتھ فروخت کر دیا جس سے بخارا کے جمال الدین چست قبا نے اس کو خریدا اور بیچنے کے لیے غزنی کے بازار میں لایا، وہ خوش رو ترک بچہ تھا۔ جمال الدین نے گراں قیمت چاہی شہاب الدین غوری نے اس کی خریداری کی ممانعت کر دی، پھر تیسرے سال ایبک کو اجازت دی کہ وہ غزنین کے حدود سے باہر جا کر اس کو خرید سکتا ہے، چنانچہ جمال الدین اس کو دلی میں لایا؛ یہیں وہ خرید لیا گیا۔ غزنی میں اس کے خریدے جانے کی ممانعت اور دلی میں پہنچ کر خریداری کے واقعہ کا پیش آنا گویا قدرت کو یہ اشارہ کرنا تھا کہ مستقبل میں وہ غزنی سے بے تعلق رہے گا اور دلی ہی سے اس کو شرف توطن کا فخر حاصل ہوگا چنانچہ اس نے ہندوستان میں اسلام کی تعلیم مساوات کے ہاتھوں ترقی کی اور مسند حکومت پر پہنچا۔

اس نے غیر معمولی مشکلات کے ساتھ زمام حکومت ہاتھ میں لی تھی، آرام شاہ کے خاتمہ سے اس کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا، ایبک کا حریف ناصر الدین قباچہ ابھی زندہ تھا، اور خصوصاً ایبک کی وفات کے بعد ہندوستان کے تاج و تخت کے لیے جو سلطان شہاب الدین غوری کا ترکہ تھا، اپنے کو مستحق سمجھتا تھا، اس نے اپنی مملکت کو ملتان بھٹنڈہ، کہرام اور سرستی تک وسیع کر لیا تھا اور آرام شاہ کے بعد اس نے لاہور

پر بھی قبضہ جما لیا تھا، اسی طرح ایبک کا دوسرا حریف تاج الدین یلدز نے بھی
اس موقع کو غنیمت سمجھا، اور ایبک کے بعد دلی کے تخت کا دعویدار بنا اور آگے
بڑھ کر پنجاب کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا، دوسری طرف بنگال میں علی مردان خاں
نے بختیار خلجی کے قتل کے بعد سلطان علاء الدین کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان
اور اپنا سکہ اور خطبہ جاری کر دیا تھا، اسی طرح راجپوتوں نے بھی اس موقع سے
فائدہ اٹھایا اور جالور اور رنتھمبور وغیرہ اہم قلعوں کو قبضہ میں لے لیا تھا اور
خود پایۂ تخت دلی بھی التمش کے مخالفوں سے خالی نہ تھا۔ آرام شاہ کے حمایتی
افسروں کی سازشوں کا جال یہاں پھیلا ہوا تھا۔

التمش نے اپنے حریفوں اور مخالفین پر اجمالی نگاہ ڈالی، اور بڑی دانشمندی
اور حکمت عملی سے راہ عمل طے کی، اس نے سب سے پہلے مغربی سرحد سے یکسوئی
حاصل کرنے کے لیے تاج الدین یلدز کی طرف دست مصاحبت بڑھایا اور یلدز کو مطمئن
کر کے قباچہ پر فوج کشی کی، اور ۶۱۲ھ / ۱۲۱۵ء میں لاہور کو اس سے چھین لیا، اس طرح اپنے
حدود حکومت مغرب میں شوالک پہاڑی اور مشرق میں بنارس تک رکھے اور ان کے
انتظام میں مصروف ہو گیا، اس کے بعد جب مغربی سرحد پر خوارزمیوں نے اس کے حریف
یلدز کو پسپا کیا اور وہ لاہور آ کر پناہ گزیں ہو گیا اور ملتان، بٹھنڈہ
اور کہرام تک اس کے اثرات پھیلے اس موقع پر اس نے تاج الدین کے قصہ
کو پاک کر لینا چاہا، چنانچہ اس پر فوج کشی کی اور اس کو گرفتار کر کے بدایوں کے
قلعہ میں قید کر دیا، جہاں اس نے [illegible] میں وفات پائی اس کے بعد قباچہ نے پھر
لاہور پر قبضہ کر لیا، اور التمش کی فوج نے اس کو بھی زیر کر کے اس سے پنجاب
کو خالی کرا لیا، اور ۶۱۴ھ / ۱۲۱۷ء میں [illegible] التمش کا گورنر پنجاب میں مقرر ہو سکا
اس کے بعد ملک کے گوشہ گوشہ میں اس کی فتوحات اور اثر و نفوذ کا دائرہ
روز بروز وسیع ہوتا گیا، چنانچہ اس نے مشرق میں بنارس سے آگے بڑھ کر [illegible]
کے راجہ جاجنگر پر فوج کشی کی [illegible] کو باجگزار بنایا، پھر ۶۲۳ھ / ۱۲۲۶ء میں [illegible]

کی سمت گیا، جہاں علی مردان خان کے بعد حسام الدین عوض ملقب بہ سلطان غیاث الدین اپنا سکہ و خطبہ جاری کئے تھا، وہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکا، نذر پیش کر کے اطاعت کی التمش نے اپنے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود کو بنگال کا گورنر بنایا، اور صوبہ بہار کو علیحدہ کر کے ملک عز الدین کے سپرد کیا، غیاث الدین نے التمش کی واپسی کے بعد سر اٹھایا تو ملک عز الدین نے ۶۲۳ھ میں فوج کشی کر کے اس کا خاتمہ کیا، ناصر الدین محمود نے ۶۲۶ھ (۱۲۲۹ء) میں وفات پائی، تو التمش تعزیت کے نام سے دوبارہ مشرقی بنگال گیا، اور ۶۲۷ھ (۱۲۳۰ء) میں علاء الدین خان کو یہاں کی حکومت تفویض کی، مشرقی صوبوں سے یکسوئی حاصل کر کے وہ مشرقی راجپوتانہ کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ ۶۲۳ھ (۱۲۲۶ء) میں قلعہ رنتھنبور اور چتوڑ سر ہوئے، پھر مغربی راجپوتانہ میں قلعہ منڈور ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) میں فتح ہوا، اس کے بعد ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) میں سندھ پر حملہ آور ہوا اور نہ صرف اوچھ قبضہ میں آیا، بلکہ ناصر الدین قباچہ نے پسپا ہو کر دریا میں کود کر جان دے دی اور پورا علاقہ سندھ پہلی مرتبہ دہلی سلطنت کے ماتحت آ گیا، اس طرح کوہستان سلیمان سے کوہستان کھاسی (آسام) تک اور ہمالہ سے بندھیاچل تک وسیع رقبہ مرکزی سلطنت دہلی کی عملداری میں آ گیا، اسی طرح اس نے ۶۲۹ھ (۱۲۳۲ء) میں گوالیار اور ۶۳۱ھ (۱۲۳۴ء) میں مالوہ اور قلعہ بھیلسا پر اور ۶۳۲ھ (۱۲۳۵ء) میں اجین پر اقتدار حاصل کیا اس طرح سلطنت دہلی کے جنوبی حدود دریائے نربدا تک وسیع ہو گئے۔

غرض التمش ہندوستان میں ایک عظیم تر سلطنت کا بانی بنا اس زمانہ کی رسم کے مطابق اس کے نام ہندوستان کی شہنشاہی کا پروانہ دربار خلافت بغداد سے بھی آ گیا، گویا رسمی حیثیت سے ہندوستان کی خود مختار سلطنت کی غزنی سے اس کے جداگانہ وجود کی مزید تصدیق ہو گئی۔

التمش نے ۶۳۳ھ (۱۲۳۶ء) میں وفات پائی اور قطب صاحب کی مسجد کے پہلو میں دفن کیا گیا

اخلاق و عادات التمش نیک خو اور عدل پرور تھا، انصاف کے لیے خاص دربار میں مظلوموں کی فریاد سنتا فریادیوں کو رنگین کپڑے پہن کر دربار میں آنے کی ہدایت تھی۔ رودشنی کے اوقات میں ناگہانی حادثوں کے لیے زنجیر لٹکائی گئی تھی کہ اس کو اطلاع

دی جا سکے، وہ صاحب علم و فضل اور علما اور ماہرین فن کا قدردان اور دیندار، تہجد گزار اور صاحب زہد و ورع تھا، اور صلحائے امت کی خدمت میں حاضر رہنے کو سعادت کونین سمجھتا تھا۔

التمش کا عہد حکومت | خوانین شمسیہ التمش کے طویل دور حکمرانی میں ہندوستان کی سلطنت کے استحکام کے لیے جو کوششیں عمل میں آئیں، ان سے اس کا اور اس کے خاندان کا امتیازی وقار قائم ہو گیا، ملوک و خوانین اس کے جاں نثار بن گئے، یہاں تک کہ ۶۲۹ھ میں "خوانین شمسیہ" کے نام سے ایک جماعت کی تاسیس عمل میں آئی جس کو زمانۂ حال کی اصطلاح میں دار الامرا کہا جا سکتا ہے، لیکن اس کے اختیارات دار الامرا سے زیادہ وسیع بلکہ موجودہ زمانہ کے لیجسلیچر کے ایوان عام کے اختیارات کے مانند تھے اقتدار اعلیٰ جو التمش کے ہاتھوں میں تھا، اس کے استعمال کا حق رفتہ رفتہ اسی مجلس "خوانین شمسیہ" کے ہاتھوں میں آ گیا تھا، التمش کے بعد بھی خوانین سلاطین کے عزل و نصب کے مختار بن گئے، وہ سلاطین کے انتخاب میں التمش کے خاندان یا اس کے موالی (آزاد کردہ غلام) کے انتساب کا لحاظ رکھتے تھے، اور اسی مناسبت سے بعض مورخین نے ان خوانین شمسیہ کے قائم کیے ہوئے سلاطین "شمسیہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

وزراء | اس عہد کے ممتاز اہل علم منصب وزارت پر مامور کیے گئے تھے۔ وزارت عظمیٰ کے منصب پر نظام الملک قوام الدین محمد بن ابو سعد جنیدی سرفراز تھے جن کے سامنے خلیفہ بغداد کا قلمدان وزارت بھی رہ چکا تھا، وہ ۶۰۷ھ میں منصب وزارت پر سرفراز ہوا اور التمش کے پورے دور حکومت میں اس منصب پر مامور رہا، اس کے بعد اس نے رکن الدین فیروز شاہ کی حمایت کی اور اس کے خاتمہ کے بعد وہ بھی سیاست سے کنارہ کش ہو گیا، اسی طرح مولانا تاج الدین دہلوی صاحب دیوان رسائل (انچارج سکرٹریٹ) تھے بعض موقعوں پر قصائد بھی لکھے ہیں، بہاء الملک تاج الدین حسن بن احمد اشعری المقتول سنہ ۶۳۱ھ جو سلطان ناصر الدین قباچہ کے وزراء میں تھا، اس کے زوال کے بعد التمش کے دامن دولت سے وابستہ ہوا، وہ اپنے دور کے ممتاز اہل علم میں شمار کیا جاتا تھا۔ رکن الدین فیروز شاہ

کے دور میں وزارت کے منصب پر مامور کیا گیا، اسی طرح عین الملک فخر الدین حسین بن احمد اشعری سلطان ناصر الدین قباچہ کے دربار میں ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) سے ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) تک منصب وزارت پر فائز رہا اس کی موت کے بعد وہ بھی التمش کے دامن دولت سے وابستہ ہوا اس نے اس کو رکن الدین فیروز شاہ کا اتالیق مقرر کیا اور اس کے عہد میں وزارت کے منصب پر مامور رہا۔

شیخ الاسلام | اس عہد میں شیخ الاسلامی کے منصب پر مولانا جلال الدین سرفراز تھے، ان کی وزارت کے بعد مولانا نجم الدین صغری سرفراز کیے گئے پھر آگے چل کر اپنے بعض اعمال کی بنا پر سلطان کے عتاب میں آئے اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کو یہ منصب پیش کیا گیا۔

قضاۃ | التمش کے عہد کے ممتاز قضاۃ میں قاضی سعد الدین کردری، قاضی حمید الدین ناگوری، قاضی نصیر الدین معروف بہ کاسہ لیس، قاضی جلال الدین قاضی کبیر الدین اور قاضی قطب الدین کاشانی متوفی ۶۳۳ھ (۱۲۳۵ء) وغیرہ تھے

علماء و فضلا | اس دور کے ممتاز علماء و فضلا میں ارباب مسند درس و باکمال اساتذہ میں مولانا شرف الدین ابو توامہ حنفی دہلی، جن کے حلقۂ درس میں شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری بھی رہ چکے تھے، شیخ علی بن حامد کوفی، شیخ فخر الدین عمید تولکی جن کے بہترین قصائد بھی التمش کی شان میں ہیں اور ملا جلال الدین وغیرہ تھے، اسی طرح اس عہد کے ممتاز ارباب قلم میں محمد بن محمد عوفی کا نام شہرت عام رکھتا ہے، اس نے اپنی مشہور کتاب لب الالباب ناصر الدین قباچہ کے عہد میں وزیر عین الملک کے لیے تصنیف کی، جو گب میموریل کی طرف سے عبد الوہاب قزوینی کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ چھپ چکی ہے؛ پھر اس نے التمش کے دربار میں پہنچ کر وزیر نظام الملک جنیدی کے نام اپنی دوسری مشہور کتاب جوامع الحکایات ولوامع الروایات معنون کی، اس کے دیباچہ میں التمش اور نظام الملک کے نام سے انتساب کرنے کا ذکر آیا ہے[1]

---

[1] اگرچہ اس کا اصل فارسی نسخہ ابھی تک چھپا نہیں ہے، مگر کثرت سے نسخے موجود ہیں (بقیہ حاشیہ ۱۴۳ پر)

اسی طرح عوفی نے قاضی تنوخی متوفی ۳۸۴ھ/۹۹۵ء کی الفرج بعد الشدۃ کو عربی سے فارسی میں منتقل کیا ہے۔

شعراء التمش کے عہد کے ممتاز شعراء بہاء الدولہ علی بن احمد جاجی کو امتیاز حاصل تھا، وہ صاحب سیف امراء میں سے تھا، جاجنگر کا قلعہ فتح کیا تھا، آگے چل کر التمش نے اس کو بدایوں کا امیر داد (مجسٹریٹ) مقرر کر دیا تھا۔

مشائخ اس عہد کے اکابر مشائخ طریقت میں سے حضرت مخدوم خواجہ سید قطب الدین بختیار کاکی متوفی ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء سے التمش کو غیر معمولی عقیدت تھی، التمش کے پورے دور میں حضرت کے وجود گرامی سے روحانی فیوض و برکات کا سرچشمہ رہا، اور چشتیت مستی سے پورا ہندوستان سرشار رہا۔

حضرت خواجہ بختیار کاکی ماوراء النہر کے قصبہ اوش میں پیدا ہوئے ڈیڑھ سال کی عمر میں سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا، والدہ کے دامن تربیت میں پرورش پائی، پانچ سال کی عمر میں مدرسہ میں داخل کئے گئے، شیخ ابو حفص اوشی سے علوم کی تحصیل کی اور ۱۸ سال کی عمر میں حضرت خواجہ سید معین الدین چشتی سے دست بیعت ہوئے اور اس عہد کے اکابر مشائخ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی، شیخ اوحد الدین کرمانی شیخ برہان الدین چشتی، اور شیخ محمود اصفہانی کے روبرو حضرت خواجہ معین الدین نے انھیں اپنا خرقہ خلافت عطا فرمایا، کچھ دنوں کے بعد جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی ہندستان تشریف لائے تو انھوں نے بھی شوق دیدار میں ہندستان کا سفر اختیار کیا۔ پہلی منزل ملتان میں قرار پائی۔ یہاں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کا حلقۂ صحبت قائم تھا، حضرت جلال الدین تبریزی بھی ان دنوں یہیں تشریف فرما تھے، حضرت قطب الدین

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲) ڈاکٹر نظام الدین نے اس پر اپنی محققانہ کتاب لکھی ہے جو گب میموریل کی طرف سے چھپ چکی ہے۔ اس کے متن کی چیدہ حکایتوں کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے اختر شیرانی کے قلم سے منتقل ہو کر چھپ چکا ہے، فارسی متن کا ایک نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ سلطان مراد کے حکم سے جیسا کہ کشف الظنون میں ذکر آیا ہے ابن عرب شاہ متوفی ۸۵۴ھ نے اس کو ترکی زبان میں منتقل کیا، پھر نجاتی متوفی ۹۱۴ھ سلطان محمد خاں کے لیے اور صالح بن جلال الدین متوفی ۹۷۳ھ سلطان بایزید کے لیے ترجمہ کرتے گئے، نیز محمد بن اسعد تستری نے اس کا انتخاب تیار کیا۔

بھی کچھ دنوں یہاں قیام فرما رہے، پھر دہلی تشریف لائے۔ حضرت خواجہ اجمیری نے انھیں دہلی ہی میں قیام رکھنے کا حکم عطا فرمایا، اور یہاں ان کے فیوض و برکات کا سرچشمہ جاری ہو گیا، خود سلطان التمش کو ان سے غیر معمولی عقیدت پیدا ہو گئی، اس نے ہفتہ میں دو مرتبہ حضرت کی خدمت میں حاضری دینا اپنا معمول بنالیا، اور ان کے فیض صحبت سے بہرہ اندوز ہوتا رہا۔ حضرت کی طرف سلطان التمش کے غیر معمولی رجحان کو دیکھ کر اس عہد کے شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو ان سے شکوہ پیدا ہوا۔ حضرت خواجہ اجمیریؒ دو مرتبہ اجمیر سے اس عہد میں دہلی تشریف لائے اور جب مولانا نجم الدین صغری نے حضرت خواجہ اجمیری سے حضرت قطب الدین کا شکوہ کیا اور حضرت نے انھیں دہلی سے روانہ ہونے کا حکم فرمایا، تو سارا دلی فرط عقیدت سے حضرت کے نقش قدم کی خاک پاک کو اٹھا اٹھا کر سروں پر رکھنے لگا۔ حضرت خواجہ نے اہل دلی کی عقیدت دیکھ کر یہیں قیام رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی کہ ایک دلی یعنی شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو خوش کرنے کے لیے اتنے دلوں کو دکھایا نہیں جا سکتا۔ حضرت خواجہ اجمیری کے اس فیصلہ سے سلطان التمش کو بھی سکون خاطر حاصل ہوا، دہلی میں خلق خدا پروانہ وار ان کے گرد اکٹھا ہوگئی اس کی مثال اس سے پہلے نہیں گزری تھی۔ حضرت پر وجد و مستی کا کیف طاری ہوتا تھا، وفات کا سانحہ بھی اسی سلسلہ میں پیش آیا، قوال ایک غزل گا رہا تھا اس شعر پر پہنچا۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو حضرت پر وجد طاری ہوا، تین دن تک یہ کیفیت جاری رہی، قوال بھی شعر کو دہراتا رہا، یہاں تک کہ واصل بحق ہوئے۔

حضرت کی طرف دو کتابیں منسوب ہیں ایک تو ان کا فارسی دیوان ہے، دوسری فوائد السالکین کے نام سے ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کو ان کے خلیفہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر نے جمع کیا ہے۔

شیخ نورالدین مبارک بن عبداللہ حسینی غزنوی، سلطان شہاب الدین غوری

کے وقت سے صاحب منزلت مشائخ میں سے تھے۔ غزنی میں پیدا ہوئے اور اپنے ماموں شیخ عبدالواحد بن شہاب احمد غزنوی سے تحصیل کی، پھر بغداد کا سفر کیا حضرت سہروردی سے فیض حاصل کیا، سلطان شہاب الدین غوری اپنی لڑائیوں میں جانے سے پہلے ان سے دعا کا طالب ہوتا تھا، اس نے شیخ الاسلامی کے منصب پہ انھیں سرفراز کیا، یہ غزنی میں مقیم تھے، پھر ہندستان تشریف لے آئے۔ سلطان التمش ان کی غیر معمولی تنظیم کرتا۔ صدر مجلس میں بٹھاتا، دست بوسی کرتا اور اپنی مہموں میں ان سے دعاؤں کا طالب ہوتا تھا سنہ ۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء میں انھوں نے وفات پائی۔ اور حوض شمسی سے مشرق میں قدیم دہلی میں مدفون ہوئے (۲۰۲)

اس دور کے ممتاز مشائخ میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کا درجہ بہت بلند ہے وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے ہم عصر تھے، سنہ ۵۶۵ھ میں ملتان کے نواح میں پیدا ہوئے، عالم اسلامی میں علوم دین اور تصوف کے جو اہم مرکز تھے، وہاں تحصیل و کسب فرمایا اور ملتان میں اقامت اختیار فرمائی۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ اور ہندستان میں سہروردی سلسلہ کے بانیوں میں سے تھے ان کے فیض سے علم حدیث علم طریقت کی روشنی پھیلی، خصوصاً سندھ و ملتان کا علاقہ ان کے فیوض و برکات سے مالامال تھا۔ اگرچہ ان کا قیام ناصر الدین قباچہ کے حدود حکومت میں تھا اور قباچہ و التمش میں دیرینہ اختلاف قائم تھا، یہ التمش کو حق پر تصور کرتے تھے اور ایک موقع پر جب قباچہ نے ایک سازش کا جال پھیلایا اور التمش کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہوا تو حضرت قاضی شرف الدین اصفہانی نے التمش کو خط لکھ کر دینی فرض تصور کیا مگر وہ مکتوب پکڑ لیا گیا اور قباچہ نے احتساب کے لیے دربار میں انھیں اور قاضی شرف الدین اصفہانی کو بلوایا اور مکتوب کو قاضی اصفہانی کے ہاتھ میں دے کر جواب طلب کیا، وہ خاموش رہے، قباچہ نے اسی لمحہ جلاد سے انھیں تہ تیغ کر دیا، پھر حضرت بہاء الدین زکریا کی طرف متوجہ ہوا اور ان کے ہاتھ میں مکتوب کو رکھ دیا۔ حضرت نے فرمایا "میں نے اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے" یہ جواب سنتے ہی قباچہ پر لرزہ طاری ہو گیا اور عزت و احترام سے انھیں رخصت کر دیا۔ ان کے بعد جب شیخ الاسلام

نجم الدین صغری نے حضرت جلال الدین تبریزی پر سازش کر کے زنا کی تہمت لگائی
تو سلطان التمش نے ملک کے علمار صلحا رکی ایک مجلس منعقد کی، حضرت بہار الدین زکریا
بھی اس میں تشریف لائے اور وہی اس مقدمہ کی سماعت کے لیے حکم بنائے گئے، جب
حضرت تبریزی مجلس میں تشریف لائے تو حضرت زکریا ملتانی نے اُٹھ کر ان کا استقبال کیا
اور ان کی جوتیاں ہاتھ میں اٹھالیں یہ کیفیت دیکھ کر مطربہ پر ایک عالم طاری ہوا اور اس نے
سازش کا پورا واقعہ مجلس میں بیان کر دیا۔ مولانا نجم الدین صغری خجالت سے بیہوش
ہوگئے، سلطان نے اُن کو شیخ الاسلام کے منصب سے برطرف کر دیا۔ اور حضرت بہار الدین
زکریا سے اس منصب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کو انھوں نے قبول فرمالیا۔ حضرت ۶۶۶ھ
میں واصل بحق ہوئے۔ حضرت سید محمد بن علی حسینی بلگرامی، مردم خیز قصبہ بلگرام کے ذی علم
خاندان کے مورث اعلیٰ بھی اسی دور میں گزرے ہیں وہ صاحب سیف مشائخ میں سے تھے
اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مرید تھے ۶۱۲ھ (۱۲۱۷) میں بلگرام آئے اور اس علاقہ کو فتح کیا
۶۲۷ھ میں یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ سلطان التمش نے جاگیر عطا کی ۶۴۵ھ (۱۲۴۷) میں وصال فرمایا
شیخ محمد بن محمد ترکمانی، خواجہ عثمان ہارونی کے خلفار میں سے تھے، ہندستان میں
تشریف لاکر نارنول میں اقامت اختیار فرمائی ایک خلق کثیر ان کے ہاتھ پر اسلام لائی،
۶۴۲ھ میں وصال فرمایا (۲۲۷)

اسی طرح حضرت قاضی حمید الدین محمد بن عطا ناگوری کا شمار بھی باکمال مشائخ
طریقت میں ہے، ان کے والد حضرت عطا سلطان شہاب الدین کی معیت میں دہلی تشریف
لائے، حضرت قاضی حمید الدین ناگوری المتوفی ۶۴۳ھ (۱۲۴۵) میں پہلے ناگور کی قضارت پر
سرفراز ہوئے، پھر بغداد پہنچ کر حضرت سہروردی سے بیعت کی، اور واپس آکر
حضرت خواجہ اجمیری کی بارگاہ سے فیض اٹھایا اور التمش کے دور میں حضرت
قطب الدین بختیار کاکی کی معیت میں دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی اور خلق
خدا کو فیض یاب فرمایا، کتاب اللوائح اور کتاب طوالع الشموس ان کی یادگار ہیں
اسی طرح اس عہد کے باکمال مشائخ طریقت میں شیخ علی بن احمد بن مودود چشتی

ہیں، جن کے ذریعہ حضرت خواجہ اجمیری کے واسطے کے بغیر وہ اکیلا دوسرا سلسلہ چشتیہ ہے جو ہندستان میں جاری ہوا، اسی طرح شیخ سلیمان بن عبد اللہ عباسی متوفی ۶۵۷ھ (۱۲۵۹ء) جو شہاب الدین سہروردی اور شیخ فریدالدین عطار کے صحبت یافتہ تھے اور شیخ عزیزالدین لاہوری متوفی ۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء) اور شیخ صلاح الدین حسن کیتھلی متوفی ۶۲۰ھ (۱۲۲۳ء) اس دور کے ممتاز اکابر مشائخ تھے۔

ان بزرگوں کا یہ فیض کرم تھا کہ یہ دور تقویٰ، خداترسی اور عبادت و ریاضت کے لیے ایسا موزوں قرار پاگیا تھا، کہ سلطان وقت التمش بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اور یہ شاید عام نگاہوں میں نہ ہو، کہ جس طرح سلاطین کی صف میں وہ امتیاز رکھتا ہے اور اس کے عہد کے سیاسی حالات، سیاسی تاریخوں میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ اسی طرح اولیائے کرام کے تذکروں میں بھی ان کے پہلو بہ پہلو اس کا نام جس عقیدت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا مرید اور ان کا صحبت یافتہ تھا اور اس کی اس جامعیت کا تذکرہ مورخین نے اس انداز میں کیا ہے۔

> "ظاہر میں گو بادشاہ تھے، مگر دل فقیر تھا، ان کا قاعدہ تھا کہ کم کھاتے کم سوتے، تمام شب بیدار رہتے اپنے کسی کام کے واسطے غلام اور نوکروں کو تکلیف نہ دیتے، رات کو ڈول رسی پلنگ کے نیچے رکھتے، کہ نماز تہجد کے ادا کرنے کے لیے جب اٹھیں تو خود پانی بھر لیا کریں کہ دوسرا بے آرام نہ ہو اور آخر شب گدڑی اوڑھ کر شہر میں گشت کرتے۔ جس کو تکلیف ہوتی اس کو رفع کرتے، علما و صلحا کو بہت کچھ دیتے اور تھیلیوں میں بھر کر پوشیدہ ان کے گھروں میں پھینک دیتے تھے۔"[۱]

---

[۱] طبقات ناصری ص ۱۶۵ تا ۱۶۹، ۱۷۳، ۱۸۳، ۱۳۵، ۳۰۲، ۱۵۹ تا ۱۷۱، ۱۳۳؛ ظفر الوالہ ج ۲ ص ۶۹۶ تا ۶۸۸؛ منتخب التواریخ ص ۶۷؛ تحفۃ الکرام ورق ۲۶۲؛ تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۰۵۲؛ الیٹ ج ۱ ص ۲۹۵؛ فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۷۴ تا ۱۰۵؛ تاریخ ہند ہاشمی ج ۲ ص ۸؛ تاریخ ذکاء اللہ ج ۱ ص ۲۲ تا ۲۷؛ تذکرہ اولیائے ہند ج ۱ ص ۶۴؛ نزہۃ الخواطر ص ۹۳ (ذکر التمش) ۱۳۳ (تاج الدین دہلوی) ۱۵۱ (اشرف) ۱۴۲ (سلطین الملک) ۱۴۳ (سروری) ۱۶۳ (ابو محمد) ۱۸۲ (کوفی) ۱۸۷ (ترکی) ۲۳۶ (کاسہ لیس) ۱۹۸ (کاشانی) ۳۵ (صغری) ۲۲۴ (عوفی) ۲۰۳ (نظام الملک) ۱۳۶ (کیتھلی) ۱۶۲ (عباسی) ۱۶۹ (چشتی) ۱۹۷ (کاکی) ۲۱۶ (ناگوری) ۱۵۶ (زکریا ملتانی) ۲۰۳ (نورالدین چشتی) ۲۲۴ (ترکمانی)

سلطان رکن الدین فیروز شاہ
شعبان ۶۳۳ھ – ۶۳۴ھ
اپریل ۱۲۳۵ء – ۱۲۳۶ء

التمش نے اپنی زندگی میں اپنی جانشینی کے مسئلہ کو کسی قدر پیچیدہ بنا دیا تھا، عام اصول کے مطابق اس نے اپنے بیٹے فیروز کو امور مملکت میں حصہ لینے کے لیے آگے بڑھایا، ۶۲۵ھ ۱۲۲۸ء میں اس کو بدایوں کے صوبہ کی گورنری دی مگر اس کے طور طریقے ایسے تھے، کہ وہ اس کی نظر میں اس کی جانشینی کے لائق قرار نہ پا سکا۔

رضیہ کی جانشینی کا پس منظر

اس لیے اس نے ایک دوسرے موقع پر فیروز کی موجودگی میں گوالیار کی مہم پر جاتے ہوئے اپنی بیٹی رضیہ کو دہلی کی زمام حکومت سپرد کی اور واپس آکر وزیر اعظم تاج الملک محمود سے کہا کہ وہ رضیہ کی ولیعہدی کا اعلان کر دے، اگرچہ ترکوں میں نامور حکمران خواتین گزر چکی تھیں، مگر ہندستان کی روایات کا لحاظ کر کے ترک افسروں نے دبی زبان سے اس تجویز سے اختلاف کیا مگر التمش نے یہ کہہ کر انھیں خاموش کر دیا کہ اس کے بیٹے فیروز میں سلطنت کا بار گراں سنبھالنے کی صلاحیت نہیں انھیں خود تجربہ ہو جائے گا کہ رضیہ بڑی دانشمندی اور تدبر سے اس منصب کی اہل ثابت ہوگی چنانچہ ۶۲۹ھ میں اس کی ولیعہدی کا اعلان ہو گیا اور اس کے نام کا سکہ بھی اس کی زندگی میں جاری کر دیا گیا، اور فیروز کو عین الملک محمود کی نگرانی میں جس نے رضیہ کی ولیعہدی کی مخالفت کی تھی، لاہور کی صوبہ داری پر بھیج دیا، اور اس طرح گویا اس کو دار السلطنت سے دور کر کے پایۂ تخت کو آئندہ پیش آنے والے خطرہ سے بچایا گیا، مگر فیروز کی ماں ترکان خاتون بھی بڑی ہوشمند ملکہ تھی، وہ فیروز کے حق ولیعہدی سے دستبردار نہیں ہوئی اور ترک افسروں کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔

رکن الدین کی تخت نشینی

چنانچہ جب التمش آخری مرتبہ لاہور سے واپس آیا تو فیروز کو اپنے ساتھ لیتا آیا، اس طرح اگرچہ اس کی ولیعہدی کا اعلان نہ ہو سکا، مگر یہ مسئلہ گویا نئے سرے سے ارباب حکومت کی توجہ کا مرکز بن گیا، اور

جب التتمش نے وفات پائی تو ملکہ ترکان خاتون اپنے بیٹے کو ترک افسروں کی مدد سے دہلی کے تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہوگئی اور اس کا لقب رکن الدین قرار پایا۔

رکن الدین جیسا کہ التتمش کو خطرہ تھا تخت پر بیٹھتے ہی کاروبار سلطنت سے غافل ہوکر عیش وطرب میں مشغول ہوگیا، شاہی خزانے کو بیدردی سے برباد کرنے لگا، ترکان خاتون نے سلطنت کی زمام گویا اپنے ہاتھ میں لے لی، سوکنوں کو ہلاک کرایا، ایک سوتیلے بیٹے کی آنکھ میں سلائی پھروائی اور ملک میں ابتری شروع ہوئی۔ سلطان رکن الدین کا چھوٹا بھائی غیاث الدین محمد اودھ کا حاکم تھا، اس نے اطاعت سے انکار کیا، لکھنوتی سے آنے والے شاہی خزانہ کو اودھ میں روک لیا، اسی طرح بدایوں، لاہور، ملتان اور قلعہ ہانسی کے صوبہ داروں کی باہمی مراسلت سے رکن الدین کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا گیا، سلطان رکن الدین ان خود سروں کو سزا دینے کے لیے دہلی سے نکلا ان گورنروں کی فوج مقابلہ کے لیے آئی، اس اثنا میں خود رکن الدین کی فوج کے افسر چند ممتاز ساتھیوں کو قتل کرکے دہلی لوٹ آئے، اب رضیہ نے اپنے لیے فضا سازگار دیکھی، وہ شجاعت سے مظلوموں کا لباس پہن کر جامع مسجد میں آئی، التتمش کی مہربانیاں یاد دلائیں اور کہا کہ وہ بھائی کے قصاص کے لیے اٹھی ہے ایک بھائی نے اس کے دوسرے بھائی کو مار ڈالا ہے، فضا رکن الدین کے خلاف ہوچکی تھی، التتمش کا رضیہ کو ولیعہد بنانا لوگوں کو یاد آیا اور فوج نے یہ کہہ کر کہ اگر یہ بھائیوں سے بہتر ثابت ہوئی، تو تاج وتخت کی یہ مالک رہے گی اس کو تخت پیش کرکے تاجدار بنا دیا، ترکان خاتون کو گرفتار کرکے قید کردیا گیا۔ رکن الدین نے یہ حالات سنکر دہلی کا رخ کیا تو سلطانہ رضیہ نے پیش قدمی کرکے اس کو شکست دی اور گرفتار کرکے قید خانہ میں ڈال دیا، رکن الدین فیروز صرف ۶ مہینے اٹھارہ دن حکمران رہا اور ہندستان میں پہلی مسلمان خاتون صاحب تخت وتاج بنی۔[1]

---

[1] فرشتہ ج ۱ ص ۶۸ فتوح السلاطین عصامی ص ۱۲۶ ، ۱۲۷ ، طبقات ناصری ص ۱۸۰ تا ۱۸۵ ، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۷۰۰ تا ۷۰۲ ، ۷۰۸ ، ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۲۵ فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۰۶ تا ۱۱۰ ، تاریخ ہندستان ذکاء اللہ ج ۱ ص ۲۶۷ تا ۲۷۵۔

سلطانہ رضیہ
۶۳۴ھ – ۶۳۷ھ
۱۲۳۷ – ۱۲۴۰

سلطانہ رضیہ نے مردانہ لباس پہن کر بے نقاب تخت سلطنت پر جلوس کیا اور تدبر و ہوش مندی سے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی سلطان رکن الدین کو شکست صوبائی گورنروں کے ہاتھوں ہوئی تھی، وہ بڑھتے ہوئے دہلی تک چلے آئے، اب وہ سلطان کی نامردگی کو اپنا حق تصور کرنے لگے اور وہ دربار دہلی کے امرا کی رائے سے اتفاق نہ کرسکے اس طرح ارباب سیف کے دو مستقل گروہ قائم ہوگئے۔ صوبہ داروں کے گروہ میں سے اودھ کے حاکم نے رضیہ کی حمایت کرنا چاہی مگر وہ گرفتار کر کے قتل کردیا گیا، سلطانہ نے شہر سے نکل کر جمنا کے کنارے خیمہ لگایا دوسری طرف ترک امرا بھی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ مگر رضیہ کے حسن تدبیر سے مخالفین کو شکست ہوئی، ان گورنروں میں سے اکثر مارے گئے اور کچھ روپوش ہوگئے، رضیہ نے پورا تسلط قائم کرکے حکومت کے نظم و نسق پر توجہ کی، مختلف صوبوں میں گورنر بھیجے اور لکھنوتی سے دیبل و سندھ تک کا علاقہ اس کا مطیع و منقاد ہوگیا۔

رضیہ نے تین سال تک امن و امان کی حکمرانی کی بعض قلعے جو پہلے سے قبضہ سے نکل گئے تھے وہاں مہم بھیج کر ان پر قبضہ کیا، وہ امور جہانداری سے بخوبی واقف تھی مردانہ لباس میں باہر نکلتی، سوار ہوکر میدان جنگ میں جاتی، گھوڑے پر سوار ہوتی، عدالت وانصاف کے لیے بیٹھتی تو عادلانہ فیصلے کرتی، لیکن اسلامی ملکوں میں عورتوں کی بادشاہی کا رواج نہ تھا، اس کے کئی بھائی بھی موجود تھے، اس کے خلاف شورش پیدا کرنے کے لیے محض کوئی بہانہ چاہیے تھا دربار میں ترک افسروں میں سے اس کا ایک مخالف گروہ جو اگرچہ کمزور ہوچکا تھا مگر پھر بھی موجود تھا۔ اس کے دربار میں رفتہ رفتہ ایک حبشی جمال الدین یاقوت کو اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ ترک ملک و امرا کو اس کا اقتدار ناگوار گزرا، وہ اگرچہ سلطنت کے سارے کام مردانہ شجاعت سے انجام دیتی تھی، مگر اس کی نسوانیت بہرحال اس میں موجود تھی، اور اس کے مخالفین کے پاس اس کے خلاف بھڑکانے کے لیے یہ آسان حربہ موجود تھا، چنانچہ اندر اندر اس کے خلاف تحریک ہوئی، اور وہ ایک شورش بن کر اٹھی، یاقوت حبشی گرفتار کرکے قتل کیا گیا، اور رضیہ کو جب کہ وہ بھٹنڈہ پر فوج کشی میں مصروف تھی، خود اس کے

ہمراہیوں نے سازش سے گرفتار کرکے بھٹنڈہ میں قید کردیا اس نے بھٹنڈہ کے قلعہ دار سے شادی کرکے وہاں سے نکلنے اور گھکروں اور جاٹوں کی مدد سے دہلی پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکی آخر دہلی کے اطراف میں ماہ ربیع الاول ۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء قتل کردی گئی اس کو تین سال چند مہینے حکمرانی کا موقع مل سکا۔[1]

معز الدین بہرام شاہ ۶۳۷ھ - ۶۳۹ھ (۱۲۴۰ء - ۱۲۴۲ء)

اس وقت دہلی اور اس کے نواح میں سلطنت کے خلاف سازباز کرنے میں سازش کرنے والوں کے کئی گروہ قائم ہو گئے تھے چنانچہ رضیہ کی گرفتاری کے بعد التمش کے بیٹے بہرام شاہ کی بادشاہی کا اعلان کیا گیا اس نے معز الدین لقب رکھا، ترک امرا اور ملک اپنی فوجیں لے کر پایۂ تخت میں اطاعت کا حلف لینے کے لیے آئے اور معز الدین نے اقتدار اعلیٰ کی کمان ان کے ہاتھوں میں دے دی اور ان کے رحم وکرم پر دہلی کے تخت کا مالک بنا، وزارت کی باگ دو امیروں اختیار الدین اور مہذب الدین کے ہاتھوں میں آگئی۔ موخر الذکر نے بہرام شاہ کے اقتدار کو ہاتھ سے نکلتے ہوئے دیکھ کر ان دونوں پر خفیہ حملہ کرایا، اختیار الدین مارا گیا۔ مہذب الدین زخمی ہو کر بچ نکلا، ایک دوسرا ملک بدر الدین سنقر امیر وحاجب مقرر ہوا اس نے بھی اپنے حدود سے تجاوز کرکے امور مملکت کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر لے لیا، اس کے بعد مختلف امرا سازشوں کا جال پھیلانے میں مصروف رہے اور یکے بعد دیگرے منصب وزارت پر آئے، یہاں تک کہ ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں جب شاہی لشکر مغلوں کے مقابلہ کے لیے جا رہا تھا۔ منصوبہ باندھنے والوں نے اس کو بادشاہ کے خلاف کر لیا، وہ دہلی لوٹ آیا، اور شاہی محل کا محاصرہ کر لیا۔ صلح کی کوششیں ناکام رہیں اور بہرام شاہ ماہ شعبان میں گرفتار اور ذی قعدہ ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں قتل کردیا گیا۔ وزارت کے منصب پر نظام الملک مستوفی بدستور مامور رہا۔[2]

---

[1] فتوح السلاطین ص ۱۲۷، طبقات ناصری ص ۱۸۴، ۱۸۵، تا ۱۹۰، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۷۰۲ تا ۷۰۵، عصامی ص ۱۲۹، فرشتہ ج ۱ ص ۶۸، ۶۹، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۱۰ تا ۱۱۴، تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ ج ۱ ص ۲۴۳ تا ص ۲۴۵

[2] طبقات ناصری ص ۱۹۰ تا ۱۹۶، ۲۵۳، ۲۵۵، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۷۰۵ تا ۷۰۱، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۱۴ تا ۱۱۸،

سلطان علاء الدین مسعود ۶۳۹ھ - ۶۴۴ھ / ۱۲۴۱ - ۱۲۴۵

بہرام شاہ کے مخالفین میں ملک عزالدین بلبن کشلو خاں کو امتیاز حاصل تھا، اس نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا، مگر دوسرے ترک ملوک امراء نے شاہی خاندان ہی کے کسی رکن کو تخت نشینی کرنے کا فیصلہ کیا اور نظر انتخاب سلطان رکن الدین کے بیٹے مسعود پر پڑی اس کو قیدخانہ سے نکال کر علاؤالدین مسعود کے لقب سے تخت نشین کیا گیا۔ ملک کشلو خاں نے بھی کثرت رائے کی اطاعت کی، اور اپنے دعوے سے دستبردار ہو گیا اس طرح ترک امراء، اور ملک کی جو مختلف پارٹیاں تھیں ان کی مشترکہ حکومت قائم ہوئی، اصل اقتدار ان ہی کے ہاتھوں میں رہا، ملک کشلو خاں کا اعزاز سب سے زیادہ کیا گیا، اور اس کو اجمیر، ماندو، اور ناگور کے اقطاع کی حکومت سپرد کی گئی، اسی طرح مختلف ممتاز ملک مختلف صوبوں کے حاکم بنائے گئے، اور حکومت کی اصل باگ وزارت کے ہاتھ میں رہی جس میں وزارت و نیابت کے عہدوں پر مختلف پارٹیوں کے نمائندے سرفراز تھے، اس طرح بیدار مدبر امراء کے ہاتھوں حکومت کا نظم و نسق خوبی سے سنبھل کر قائم ہو گیا۔

بلبن کا اقتدار کچھ دنوں کے بعد مرکزی حکومت کے وزراء میں رد و بدل ہوا۔ وزارت عظمیٰ کا قلمدان غیاث الدین بلبن کے ہاتھوں میں آیا اس نے فوج کی نئی تنظیم کی، اور اب طاقت کا سرچشمہ اس کے ہاتھوں میں آ گیا، اور مرکزی حکومت کی پوری صورت حال بدل گئی، اس نے اپنی پارٹی کے معتمد لوگوں کو مختلف منصبوں پر مامور کیا اور مخالف طاقتوں کی سازشوں اور حزب بندی کے شاخسانوں کو ختم کرنے کے لیے راجپوتوں اور مغلوں کے خلاف اپنی فوجی مہمیں شروع کیں اور حکومت کی ساری توجہ اسی طرف لگا دی، رفتہ رفتہ ترک امراء و ملک کی قوت ٹوٹ گئی، یہاں تک کہ بلبن مغلوں کے حملہ کو کامیابی سے روک کر واپس آیا۔ تو شاہی فوج سلطان علاؤالدین مسعود کے خلاف ہو گئی، اور ۶۴۴ھ / ۱۲۴۵ میں اس کو معزول کر کے اس کے چچا ناصر الدین محمود کو جو صوبہ بہرائچ کا گورنر تھا، بلا کر تخت پر بٹھا دیا گیا

سلطان علاء الدین کی معزولی کا سبب تلاش کرنے میں اس کی عقل و فراست و اخلاق کو داغدار کیا گیا ہے، مگر یہ بیان منہاج سراج صاحب طبقات ناصری کا ہے، جو بلبن کے عہد میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور تھا اور اس کے علٰحدہ ہونے کے بعد علٰحدہ کیا گیا۔ اور برسر اقتدار آنے کے بعد نئے سرے سے اس عہدے پر سرفراز کیا گیا تھا، پھر یہ سمجھنا کہ چار سال تک سلامت روی سے حکمرانی کرتا رہا اور پھر ایسے زمانہ میں کہ اس کے عہد میں مغلوں کو نمایاں شکست ہوئی پھر اس کی روش میں اچانک ایسی تبدیلی آگئی کہ اس کی معزولی ضروری قرار پائی، باور کرنا عقل سے بعید ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں امراء کی کش مکش جس طرح جاری تھی، اس میں ایسے حکمران کا صاحب تاج و تخت رہنا جو دوسرے امراء کے زیر اثر فرمان روائی کر چکا ہو بلبن کے کامل اقتدار کے لیے موزوں نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ اس لیے بلبن نے ایک نئے تاجدار کی ضرورت محسوس کی اور وہ ناصر الدین محمود کے ذریعہ سے پوری ہوئی۔

علاء الدین مسعود کا عہد حکومت سلطان علاء الدین مسعود لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق سے پیش آتا تھا، عدل و انصاف اور داد و دہش میں شہرت حاصل تھی، وزیر اعظم نظام الملک مستوفی سنہ ۶۴۲ھ / ۱۲۴۴ء میں قتل کیا گیا تو سلطان مسعود نے صدر الملک نجم الدین ابو بکر کو اس منصب پر مامور کیا جو اس کے آخر دور حکومت تک اس خدمت پر مامور رہا۔[۵۹]

سلطان ناصر الدین محمود سنہ ۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء – سنہ ۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء ناصر الدین محمود نے بلبن کو حجابت عظمٰی کے منصب پر برقرار رکھا اور "الغ خاں" کے خطاب سے سرفراز کیا، اور حکومت کا اقتدار جوں کا توں بلبن کے ہاتھوں میں رہا، اس نے سنہ ۶۴۷ھ / ۱۲۴۹ء میں سلطان کی بہن سے شادی کر لی جس سے اس کے اعزاز میں مزید ترقی ہوئی اور اس نے نائب مملکت کے عہدہ پر اپنے بھائی کشلو خاں کو مامور کیا اور اسی طرح مختلف عہدوں پر اور منصبوں پر اپنے آدمی مقرر کر دیے، ترک امراء بلبن کی حکمت عملیوں سے

---

[۵۹] طبقات ناصری ص ۱۹۷ تا ۲۰۱، ظفر نو الرتی ۲ ص ۱۰۷ تا ۱۲۷

غافل نہ تھے، وہ بھی اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے، ان دنوں ایک نئی قوت عماد الدین ریحانی کی سرکردگی میں ابھری، یہ ہندوستانی مسلمان تھا۔ ترکوں نے اس قلیم ہندی نومسلم افسر کے ذریعہ سے جو پہلے بلبن کے معتمدین میں سے تھا۔ اس کے خلاف مورچہ لگایا، اور سلطان ناصرالدین محمود نے ایک دن اچانک ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں بلبن کے حجابت کے عہدہ سے معزول ہونے اور عماد الدین ریحانی کے مقرر کیے جانے کا فرمان نافذ کیا، اور بلبن کو اس کی جاگیر قلعہ ہانسی میں چلے جانے کا حکم صادر ہوگیا، ریحانی نے برسر اقتدار آتے ہی اہم منصبوں سے بلبن کے آدمیوں کو معزول کرکے اپنے آدمی مقرر کیے، اور اپنا اقتدار قائم کرنے میں مصروف ہوگیا۔

لیکن بلبن نے پایۂ تخت سے نکل کر اپنی حکمت عملی سے ان ترک افسروں کو اپنا ہمنوا بنالیا، جو مختلف صوبوں کے حاکم تھے، اور ان کا متحدہ لشکر کوچ کرکے دلی آیا، اور سلطان کو اپنی اطاعت کا یقین دلاکر عماد الدین ریحانی کو معزول کرنے کا مطالبہ پیش کیا، چنانچہ سلطان نے فوجی طاقت کے آگے سپر ڈالی، عماد الدین ریحانی کو معزول کرکے بلبن کو نئے سرے سے حاجب مقرر کیا اور ریحانی کو پہلے بدایوں پھر بہرائچ بھیج دیا گیا، بلبن نے رمضان ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء میں وزارت عظمیٰ کا قلمدان نئے سرے سے سنبھال لیا۔

پھر آگے چل کر سلطان ناصرالدین محمود نے بلبن کو اپنا نائب مقرر کیا اور کہا میں تجھے اپنا نائب بناتا ہوں، اور امور سلطنت سونپتا ہوں، کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ کل خدا کے حضور میں مجھے اور تجھے دونوں کو شرمندہ ہونا پڑے۔ بلبن نے اپنے پرانے آدمیوں کو دوبارہ مقرر کردیا، چنانچہ صدر الملک نجم الدین پھر وزارت کے منصب پر آگئے اور ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء تک اس عہدہ پہ فائز رہے۔

اب سلطان شاہی محل میں شاہانہ شان و تمکنت سے بیٹھ چکا تھا اور لوگوں کی نگاہوں سے اسی طرح اوجھل ہوگیا، جیسے کہ اندلس میں خلیفہ ہشام اموی کو منصور عامری نے شاہی محل میں بٹھادیا تھا، یہاں تک کہ دلی کے ایک تاجر نے سلطان کی خدمت میں باریاب ہونے

کے لیے کثیر دولت نچھاور کرنا چاہی، مگر اس کو حضوری کا شرف نہ مل سکا، بلبن سلطنت کے سیاہ وسپید کا اندلس کے حاجب المنصور عامری کی طرح مالک تھا، اس لیے سلطان محمود کی حکمرانی کا زمانہ اگرچہ بیس سال تک رہا مگر اس عہد کی سیاسیات کی پوری تاریخ گویا بلبن ہی کی حکمرانی کی تاریخ ہے۔

لیکن امراء کی پارٹی بندی کا سلسلہ پھر بھی ختم نہیں ہو سکا ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء تک کا زمانہ بغاوتوں کے فرو کرنے میں گزرا اعماد الدین ریحانی نے بھی بغاوت کی اور قتل کیا گیا اسی طرح مرکز میں سیاسی ہلچل سے فائدہ اٹھا کر حاکم بنگال طغرل طغان خاں نے گویا اپنی خود مختاری قائم کر لی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کڑا مانک پور اور اودھ کے بعض علاقہ پر قبضہ کر لیا یہ گویا مرکزی حکومت کے لیے اس کی طرف سے ایک مستقل چیلنج تھا، بلبن نے اودھ کے گورنر تمر خاں کو اشارہ کیا اور ایسے موقع سے کہ اڑیسہ کی غیر مسلم ریاست جاج نگر سے طغان خاں شکست کھا کر واپس جا رہا تھا کہ تمر خاں ۶۴۲ھ ۱۲۴۴ء میں پایہ تخت لکھنوتی میں داخل ہو گیا، پھر ۶۴۴ھ ۱۲۴۶ء میں تمر خاں اور طغان خاں کی وفات کے بعد ازبک خاں نے خود مختاری کا اعلان کیا۔ یہاں تک کہ ۶۵۷ھ ۱۲۵۹ء میں ارسلان خاں حاکم کڑا نے اچانک حملہ آور ہو کر بنگال پر قبضہ کر لیا، اسی طرح اودھ، سندھ، پنجاب میں مقامی حالات پیش آتے گئے، بلبن نے دوبارہ قلمدان وزارت سنبھال کر ان سب صوبوں کی سیاسیات پر عبور حاصل کیا اور یکے بعد دیگرے اپنا اقتدار قائم کیا۔

اسی طرح ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء سے ۶۶۳ھ ۱۲۶۵ء تک کے زمانے میں مختلف غیر مسلم طاقتوں نے جاج نگر، بہار وغیرہ میں اپنی سطوت قائم رکھی اور اس کو ترقی دینے کی کوشش کی بہار میں مسلمان حکمرانوں کے اثرات شاہ آباد، پٹنہ، مونگیر اور بھاگل پور وغیرہ میں قائم ہوئے تھے لیکن جنوبی بہار میں بودھ گیا، رہتاس گڑھ وغیرہ کا وسیع علاقہ غیر مسلم حکمرانوں کے قبضہ میں تھا اور موقع پا کر ان کی تاختیں مسلم علاقوں پر جاری تھیں، چنانچہ تاج الدین سنجر کریت خاں بہار میں مارا گیا، لیکن بلبن کے

زمانہ تک ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں بہار دوبارہ مسلمانوں کے اقتدار میں آگیا تھا۔ اور غیر مسلم طاقتیں کمزور پڑ گئیں اور گیا بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا، چنانچہ ۶۶۷ھ/۱۲۶۸ء میں گیا کے ایک مصنف کی سنسکرت تصنیف میں بلبن کا نام حکمران کی حیثیت سے آیا ہے۔ تیرھویں صدی میں گیا کو دوسرے مذہبی مقاموں کی طرح ترکوں کے اقتدار سے نکالنے کی کوشش کی گئی، مگر کامیابی نہ ہوسکی۔ ترکی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو یہاں کے وہ راجہ بھی قبول کرنے پر مجبور ہوئے جو خود مختاری سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے، اسی طرح ریوا، کالنجر وغیرہ میں راجپوتوں نے سر اٹھایا، مگر وہ بھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کرسکے اگرچہ بندیل کھنڈ اور بعض جنوبی قلعوں پر ان کا قبضہ ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء سے ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء تک برقرار رہا۔ اسی طرح گوالیار، ترد ا، مالوہ، گجرات، مارواڑ وغیرہ کے بعض علاقوں پھر اودھ میں قنوج وتاردلی وغیرہ میں خود مختار حکومتیں ایک مختصر مدت کے لیے قائم ہوئیں، بلبن نے ان مسلم وغیر مسلم ابھرنے والی طاقتوں کو یا تو اپنی نیابت کے زمانہ میں یا آگے چل کر اپنی بادشاہی کے زمانہ میں زیر کرلیا، اس طرح بلبن اپنے دور کا ایک کامیاب حکمران تھا۔

سلطان ناصر الدین محمود نے ۱۲ جمادی الاولیٰ ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں وفات پائی، اس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، کہ جانشینی کا دعویٰ کرتی، ترک امراء التمش کے زمانے سے جس طرح جانشینی کا فیصلہ کرتے آئے تھے، اسی اصول کے مطابق بلبن نے اپنے کو مستحق سمجھا، اختیارات تو اس کے ہاتھ میں تھے ہی، اس نے بادشاہ کی وفات کے بعد تاج پوشی کی رسم بھی انجام دے لی،

سلطان [illegible] الدین بلبن
۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء

بلبن سلطان غیاث الدین کے لقب سے تخت پر متمکن ہوا تھا، وہ اسی ترکی قبیلہ البری کا ایک فرد تھا جس سے سلطان التمش کا نسلی تعلق تھا، قسمت نے [illegible] کے ہاتھوں ۶۳۰ھ/۱۲۳۳ء میں التمش کے دربار میں پہنچادیا تھا، ابتدائی خدمت کے بعد رضیہ کے عہد میں امیر شکار رہا، رفتہ رفتہ ترقی کرکے

نائب سلطنت قرار پایا، وہ اگرچہ اس خاندان کا خاتمہ ساز غلام تھا مگر ہم نسل ہونے کی وجہ سے شمسی خاندان سے اس رشتہ داری آسانی سے قائم ہو گئی، اور اپنی زندگی کے مختلف دوروں میں آگے بڑھتا ہوا تخت دہلی کا مالک بنا ... سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی، اور یہ بلبن ہی کے حصہ میں تھا، کہ وہ اس ... استحکام اور ترقی کے عروج پر پہنچائے۔

اس نے تخت نشینی کے بعد سلطنت کے وقار کو قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے فوج کو نئے سرے سے منظم کیا، اعلیٰ عہدوں اور منصبوں میں اپنی پسند کے آدمیوں میں ردوبدل کیا، پایۂ تخت کے قریب کے ان جنگلوں کو جہاں سرکش کمین گاہیں بناتے ہیں، صاف کیا، پایۂ تخت کے نظم سے فارغ ہو کر وہ دوآبہ اور اودھ میں آیا، اور سارے علاقہ کو کئی فوجی کمان میں تقسیم کیا؛ اسی طرح اس نے مختلف دوسرے مقاموں میں جنگلوں سے گزر کر سڑکیں نکالیں، اور پھر موقع موقع سے سرکشوں کو سزائیں بھی دیں ان حفظ ماتقدم کی تدابیر سے ملک میں امن وامان پیدا ہوا، اور لوگ زندگی کے مختلف کاموں کاشتکاری اور صنعت و حرفت وغیرہ میں امن و سکون سے لگ گئے۔

اس کے ساتھ اس نے اپنی حکومت کی داخلی حکمت عملی میں بھی نمایاں تبدیلی کی، اس نے سوچا کہ جب تک مغل غزنی پر قابض ہیں اور ہندستان پر حملہ آور ہونے کی طاقت ان میں موجود رہی، اس وقت تک ہندستان کے چھوٹے بڑے جو بھی اس وقت تک خود مختار رہیں، انھیں زیر کرنا اور ان سے لڑائی مول لینا صحیح نہ ہوگا، اس لیے صرف ان علاقہ کو اپنے زیر حکومت رکھا، جو پنجاب سے لکھنوتی تک اس کے قبضہ میں موجود تھا؛

بنگال کی بغاوت سلطان علاء الدین کے زمانہ میں بنگال میں طغا خاں کے بعد ملک قرا بیگ تیمور خاں پھر $\frac{655}{1257}$ میں ملک جلال الدین پھر $\frac{656}{1258}$ میں ارسلان خاں اور اس کی وفات کے بعد تاتار خاں یہاں کے والی یکے بعد دیگرے ہوئے، بلبن نے اپنے دور حکومت کے آغاز میں اس کو برقرار رکھا پھر $\frac{665}{1266}$ اور ... روایت $\frac{663}{1265}$ میں اس کو مرکز کی خدمات کے لیے بلا لیا، اور اپنے ایک غلام طغرل خاں کو یہاں کی گورنری

سپرد کی، اس نے قوت بہم پہنچا کر جاج نگر پر فوج کشی کر کے بے شمار دولت حاصل کی
اس اثنا میں ملتان پر مغلوں کے حملے شروع ہو گئے، پھر سلطان کی علالت کی خبر موت
کی افواہ میں بدل کر مشہور ہو گئی، ادھر مرکزی حکومت نے ہندستان کے خود مختار حکمرانوں
سے چھیڑ چھاڑ جاری نہ رکھنے کا بھی فیصلہ کیا تھا، ان اسباب سے طغرل خاں میں
خود مختاری کا حوصلہ پیدا ہوا، اس نے سلطان مغیث الدین کے لقب سے اپنی بادشاہی
کا اعلان کر دیا سلطان غیاث الدین کے لیے یہ اطلاع غیر متوقع تھی اس نے اودھ کے
گورنر محمد امین کو فوج کشی کا حکم دیا، اس نے شکست کھائی، تو ملک ترمتی کو مامور کیا، اس
کو بھی ہزیمت ہوئی اور کچھ لوگ طغرل سے مل گئے تو سلطان اپنی پیرانہ سالی کا خیال
نہ کر کے خود کمر ہمت چست کر کے اٹھ کھڑا ہوا، دو لاکھ فوج اس کے ہمرکاب ہوئی سخت
سے سخت بارش میں بھی سفر جاری رکھا، لکھنوتی کے قریب پہنچا تو طغرل خان فرار ہو گیا
سلطان نے کہا جب تک طغرل خاں کی گرفتاری عمل میں نہ آ جائے وہ واپس نہ ہو گا۔
آس پاس کے غیر مسلم جاگیرداروں نے بھی اس کی تلاش میں مدد دی، اتفاق سے سلطان
فوج کے ایک ہراول دستہ نے اچانک طغرل کو دیکھ لیا اور وہ فرار ہوا، تو تیر کا
نشانہ لگا کر گرا دیا اور سر کاٹ کر سلطان کے پاس لے آیا، سلطان نے لکھنوتی کے
بازار میں دو رویہ سولیاں نصب کرائیں اور باغی سرداروں اور طغرل کا ساتھ
دینے والوں کو منظر عام پر سولی پر لٹکایا، پھر لکھنوتی کی ولایت اپنے بیٹے بغرا خاں
محمود کو سپرد کی اور وصیت کی، کہ وہ دہلی کے بادشاہ کا ہمیشہ تابع فرمان رہے، چاہے بادشاہ
دہلی کو کوئی بیگانہ ہو یا اس کا رشتہ دار، کیونکہ لکھنوتی کا ملک کتنے ہی فاصلہ پر ہو
وہ دلی کے مضافات میں ہمیشہ داخل رہے گا اس کے بعد دہلی واپس چلا گیا۔

اسی زمانہ میں شاہزادہ محمد ملتان سے آیا تو اس کی ولیعہدی کا اعلان کیا، اور
پھر اس کو مغلوں کی خبر رکھنے کے لیے سرحد پر واپس کر دیا، کیونکہ سرحد کی حفاظت
اہم ترین مسائل میں سے تھی اس لیے کہ مغل اس وقت ایشیا پر چھا گئے تھے، بڑی بڑی
اسلامی سلطنتوں کو تباہ و برباد کر چکے تھے، ہندستان کی سمت بھی وہ آئے، مگر ترکوں

کی آبدار تلوار نے ان کا منہ موڑ دیا۔ ہندستان کی سرزمین کو منگولوں کی پامالی سے بچانے
میں بلبن کے اہم خدمات تھے،

منگولوں کا تعلق ہندستان سے | جس زمانہ میں ہندستان میں سلطان التمش
کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا، وسط ایشیا کے میدانوں کا خانہ بدوش قبیلہ منگول
چنگیز خاں کی سالاری میں اٹھا، اور خوارزمی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی
۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں خوارزم کا بادشاہ جلال الدین بھاگ کر دریائے سندھ کے کنارے آیا
چنگیز خاں سے یہاں معرکہ ہوا، پھر وہ شکست کھاکر دہلی میں پناہ گزیں ہوگیا، پھر ملتان اور
اچھ سے گزر کر ہندستان سے نکل گیا، اس کے بعد مغلوں کی مستقل یورش کا سلسلہ جاری ہوا
۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں وہ لاہور تک آگئے اور اس کو تباہ کیا، اس طرح ان میں پنجاب کی ملکیت
کا دعویٰ پیدا ہوگیا، وہ اپنے حملے کرتے رہے، چنانچہ ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء میں بلبن نے ملتان کو ان کے حملہ
سے بچالیا، اور باوجودیکہ یہ خونخوار قوم سارے ایشیا میں تہلکہ مچائے تھی مگر ہندستان کی
سلطنت کو بلبن کے مضبوط ہاتھوں میں دیکھ کر ہلاکو خاں کو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ
بڑھانا پڑا، چنانچہ ۶۵۷ھ/۱۲۵۸ء میں اس کے سفیر ہندستان میں آئے، بلبن نے ان کا ایسے
تزک و احتشام سے استقبال کیا، کہ منگولوں کی نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئیں، اگرچہ اس دوستانہ
سفارت کا کوئی پائدار اثر نہیں نکلا، مگر انھیں اس کا حوصلہ نہ ہوسکا کہ وہ دہلی کے تخت پر
بھی نگاہ ڈال سکیں، بااینہمہ وہ پنجاب دعوی سے دست بردار نہیں ہوئے اور اس پر شدید
حملے کرتے رہے، غیاث الدین بلبن نے شاہزادہ محمد کو مقابلہ کے لیے متعین کردیا تھا، وہ
۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء میں جب کہ سندھ و ملتان کا امیر تھا مغلوں سے ایک لڑائی میں کام آگیا، بااینہمہ
ہندستانی لشکر نے مغلوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا، یہ فتنہ اگرچہ کچھ دنوں کے لیے
دب گیا، مگر پنجاب میں اس کی چنگاری کسی نہ کسی طرح سلگتی رہی،

وفات اور جانشینی | سلطان غیاث الدین کے لیے اس نوجوان بیٹے کی جس کی ولیعہدی
کا اعلان بھی کرچکا تھا، موت کا حادثہ ایسا سخت تھا کہ وہ برداشت نہ کرسکا، اور وہ اس
کے لیے جان لیوا ثابت ہوا، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ مرض موت میں مبتلا ہوا، بغرا خاں

باپ کی عیادت کے لیے، سلطان نے بغرا خاں کو اپنا جانشین بنانا چاہا مگر وہ بنگال کی پرامن سلطنت پر دہلی کے تخت کو ترجیح نہ دے سکا، غیاث الدین کو اس کا افسوس ہوا، اور اس نے مقتول شاہزادہ محمد کے بیٹے کیخسرو کی ولیعہدی کا اعلان کیا، مگر غیاث الدین کی وفات کے بعد وزرا کے اشارے سے کیخسرو پایۂ تخت سے ملتان چلا گیا، اور بغرا خاں کے بیٹے معز الدین کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا گیا[1]۔

معز الدین کیقباد ۶۸۵ھ - ۶۸۸ھ / ۱۲۸۶ - ۱۲۸۹ء

کیقباد ۱۷ سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا، معز الدین اس کا لقب رکھا گیا

اس کی تخت نشینی بعض امرا کی سازشوں سے عمل میں آئی تھی، انہی نے کیخسرو کو فریب دے کر سندھ کی طرف بھگا دیا اور اپنے اثر و اقتدار کے لیے اس نوعمر کو تخت نشین کیا دوسرے مقتدر امرا بلبن کی وصیت کے پورے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مخالف رہے، مگر سلطنت کا کوئی دعوے دار موجود نہ تھا، اس لیے سب نے جبر و اکراہ سے اطاعت کرلی۔

کیقباد جن امرا کے ہاتھوں تخت سلطنت پر بیٹھا، وہ قدرتی طور پر صاحب اقتدار ہو گئے اور مختلف عہدوں میں رد و بدل ہوا۔ یوں تو وزارت و نیابت سب ہی عہدوں پر مختلف لوگ مامور کیے گئے، مگر اصل طاقت ملک الامرا فخر الدین کوتوال کے داماد ملک نظام الدین کے ہاتھوں میں آگئی، جو داوبگی کے عہدہ پر مامور تھا اس نے سلطان کا اعتماد حاصل کرلیا، اور پوری طرح اس کو قابو میں کرلیا اس کی بیوی شاہی محل میں پہونچ گئی اور سلطان کی منھ بولی ماں بن کر اندرون خانہ کے انتظام کو ہاتھ میں لے لیا، رفتہ رفتہ اس کو خود صاحب تخت و تاج ہونے کا خیال پیدا ہو گیا، ملک فخر الدین کوتوال نے اس کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا مگر وہ اپنی دھن میں لگا رہا، سلطان کو عیش و عشرت کی راہ پر لگا دیا، اور

---

[1] طبقات ناصری ص ۲۰۱ تا ۲۲۸ و ۲۲۸ تا ۲۳۲، ۲۴۰، ۲۳۵، ۲۴۴ تا ۲۴۶، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۶، ۲۷۰، ظفر الوالہ (حاجی) دبیر ج ۲ ص ۷۱۲ تا ۷۳۰، دبیر اور دوسرے مورخین نے بلبن کا سال جلوس ۶۶۲ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں، ۶۶۵ھ کا سکہ بنام محمود دریافت ہو چکا ہے، ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۶، ۲۹، فرشتہ ج ۱ ص ۷۴ تا ۷۵

ایسی صورتیں اختیار کیں، کہ انقلاب سلطنت کا موقع ہاتھ آسکے،

اس سلسلہ میں اس کو کیخسرو کی طرف سے کھٹکا تھا، اس نے سلطان کو سمجھا کر اس کے قتل کرانے کا حکم جاری کر دیا، چنانچہ کیخسرو کو دہلی آنے کی دعوت دی گئی اور راہ میں اس کو فریب سے قتل کرا دیا۔

بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات بغرا خاں نے بنگال میں دار السلطنت کے حالات سنکر اپنے بیٹے کی بے راہ روی سے خاندان سے سلطنت کے نکلنے کا خطرہ محسوس کر کے بیٹے کو نصیحت آمیز خطوط بھیجے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، تو ملاقات کا قصد کیا لیکن چونکہ اس نے بنگال میں سلطان ناصر الدین کا لقب اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا۔ اور ملک نظام الدین نے کیخسرو کو راہ سے ہٹانے کے بعد بغرا خاں کے نصنہ کو بھی پاک کرنا چاہا، اس لیے کیقباد کو یہ سمجھا دینا آسان ہوا کہ وہ اگرچہ باپ ہی، مگر سلطنت کی راہ میں باپ بیٹے کا رشتہ نہیں ہوتا اس نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر کے ایک قسم کی بغاوت کی ہی اور اب دلی کے تخت کی ہوس اس کے دل میں پیدا ہوئی ہی، کیقباد کے دل میں خطرات پیدا ہو گئے، اس لیے اس نے اثنائے راہ میں اودھ میں سرجو کے کنارے ملاقات کا مقام مقرر کیا اور نظام الدین کے مشورہ سے لشکر بھی ساتھ لے گیا، بغرا خاں کو یہ حالات معلوم ہوئے، تو وہ بھی فوجی طاقت کے ساتھ روانہ ہوا اور سرجو کے دونوں کناروں پر باپ بیٹے کے فوجی پڑاؤ پڑ گئے نظام الدین کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح ان دونوں میں جنگ چھڑ جائے اور ملاقات کے لیے بیٹے نے سخت شرطیں عائد کرائیں بغرا نے تدبر اور ہوش مندی سے کام لے کر سب شرطیں منظور کرتا گیا، آخر میں اس نے کہا میں سلطان بلبن کا پسر ہوں، اور دہلی کے تخت کا میں حقدار تھا، مگر وہ میرے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶) فیروز شاہی برنی ص ۲۳، ۲۴، ۲۵ تا ۱۲۵، قران السعدین خسرو ص ۱۸، ریاض السلاطین ص ۷۳ تا ۷۵، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۲۰ تا ۳۲ و ۱۵۱ تا ۴۸، اے ہسٹری آف اڑیسہ بنرجی ۵ ا ص ۲۶۳ ۲ گیانگ بیٹر ص ۲۰۸، نزہتہ الخواطر ص ۲۱۹، ۱۲۳،

بیٹے کے قدموں کے نیچے آ گیا ہے، اور وہ میرے باپ کی جگہ بیٹھا ہے دہلی کے تخت کی
عزت سلاطین دیار کرتے آئے ہیں، میں بھی اس کا احترام ملحوظ رکھوں گا، اور
ویسی ہی حاضری دوں گا جیسے شہنشاہ کے دربار میں پہنچا جاتا ہے بغرا خاں کی
اس تحریر کے بعد ملک نظام الدین کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ حیلہ جوئی سے کام لے کر
ان دونوں کی ملاقات کو مزید "معرض التوا میں ڈال سکتا، چنانچہ "شہنشاہ کے دربار"
میں بنگال کے اپنے "حاکم" کو جو اپنے نام کا سکہ و خطبہ بھی جاری کرنے کی جرأت کر چکا
تھا، حاضری کی اجازت عطا ہوئی اور وہ دریائے سرجو کو عبور کر کے شاہی خیمہ میں
حاضری دینے کے لیے گیا اور دربار میں پہنچ کر اپنی اسی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر شاہی مراسم
ادا کرتا اور جب دستور زمین بوس ہوتا آہستہ خرامی سے سلطان کے روبرو بڑھتا گیا
ادھر "نگاہ روبرو سلطان جہاں پناہ" کی صدا چوبدار نے لگائی، اور "لکھنوتی کے
گناہ گار کو امان" کی آواز بھی بلند کی گئی، بغرا خاں تخت کے سامنے پہونچ کر مؤدب
کھڑا ہو گیا، اور کیقباد شاہانہ جاہ و تمکنت سے تخت پر متمکن رہا، بغرا خان اس نظارہ کی
تاب زیادہ دیر تک نہ لا سکا، اور وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اب بیٹے کے لیے
بھی اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا دشوار ہو گیا، تخت سے اترا اور لپک کر باپ کے قدموں
پر سر رکھ دیا۔ باپ نے اٹھا کر گلے سے لگایا، اور دونوں دل بھر کر روئے، اور اس منظر
سے سارے درباریوں پر رقت و گریہ طاری ہو گیا،

اس کے بعد مختلف نشستوں میں باپ نے بیٹے کو نصیحتیں کیں، اور سلطنت کے
نشیب و فراز سمجھانے اور اخلاق اور دینداری کے درس کی تلقین کی، اس کی
نصیحتوں کو مورخین نے قلم بند کیا ہے، ملک نظام الدین اور ملک قوام الدین کو ساتھ
بلا کر بھی سلطنت کے متعلق مختلف باتیں سمجھائیں، پھر علیحدہ طریقہ سے نظام الدین سے
ہوشیار رہنے کی تلقین کی، بغرا خاں کو بیٹے سے دلی تعلق تھا، وہ سلطنت کے شیرازہ
کو بھی قائم رکھنے کا خواہش مند تھا، مگر حالات و قرائن سے اس کو اندازہ ہو چکا تھا
کہ دہلی کا تخت اس کے خاندان سے نکلتا ہے، اس نے واپسی کے بعد اپنے رفیقوں سے کہا:-

یہ بیٹے سخت جگر سے میری آخری ملاقات ہو، واپسی کے رقت آمیز منظر کا نقشہ بھی مورخین نے کھینچا ہے، کیقباد باپ کی نصیحتوں سے کسی قدر متاثر ہوا، سفر کی واپسی میں چند منزلوں تک اس نے شراب نہیں پی، عیش وعشرت کی زندگی بھی ترک کردی، مگر ملک نظام الدین نے حسین عورتوں کے جھرمٹ کو پیش کرکے آخر پھر اس نے اس کو اسی راہ پر لگا دیا،

ملک نظام الدین کا زوال

لیکن نظام الدین کے متعلق بغرا خاں نے اس سے جو کچھ کہا تھا، وہ اس کے دل نشین ہو چکا تھا، دہلی پہونچنے کے کچھ دنوں کے بعد اس کو باپ کی بات یاد آئی، اس نے نظام الدین کو کیخسرو کی جگہ ملتان کی گورنری پر جانے کو کہا وہ اصل مقصد سمجھ گیا، اور حیلہ جوئی سے دہلی ہی میں ٹھہرا رہا، کیقباد نے زہر دلوا کر اس کا کام تمام کرا دیا، اس کے بعد ایک خلجی امیر ملک فیروز کو اس نے حجابت کے عہدہ پر مامور کیا، مگر خود اس کی عادتیں جو بگڑ چکی تھیں وہ درست نہیں ہوئیں، رفتہ رفتہ ملک فیروز خلجی کے اقتدار میں اضافہ ہوتا گیا، اس کے ساتھ کیقباد کی غیر محتاط زندگی سے اس کی صحت بھی بگڑ چکی تھی، وہ دفعۃً لقوہ اور فالج میں مبتلا ہوا، اور نقل وحرکت سے بھی معذور ہو گیا،

نئے تاجدار کا سوال

اب دربار کے امراء کے سامنے دہلی کے آئندہ تاجدار کا سوال تھا، وہ پھر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے، ایک طرف ملک فیروز کی سیادت میں خلجی تھے، یہ بہادر پور میں چلے آئے، دوسرا گروہ ملک ایتمر سرخا کی سرکردگی میں ترکوں کا تھا، وہ کیقباد کے سہ سالہ بچے کیومرث کو شاہی محل سے نکال کر چبوترہ ناصری کے میدان میں چلے آئے، اور ان دونوں گروہوں میں اقتدار اعلیٰ کو ہاتھ میں لینے کے لیے کش مکش شروع ہو گئی،

شمس الدین کیومرث

سنہ ۶۸۸ھ – سنہ ۶۸۹ھ
۱۲۸۹ء – ۱۲۹۰ء

ملک ایتمر سرخا نے کیومرث کی تاج پوشی کی رسم انجام دی، اور شمس الدین لقب دیا، تین مہینے کے بعد خلجیوں نے ترکوں کا محاصرہ کرکے کیومرث کو چھین لیا،

ملک ایتمر سرخا مارا گیا، سرکشوں نے کیقباد کو جو مردہ حال بستر پر پڑا سسکیاں لے رہا تھا، بے دردی سے پیٹا، پھر بستر سمیت اٹھا کر جمنا کی لہروں کے سپرد کر دیا،

اب دہلی میں بلبن کے خاندان کا کوئی وارث موجود نہیں تھا، طاقت خلجیوں کے ہاتھ میں آچکی تھی، چنانچہ انھوں نے خلجی سردار ملک فیروز کو سلطان جلال الدین خلجی کے نام و لقب سے تخت نشین کیا اور مملوک سلاطین دہلی کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا[۵۱]

علم و فضل کی ترقی اور اکابر و اعیان

رکن الدین فیروز شاہ کے عہد آغاز ۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ سے معز الدین کیقباد کے زمانہ کے خاتمہ ۶۸۹ھ / ۱۲۸۹ کی نصف صدی سے اوپر مدت میں بہت سے ممتاز علما و صوفیہ گذرے جن کے روشن کارنامے یہاں کے تمدن کے مختلف شعبوں کو ترقی دینے میں انجام پائے، ان میں سے بہت سے ایسے ممتاز اعیان ہیں، جن کے درخشاں خدمات کا سلسلہ خصوصاً سلطانہ رضیہ کے عہد سے بلبن کے زمانہ تک کسی نہ کسی حیثیت سے جاری رہا، یہ اساتذۂ فن اپنے اپنے مستقر پر بیٹھے تھے، اور اپنی جگہ خود ایک مستقل درس گاہ تھے، سلاطین کے دور میں مستقل مدرسے بھی جاری رہے، جن میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم جاری تھی

اس دور میں ملک کی علمی و تعلیمی ترقی کا خاص سبب یہ تھا، کہ خود سلاطین کو علم و فضل سے دلی لگاؤ قائم تھا، چنانچہ سلطان التمش کے بعد جو سلاطین تخت دہلی پر آئے، ان میں بیشتر خود صاحب علم و فضل تھے، علما و صلحا کی قدر کرتے تھے اور علوم و فنون کی ترقی میں حصہ لیتے رہے، نیز ان میں سے بیشتر سلاطین دیندار تھے، صلحا و مشائخ کا احترام کرتے تھے اور ان کے ذریعہ رشد و ہدایت کی جو خدمت جاری تھی، اس میں معاون ہوتے، چنانچہ سلطان ناصر الدین محمود کے متعلق مورخین کہتے ہیں، ہر سال قرآن مجید کے دو نسخے لکھا کرتا، عبادت و ریاضت میں وقت گزارتا تھا[۵۲]۔ سلطان غیاث الدین اپنے دور کا بہترین حکمران تھا، علما و فضلا اور صلحائے امت و مشائخ کا قدردان و ادب شناس تھا

---

[۵۱] ظفر الوالہ حاجی دبیر ج ۲ ص ۳۸، تا ۴۲، ۷، تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲۶ تا ۱۷۳، ۱۱۰، ۱۲۱، ۱۱۱ قران السعدین ص ۳۴، ۳۵، ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۹ فرشتہ ج ۱ ص ۸۹ فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۱۷۵ تا ۱۸۸

[۵۲] نزہۃ الخواطر ص ۲۲۹۔

شیخ برہان بلخی، شیخ سراج الدین سجزی اور شیخ نجم الدین دمشقی وغیرہ کی مجلسوں اور حلقۂ درس میں جانے اور علمی فیوض سے بہرہ اندوز ہونے کا وقت بھی نکالتا تھا، اس کی اس علمی دلچسپی سے اس عہد میں علماء و فضلاء کی منزلت بڑھی اور علوم کی اشاعت کے مواقع پیدا ہوئے، اس کے زمانے کو "خیر الاعصار" کہا گیا ہی، اس دور میں بڑے بڑے اکابر صلحائے امت و مشائخ موجود تھے، اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کو وہ اپنی سعادت تصور کرتا تھا۔[۱]

نیز شاہی خانوادہ کے دوسرے ارکان بھی علم و فضل و صلاح و تقویٰ کے قدردان تھے، سلطان غیاث الدین نے اپنے بیٹے شاہزادہ محمد کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا، وہ علوم و فنون اور علماء و صلحا کا قدردان تھا، امیر خسرو اور امیر حسن اس کے دامن دولت سے وابستہ تھے، ان کے علمی کمالات اسی دور میں نمایاں ہو چکے تھے، اس نے شیخ سعدی شیرازی کو دو مرتبہ کثیر عطایا بھیج کر ملتان آنے کی دعوت دی کہ وہ ان کے لیے خانقاہ تعمیر کرائے گا اور جاگیریں وقف کرے گا، مگر شیخ نے ہر مرتبہ اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے معذوری ظاہر کی، فن انشاء و شعر میں بھی اس کو کامل مہارت حاصل تھی، امیر خسرو نے اس کا پر درد مرثیہ لکھا ہی جو اہل علم میں شہرت رکھتا ہی۔[۲]

سلطان غیاث الدین کا بھتیجا امیر علاؤ الدین محمد بن کشلی خاں وادی علم و فضل کی قدردانی میں اپنے دور میں بے مثال سمجھا جاتا تھا اس کی داد و دہش کی شہرت سن کر عراق، عرب، مصر، شام، و تتار سے لوگ اس کے در دولت پر آتے اور کامران واپس جاتے تھے۔[۳]

سلطان غیاث الدین کا دوسرا بیٹا ناصر الدین محمود معروف بہ بغرا خاں بھی علم و فضل کی قدردانی میں شہرت رکھتا تھا، ناصر الدین محمود اور معز الدین کیقباد کی تاریخی ملاقات جو دریا کے کنارے ہوئی تھی، امیر خسرو کا قران السعدین اسی کا آئینہ دار ہی بغرا خاں نے ۶۹۱ھ / ۱۲۹۲ء میں وفات پائی اس دور کے حسب ذیل ممتاز اعیان، دفضلاء

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۹۰ [۲] ایضاً ص ۱۷۰، [۳] ایضاً ص ۱۸۰ [illegible]

علما، ادبا، شعرا، مصنفین، اور ارباب خیر و صلاح خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔

قضاۃ و صدر جہاں | صدر جہاں یا قاضی ممالیک کے عہدہ پر ملک کے نامور اہل علم مامور کئے جاتے تھے، چنانچہ طبقات ناصری کے مشہور مصنف قاضی ابو عمر عثمان بن محمد جوزجانی معروف بہ منہاج سراج اس منصب پر ۶۵۳ھ (۱۲۵۵ء) تک مختلف زمانوں میں سرفراز رہے، منہاج کا تعلق دہلی کی سلطنت سے التمش کے زمانہ میں پیدا ہوا، وہ ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں پیدا ہوئے، تحصیل علوم کے بعد ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) میں اچھ میں آئے، ناصر الدین قباچہ نے مدرسہ فیروزیہ میں درس و تدریس اور اس کے لڑکے بہرام شاہ نے قضاء عسکر کے منصب پر مامور کیا، ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) میں سلطان التمش نے گوالیار کے امور شرعیہ کا حاکم، قاضی خطیب اور امام مقرر کیا، ۶۳۵ھ (۱۲۳۷ء) تک یہاں خدمت انجام دیتے رہے، سلطانہ رضیہ کے زمانے میں وہ دلی آئے تو سلطانہ نے مدرسہ ناصریہ دہلی کے اوقاف کا والی مقرر کیا اور گوالیار کی قضاءت کا منصب بدستور قائم رہا، پھر بہرام شاہ نے دار السلطنت دہلی کا قاضی مقرر کیا، ۶۳۹ھ (۱۲۴۱ء) تک وہ اس خدمت پر مامور رہے، مسعود شاہ کے زمانہ میں وہ دہلی سے لکھنوتی گئے، طغرل طغان نے عزت و احترام سے جگہ دی دو سال کے بعد پھر دہلی واپس آئے اور ۶۴۳ھ (۱۲۴۵ء) میں بلبن نائب سلطنت نے گوالیار کی قضاءت و خطابت پر دوبارہ مامور کیا، پھر اسی سال مدرسہ ناصریہ دہلی کا سابق عہدہ بھی انھیں مل گیا، پھر ۶۵۲ھ (۱۲۵۴ء) میں صدر جہاں کے منصب پر مامور کئے گئے۔

ان کی تصنیفات کا سلسلہ ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء) سے شروع ہوا، سب سے پہلے التمش کا رزم نامہ "ناصری نامہ" کے نام سے لکھا، بلبن نے قدر دانی سے اس کا صلہ بڑھایا اور رفتہ رفتہ مختلف جاگیریں عطا ہوئیں، قاضی منہاج فقہ، اصول، سیر، تاریخ، اور شعر میں دستگاہ رکھتے تھے، تصوف کا بھی مذاق تھا، حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار میں حاضری دیتے تھے، التمش کی شان میں متعدد قصیدے بھی ہیں۔ طبقات ناصری ۲۳ جلدوں میں لکھی، طبقات ناصری کے نام سے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۴ء میں جو جلد شائع کی ہے وہ اصل کتاب کی انیسویں سے اکیسویں جلد تک پر مشتمل ہے۔[۱]

(۲) قاضی جلال الدین کاشانی قاضی رجیف حبش کے عہدہ پر بہرام شاہ کے زمانہ تک مامور رہے اس نے ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ میں انھیں معزول کیا تو اودھ چلے گئے، اور وہاں عہدۂ قضا کی خدمت انجام دی علاء الدین مسعود نے انھیں دوبارہ طلب کیا، اور ۶۴۱ھ ۱۲۴۳ میں سفارت کی خدمت سپرد کر کے لکھنوتی بھیجا، پھر دہلی کے صدر جہانی کے عہدے پر سلطان ناصر الدین محمود نے ۶۴۷ھ ۱۲۴۹ میں دوبارہ تقرر کیا اس منصب پر مامور رہ کر ۶۴۸ھ ۱۲۵۰ میں وفات پائی[۱]

(۳) قاضی شمس الدین مارہروی بہرام شاہ کے زمانہ میں مارہرہ کے قاضی تھے ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ میں شیخ ایوب ترکمانی کے اشارہ سے بعض الزامات کی بنا پر اس نے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈال کر بے رحمی سے جان لی۔[۲]

(۴) شیخ عماد الدین محمد شقورقانی سلطان مسعود کے زمانہ میں ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ میں دہلی کے قاضی مقرر ہوئے ۶۴۶ھ ۱۲۴۸ میں معزول کر کے بدایوں بھیجے گئے، پھر عماد الدین ریحانی نے اسی سال ماہ ذی الحجہ میں انھیں قتل کر دیا۔[۳]

(۵) قاضی شمس الدین بہرائچی کو سلطان ناصر الدین محمود نے اپنی ولایت بہرائچ کے زمانہ میں یہاں کا قاضی مقرر کیا تھا جب وہ سریر سلطنت پر بیٹھا تو ۶۵۰ھ ۱۲۵۲ میں دہلی بلا کر یہاں کی قضاءت کی خدمت سپرد کی اور ۶۵۳ھ ۱۲۵۵ میں معزول کیا، جب امراء نے اس کے خلاف ۶۵۵ھ ۱۲۵۷ میں بغاوت کی، تو اس کا اہتمام ان پر بھی رکھا گیا، اور اسی سال وہ دہلی سے جلاوطن کر دیے گئے اور بہرائچ میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی[۴]

(۶) قاضی جمال الدین محمد بسطامی کو سلطان ناصر الدین نے ۶۵۳ھ میں شیخ الاسلام کے منصب پر سرفراز کیا۔ ۶۵۷ھ میں انھوں نے وفات پائی[۵]

(۷) قاضی جلال الدین کاشانی سلطان معز الدین کیقباد کے عہد میں دہلی

---

[۱] نزہۃ الخواطر ص ۱۳۴ ج اول حصہ اول [۲] ایضاً ۱۶۰، [۳] ایضاً ص ۱۴۴ [۴] ایضاً ص ۱۲۹، [۵] ایضاً ص ۲۲۶

میں عہدۂ قضا پر مامور تھے۔ سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے انھیں دہلی سے علحدہ کرکے بدایوں کی قضاءت پر مامور کردیا، اور یہی مملوک سلاطین کے دور کے آخری قاضی تھے۔[۱]

ممتاز اہل علم: امام رضی الدین حسن بن محمد صنعانی اس دور کے ان مشاہیر اہل علم میں سے ہیں، جن پر عالم اسلامی کو ناز تھا، وہ ۵۷۷ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے یہیں نشوونما پائی، اپنے والد شیخ محمد بن حسن صنعانی سے علوم کی تحصیل کی اور ارباب فضل میں شمار کیے گئے، سلطان قطب الدین ایبک نے قضاءت پیش کی مگر علوم کی تکمیل پیش نظر تھی، عہدہ قبول نہیں کیا، لاہور سے غزنی گئے کچھ دنوں وہاں درس و تدریس کی خدمات انجام دی۔ پھر اس دور میں عالم اسلام میں علم و فن کے جو اہم مرکز تھے، اور جہاں ممتاز شیوخ علم کی مسند درس بچھی ہوئی تھی، وہاں پہنچے اور علم و عرفان کی دولت سے مالامال ہوئے ۶۱۵ھ میں خلیفہ الناصر الدین اللہ عباسی نے خلعت سے نوازا اور ۶۱۷ھ میں اپنا فرمان دے کر سلطان شمس الدین التمش کی خدمت میں بھیجا ہندستان پہونچ کر انھوں نے یہیں مستقل بود و باش اختیار کرلی۔

اس کے بعد ۶۲۴ھ میں وہ پھر حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اور عالم اسلام میں علوم کی خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر خلیفہ المستنصر عباسی کی نگاہ انتخاب بھی ان ہی پر پڑی اس نے ان کو سلطانہ رضیہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، اور یہاں وہ دوبارہ قیام فرما ہو اس کے بعد ۶۳۷ھ میں وہ پھر بغداد تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی اور ابتداءً وہیں مدفون ہوئے، پھر وصیت کے مطابق لاش مکۂ معظمہ لے جائی گئی اور وہی ان کا ابدی خواب گاہ بنا۔

علامہ صنعانی علوم حدیث، فقہ اور لغت کے امام تھے، عالم اسلام کے جلیل القدر علما و مصنفین نے ان علوم میں ان کے علوئے مرتبت کا عقیدت کے ساتھ اعتراف کیا ہے شیخ شرف الدین دمیاطی، محمد بن عمر سہروردی، ابن صباغ، برہان الدین محمود بن

---

[۱] نزہتہ الخواطر جلد ۲ ص ۲۳ [۲] نزہتہ الخواطر ج ۱ ص ۱۳۷

اسعد بلخی وغیرہ ان کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں، ان ہی علوم میں ان کی بہت سی جلیل القدر تصنیفات ہیں، علم حدیث میں ان کی شہرۂ آفاق تصنیف مشارق الانوار کی ضیا پاشیوں سے ہندستان کے گوشہ گوشہ میں علم حدیث کی روشنی پہونچی، عالم اسلام کی ممتاز اہل علم نے اس کی بہ کثرت شرحیں لکھیں، جن کا تذکرہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے، حدیث میں ان کی دوسری تصنیف مصباح الدجی فی حدیث المصطفیٰ اور الشمس المنیرہ وغیرہ ہیں، اسی طرح فن لغت میں العباب الزاخر مجمع البحرین النوادر فی اللغۃ و التراکیب وغیرہ کو عام شہرت حاصل ہے، اسی طرح حدیث، فقہ اور لغت میں ان کی دیگر تصنیفات ہیں[۱]۔

مولانا شہاب الدین بدایونی اس عہد کے ممتاز افاضل میں تھے، امیر خسرو نے ان کی شان میں قصائد لکھے ہیں، شیخ ضیاء الدین بخشی ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ شیخ اسحٰق بن علی بخاری اس عہد کے ممتاز اہل علم صوفیہ میں سے تھے وہ شیخ منہاج الدین علی بن اسحٰق بخاری کے صاحبزادے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے وہیں نشو ونما پائی، مدرسہ معزیہ میں ایک مدت تک درس وتدریس کی خدمت انجام دی، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر سے بیعت کی، انھوں نے خرقۂ خلافت بھی عطا کیا، مختلف علوم میں دستگاہ رکھتے تھے "اسرار الاولیاء" کے نام سے اپنے شیخ کے ملفوظات جمع کئے تھے، علم صرف میں ایک منظوم رسالہ بھی لکھا، ۶۹۰ھ ۱۲۹۱ء میں وفات پائی[۲]۔

علامہ برہان الدین محمود بن ابو الخیر اسعد بلخی اپنے دور کے افاضل روزگار میں سے تھے کہا جاتا ہے کہ نحو، لغت، فقہ، حدیث، اور علوم عقلی میں ان کے [illegible] میں ہندستان میں ان سے بڑا عالم کوئی دوسرا نہ تھا، فقہ کی تحصیل ہدایہ کے مصنف شیخ برہان الدین مرغینانی سے کی، حدیث امام صغانی صاحب مشارق الانوار سے پڑھی، اسی کے بعد ہندستان وارد ہوئے اور [illegible]

[illegible]

ان کی پذیرائی ہوئی، سلطان غیاث الدین اُن کا احترام کرتا، اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض اٹھاتا تھا، ۶۸۶ھ/۱۲۸۷ء میں وفات پائی، دہلی میں حوض شمسی کے قریب دفن کئے گئے[۵۱]۔

علامہ نجم الدین عبد العزیز بن محمد دمشقی دہلوی علوم عقلیہ کے ماہرین میں سے تھے امام فخر الدین رازی سے علوم کی تحصیل کی، اس کے بعد ہندستان وارد ہوئے اور یہاں کے ملوک و امرا نے ان کے ورود کو مغتنم سمجھا، سلطان غیاث الدین ہر ہفتہ ان کی خدمت اور ان کی صحبت سے حظ اٹھاتا تھا[۵۲]۔

مولانا شمس الدین خوارزمی سلطان غیاث الدین کے عہد کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے، سلطان نے شمس الملک کا لقب عطا کیا، حضرت نظام الدین اولیا، قطب الدین ناقلہ اور شیخ برہان الدین عبد الباقی وغیرہ جیسے اکابر ان کے تلامذہ میں سے تھے[۵۳]۔

مولانا برہان الدین بزاز حنفی دہلوی دہلی کے ممتاز فقہا میں سے تھے، درس و تدریس کا مشغلہ جاری تھا، غیاث الدین بلبن عزت و اکرام سے پیش آتا تھا[۵۴]۔

مولانا برہان الدین نسفی بھی دہلی کے فقہا میں سے تھے، مسند درس بچھی ہوئی تھی جب کوئی طالب علم آتا تو اس سے تین اقرار لیتے تھے، اول یہ کہ شب و روز میں صرف ایک مرتبہ کھائے گا۔ درس میں کسی دن بھی تاخیر سے نہ پہنچے گا۔ اگر اس کے خلاف ہوا تو پھر اس کو کبھی درس میں بیٹھنے کا حق نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ اثنائے راہ میں بجز سلام مسنون کے تعظیم کا کوئی اور طریقہ ان کے ساتھ اختیار نہیں کرے گا۔ بڑے بڑے علما و مشائخ ان کے حلقۂ درس سے فیض یاب ہوئے[۵۵]۔

حکیم حسام الدین مارکلی عہد بلبن میں دار السلطنت کے ممتاز اطبا میں سے تھے، درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری تھا[۵۶]۔

شیخ ابو بکر بن یوسف سجزی دہلی کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے، غیاث الدین بلبن بڑی عزت کرتا، اور ہر جمعہ کو نماز کے بعد ان کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا[۵۷]۔

---

۵۱ نزہۃ الخواطر ۲۳۰ ۵۲ ایضاً ۱۷۲ ۵۳ ایضاً ۱۰۶ ۵۴ ایضاً ص ۱۲۸ ۵۵ ایضاً ۱۲۸ ۵۶ ایضاً ۱۴۳ ۵۷ ایضاً ۱۲۱

سید صدر الدین محمد بن سندھی اپنے عہد کے ممتاز علماء میں تھے، ۷۶۹ھ / ۱۱۷۲ میں وفات پائی۔ بھکر میں مدفون ہوئے۔[1]

اسی طرح اس دور کے ممتاز علماء، فقہاء، محدثین میں شیخ کمال الدین احمد تمیمی محدث متوفی ۶۷۱ھ / ۱۲۷۲، قاضی رفیع الدین گاذرونی فقیہ (نزہتہ الخواطر ۱۵۵) قاضی رکن الدین سامانی فقیہ (" ۱۵۵) مولانا زین الدین بدایونی (نزہتہ الخواطر ص ۱۶۰) مولانا سراج الدین ترمذی (" ۱۶۱) مولانا سدید الدین دہلوی فقیہ (" ص ۱۶۱) مولانا شرف الدین والوالجی فقیہ (" ۱۶۳) قاضی ظہیر الدین دہلوی فقیہ (" ۱۷۱) قاضی کمال الدین جعفری صاحب کتاب المغنی فی الفقہ (" ۲۰۱) شیخ مجد الدین بن خطیر الدین لاہوری صاحب تصانیف مشہورہ (" ص ۲۰۲) شیخ یعقوب بن احمد نہروانی متوفی ۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ (" ۲۴۹) وغیرہ تھے جو اپنے زمانہ میں اپنی اپنی مسند درس بچھائے تھے اور ان کے وجود سے علم کا عام فیض جاری تھا۔

مشائخ اس دور کو اکابر مشائخ میں سے حضرت خواجہ فرید الدین مسعود بن سلیمان اجودھنی معروف بہ گنج شکر کے وجود گرامی سے شرف حاصل تھا وہ حضرت خواجہ بختیار کاکی علیہ الرحمہ کے اجل خلفاء میں سے تھے ضلع ملتان کے قصبہ کھتوال میں پیدا ہوئے یہیں نشو و نما پائی، اور ملتان میں تعلیم کی تکمیل فرمائی، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی سے فیض یاب ہوئے، یہیں حضرت بختیار کاکی سے شرف نیاز حاصل ہوا، فرید تعلیم کی ہدایت پاکر قندھار، سیستان، بدخشان، اور بغداد تشریف لے گئے، حضرت شہاب الدین سہروردی، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ سعد الدین حموی سے فیض حاصل کیا، واپسی کے بعد دہلی میں حضرت کاکی کی خدمت میں اقامت اختیار فرمائی اور مجاہدہ و ریاضت میں مصروف ہوئے، حضرت خواجہ اجمیری نے فیض بخشا، اور حضرت کاکی نے دستار خلافت سر پر باندھی، پھر شیخ کے حکم کے مطابق ہانسی تشریف لے گئے اور وہیں بارہ سال قیام فرمایا جب خلائق کا ہجوم بڑھا، تو اجودھن چلے گئے اور اسی کو اپنا مستقر بنایا، خوارق عادات و کرامات کثرت سے منقول ہیں، دنیا

[1] نزہتہ الخواطر صفحہ ۲۲۰

اور اس کی دولت و ثروت سے بے نیاز رہی، سلطان علاء الدین محمود آپ کی خدمت میں باریاب ہوا، بلبن کے توسط سے چند گانوں کی معافی کا پروانہ دیا۔ حضرت نے قبول کرنے سے انکار فرمایا، بلبن جو آگے چل کر سلطان غیاث الدین ہوا، کی بیٹی حضرت کے عقد نکاح میں تھی اور سریر سلطنت پر بیٹھنے کے بعد بھی خانقاہ میں حاضری دیتا رہا، مگر حضرت کی شان استغنا میں کبھی فرق نہ آیا، ایک مرتبہ کسی شخص نے سفارش کے لیے مجبور کیا تو حضرت نے غیاث الدین کو حسب ذیل تحریر لکھ بھیجی:

"میں نے اس کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا، پھر تمہارے سامنے لایا ہوں۔ اگر تم نے اس کو عطا کیا تو عطا فرمانے والا وہی اللہ تعالیٰ ہوگا اور تمہارا شکریہ ادا ہوگا، اور اگر تم نے اس کو کچھ نہیں دیا، تو روکنے والا وہی اللہ ہوگا اور تم معذور سمجھے جاؤ گے۔"

حضرت کے خلفاء میں حضرت نظام الدین محمد بدایونی ملقب بہ نظام الدین اولیاء، حضرت علاء الدین علی صابر کلیری، حضرت جمال الدین خطیب ہانسوی اور حضرت بدر الدین اسحٰق دہلوی تھے، حضرت نظام الدین اولیاء نے حضرت سے قرآن مجید کے ۶ پارے اور کتاب العوارف اور کتاب التمہید کی قرأت کی تھی، ان خلفاء میں سے حضرت نظام الدین نے حضرت گنج شکر کے ملفوظات راحۃ القلوب کے نام سے اور حضرت بدر الدین اسحٰق دہلوی نے سیر الاولیاء کے نام سے جمع کئے تھے۔ حضرت گنج شکر نے ۹۵ سال کی عمر میں ۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء میں وصال فرمایا،

شیخ ابو المؤید نظام الدین بن جمال الدین غزنوی بھی حضرت بختیار کاکی کے مرید تھے، حضرت نظام الدین اولیاء ان کی مجلس وعظ میں شرکت کرتے اور ان کے پُر اثر مواعظ کے مداح تھے، ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء میں وفات پائی۔

شیخ جمال الدین احمد بن محمد ہانسوی متوفی ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء، حضرت گنج شکر کے ممتاز خلفاء میں تھے، حضرت شیخ فرماتے ہیں "جمال جمالی"، فارسی میں ایک دیوان یادگار چھوڑا (نزہۃ الخواطر ص ۱۲۲)

حضرت خواجہ علاء الدین علی بن احمد صابر قدس سرہ حضرت گنج شکر کے محبوب خلیفہ تھے، وہ ٥٩٢ھ / ١١٩٦ء میں بمقام گنجہ پیدا ہوئے، اور شیخ کی خدمت میں تعلیم و تربیت پائی اور حضرت گنج شکر کے اجل خلفا میں شمار کئے گئے اور حضرت کے توسط سے چشتی سلسلہ کو پورے ملک میں عام مقبولیت حاصل ہوئی کہا جاتا ہے کہ ان پر کبھی شان جلالی کا غلبہ طاری ہوتا تھا ابتداً انھیں شیخ نے دہلی میں اقامت اختیار کرنے کا اجازت نامہ عطا کیا لیکن ہدایت کی کہ پہلے جمال الدینؒ کو اسے دکھالینا، وہ ہانسی تشریف لائے، اجازت نامہ ان کے ہاتھ میں دیا اور تھوڑی دیر انتظار کر کے رخصت چاہی، شیخ جمال الدین نے کہا دہلی کے لیے بردبار صاحب ولایت چاہیے، تم ایک لمحہ کے لیے ٹھہر نہیں سکتے، انھوں نے کچھ شان استغنا سے جواب دیا تو شیخ جمال الدین نے برہم ہو کر اجازت نامہ کو چاک کر کے پارہ پارہ کر دیا، انھوں نے جلال میں آکر کہا کہ اسی طرح آپ کا سلسلہ بھی پارہ پارہ ہو جائے گا، چنانچہ شیخ جمال الدین کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا، حضرت خواجہ علاء الدین ہانسی سے لوٹ کر پھر حضرت گنج شکر کی خدمت میں واپس آئے اور واقعہ سنایا، تو حضرت گنج شکر نے فرمایا جمال الدین نے جس کو ٹکڑے کر دیا ہے میں اس کو جوڑ نہیں سکتا اور دہلی کے بجائے کلیر جانے کی ہدایت کی چنانچہ ٦٥٢ھ / ١٢٥٤ء میں کلیر تشریف لے گئے اور وہیں اقامت اختیار کی اور ان کے توسط سے سلسلہ چشتیہ کا عام فیض جاری ہوا اور جب عام شہرہ ہوا تو خلائق اطراف ہند سے جوق در جوق آکر فیض اٹھانے لگی ٦٩٠ھ / ١٢٩١ء میں واصل بحق ہوئے حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی حضرت کے ممتاز خلیفہ تھے[1]

شیخ بدر الدین اسحٰق بن علی بخاری دہلوی حضرت شیخ گنج شکر کے ارشد خلفاء میں سے تھے ان سے حضرت غایت الفت رکھتے تھے، اور اپنے ترجمہ سے علیحدہ کرنا گوارا نہیں فرمایا ٦٩٠ھ / ١٢٩١ء میں اجودھن میں واصل بحق ہوئے۔

حضرت نظام الدین محمد بن احمد بدایونی معروف بہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ حضرت گنج شکر کے وہ نامور خلیفہ ہیں جن کے توسط سے چشتی نظامی سلسلہ

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد اول ص ۱۸۰ ...

کی پورے ملک میں اشاعت ہوئی، حضرت محبوب الٰہی ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے پانچ سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، والدۂ محترمہ کی آغوش میں تربیت پائی، شیخ علاء الدین اصولی سے فقہ، اصول اور دوسرے دینی علوم کی تحصیل کی، ۱۵ سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے اور یہاں کے اساتذہ شمس الدین خوارزمی کمال الدین ماریکلی وغیرہ سے تحصیل علم کی تکمیل فرمائی۔ پھر ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء میں دہلی تشریف لائے اور یہیں اقامت کی اجازت عطا کی گئی اور رشد و ہدایت کا فیض جاری ہو گیا، یہ مملوک سلاطین کا آخری دور تھا حضرت کا قیام غیاث پور میں تھا، معز الدین کیقباد نے اس کے قریب کیلوکھری میں شاہی محل تعمیر کرایا، دربار کے قریب ہونے کی وجہ سے امراء و اکابر کی آمد و رفت یہاں شروع ہوئی، اس اثنا میں خلجی سلطنت کا آغاز ہوا۔ اور حضرت کے فیوض و برکات کا یہ سلسلہ اس دور میں جاری رہا، سلاطین و امراء نے سر نیاز خم کیا اور اپنی طرف حضرت کی نگاہ کرم منعطف کرانے کو ابدی سعادت تصور کیا، حضرت کی تصنیفات میں فوائد الفواد، فضل الفوائد اور راحتہ المحبین ہیں ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں واصل بحق ہوئے[۵۱]۔

حضرت شیخ صدر الدین عارف حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے صاحبزادے اور جانشین تھے سلطان غیاث الدین کے بیٹے شاہزادہ محمد کو ان سے عقیدت تھی، ان کی مجلس میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ۶۸۴ھ/۱۲۸۳ء میں وفات پائی۔

شیخ ابو علی شرف الدین قلندر اس عہد کے ممتاز علماء و مشائخ میں سے تھے ۶۰۵ھ/۱۲۰۸ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے، اکابر علماء سے علوم کی تحصیل کی، عالم اسلامی کی سیاحت فرما کر صلحائے امت کے فیوض سے بہرہ اندوز ہوئے حضرت شمس الدین تبریزی اور جلال الدین رومی سے خرقہ حاصل کیا، تیس سال تک درس و افادہ کی خدمت انجام دی سکر و مستی کا عالم طاری ہوا، اور آخر عمر تک باقی رہا، ان کی تصنیفات میں حکمت نامہ اور چند دیگر رسائل تصوف میں ہیں، ۷۲۴ھ/۱۳۲۴ء میں واصل بحق ہوئے[۵۲]۔

---

۵۱ نزہتہ الخواطر ج ا حصہ دوم ص ۱۲۲ طبع ۱۳۵۰ھ ۵۲ ایضاً ص ۵

شیخ ایوب ترکمانی بہرام شاہ کے زمانہ میں باقتدار مشائخ میں تھے، ماہرہ ان کا مرکز تھا، سلطان کو ان سے عقیدت تھی، دہلی آیا جایا کرتے تھے، اور مختلف امور میں بہرام شاہ سے اپنی مرضی کے احکام صادر کراتے تھے[51]

شیخ ابوبکر طوسی بلبن کے عہد کے ممتاز مشائخ میں سے تھے، بلبن نے ان کے لیے ایک بڑی خانقاہ تعمیر کرائی، جس میں لنگر جاری تھا، شیخ جمال الدین ہانسوی ان کے فضل کے معترف تھے، اور ان کی مجلس میں تشریف لایا کرتے تھے[52]

شیخ حسام الدین ملتانی حضرت صدرالدین محمد زکریا ملتانی کے مریدین میں سے تھے، ۶۸۶ھ/۱۲۸۷ میں وفات پائی[53]

حضرت خواجہ محمد بن حسن اجمیری حضرت خواجہ اجمیری کے خلف صدق تھے، اجمیر میں پیدا ہوئے، اور وہیں حضرت خواجہ کے دامن تربیت میں فیض اٹھایا، اور ان کے بعد مشیخت و ارشاد کے منصب پر سرافراز ہوئے، ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ میں وفات پائی[54]

شیخ نجیب الدین بن عماد الدین فردوسی دہلوی، شیخ رکن الدین فردوسی کے مرید تھے حضرت مخدوم شیخ احمد بن یحییٰ منیری ان کے مرید و خلیفہ تھے، ۶۹۱ھ/۱۲۹۲ میں دہلی میں واصل بحق ہوئے[55]۔

شیخ بابا رجب گجراتی حضرت سید احمد کبیر رفاعی کے مرید تھے، ۶۱۶ھ میں گجرات میں آئے، نہروالہ میں قیام تھا، ایک خلق کثیر ان کے ہاتھ پر اسلام لائی ۶۷۰ھ/۱۲۷۱ میں وفات پائی[56]

شیخ عثمان بن حسن مروندی معروف بہ لعل شہباز ۶۶۲ھ/۱۲۶۴ میں ملتان پہنچے سلطان غیاث الدین کے بیٹے شاہزادہ محمد نے ان کے لیے ایک عظیم خانقاہ تعمیر کرائی اور یہ رشد و ہدایت میں مصروف ہوئے[57] ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ میں سیوستان میں مدفون ہوئے[58]

شیخ فخر الدین میرٹھی حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مرید و خلیفہ تھے، رتبۂ مشیخت تک سرفراز ہوئے کہا جاتا ہے کہ وہ سکندر یونانی کی نسل سے تھے[59]۔

---

۵۱ نزہۃ الخواطر ص ۱۲۵ ۵۲ ایضاً ص ۱۲۳ ۵۳ ایضاً ص ۱۴۴ ۵۴ ایضاً ص ۲۳۵ ۵۵ ایضاً ص ۲۳۵
۵۶ ایضاً ص ۱۵۴ ۵۷ ایضاً ص ۸۷ ۵۸ ایضاً ۱۹۵ ۵۹ ایضاً ص ۲۰۳

شیخ نجیب الدین بن سلیمان متوکل حضرت گنج شکر کے خلفا رمیں سے تھے ۱ب ۶۶۹ھ ۱۲۷۰ء میں دہلی میں وفات پائی۔[1]

شیخ حسین بن علی بخاری حضرت زکریا ملتانی کے مرید تھے اور بھکر میں مستقل سکونت رکھتے تھے ۶۹۵ھ ۱۲۹۶ء میں وفات پائی۔[2]

مولانا شیخ شرف الدین عراقی جو حضرت شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے ۶۸۷ھ ۱۲۸۸ء میں وفات پائی۔[3]

اسی طرح اس دور میں ممتاز صوفیہ و مشائخ میں شیخ عبد الرشید کیتھلی متوفی ۶۳۸ھ ۱۲۴۰ء (نزہتہ الخواطر ص ۱۷۱) شیخ خواجہ عزیز کرشمی بدایونی فقیہ و صوفی متوفی ۶۶۶ھ ۱۲۶۷ء (۱۷۸) سید محمد شجاع مکی متوفی ۶۴۶ھ ۱۲۴۸ء شیخ بدر الدین محمد بن محمد سندھی متوفی ۶۸۰ھ ۱۲۸۱ء بھکر (ص ۲۲۳) سید صدر الدین محمد بن محمد بھکری متوفی ۶۶۹ھ ۱۲۷۰ء (۲۲۶) شیخ نور الدین لاری متوفی ۶۹۵ھ ۱۲۹۶ء (۲۸۷) وغیرہ کے وجود گرامی سے رشد و ہدایت کا عام فیض جاری تھا۔

---

[1] نزہتہ الخواطر ص ۱۴۴ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۱۶۴

مملوک سلاطین کا دورِ حکومت

مملوک سلاطین کے خاتمہ پر دہلی سلطنت کے سلاطین کے سلسلہ کا خاتمہ ہوا جن کا آغاز سلطان شہاب الدین غوری سے ہوا تھا، کہ اسی کے غلام در غلام تاجدار بن کر تخت نشین ہوتے گئے، اس کے ساتھ سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے ہاتھوں سے ہندستان کو زیر نگین کرنے کی جو مہم شروع ہوئی تھی، وہ بھی اسی دور میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔

ہندوستان پر مسلمانوں کے حملہ آور ہونے کے محرکات

غزنوی اور غوری کشور کشاؤں کے ہندستان پر حملہ آور ہونے کے محرکات کیا تھے، ہمیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہیے، عام طریقہ سے محمود کی بت شکنی کے جذبہ کو شہرت دی گئی ہے۔ مگر یہ تمام یورپ کے مورخین کے ذہن کی پیداوار ہے ان نو مسلم ترکوں میں اس قسم کے کسی جذبہ کے بجائے دراصل اس زمانہ کی سماجی زندگی کے وہ مطالبے تھے جو بلندی اور نام آوری حاصل کرنے کے لیے فوجی طاقتیں مہیا کر کے سپہ سالار ایک ملک سے دوسرے ملک میں جایا کرتے تھے۔ ہندستان کی دولت کی شہرت عام تھی، اس میں بھی ایک خاص قسم کی کشش موجود تھی، ان قبائل میں اپنی نوآبادیاں قائم کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا تھا، وہ اپنے بڑے بڑے جرگوں کے ساتھ نکل جاتے تھے اور جہاں سرسبزی نظر آتی تھی، وہاں ڈیرے ڈال دیتے تھے، محمود نے ہندستان کو خاص طور پر رہنے کے لیے پسند کیا تھا، لیکن وہ یہاں اقامت اختیار نہ کر سکا۔

نامسلمانوں کو ان کی زندگی کے عام شعبوں میں عمومی آزادی

سلاطین دہلی کے زمانہ میں جن حکمرانوں کے ہاتھوں میں تلوار تھی انھیں اس پر اتنا بھروسہ تھا کہ انھوں نے ہندستان کے پرانے رہنے والوں کو نہتا کرنے کا کبھی قصد نہیں کیا، یہاں انھوں نے قانون اسلحہ جاری کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی، نامسلمانوں کو عام اجازت تھی

کہ وہ ہتھیار بند رہیں، اور اپنی مرضی کے مطابق جرگے تیار کریں، ان کی سماجی، معاشرتی و اہلی زندگی سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا، انھیں ہر قسم کی پوری آزادی حاصل تھی انھیں اپنی اقتصادی و معاشی ترقی حاصل کرنے کے پورے مواقع دیے گئے تھے، اور اسی زمانہ میں وہ حکومت کے شعبوں سے بھی کہیں کہیں وابستہ ہونے لگے تھے۔

ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت کی حیثیت

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہی، اگر ہندستان پر حملہ آوروں میں کوئی دینی جذبہ کارفرما ہوتا تو وہ یہاں کی سلطنت کی بنیاد اسلامی اصول و شرائع پر قائم کرتے، اگرچہ بعض نے اس سلطنت کو خالص "اسلامی سلطنت" لکھا ہی جس کی بنیاد شرعی احکام پر تھی، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ عملی طور پر در اصل یہ اسلامی سلطنت نہ تھی، اور برنی جیسے مؤرخ کو بھی اپنی تصنیف "فتاوی جہانداری" میں یہ اقرار کرنا پڑا ہی، کہ یہاں بادشاہی نظام خالص "دنیاداری" پر قائم تھا جو "دین داری" کے قطعی خلاف تھا جس کا قیام غیر اسلامی طور وطریق اور طرز حکومت کو اختیار کئے بغیر ممکن نہ تھا، سلطان اگرچہ خود اسلامی عقیدہ کا قائل اور شرائع کا پابند تھا، لیکن اس کی سلطنت کا نظام شرائع کے بجائے قائم ہونے کے بجائے خاص تسلط اور فوجی طاقت پر قائم تھا، اس نظام میں شرائع کو بھی وہی حیثیت حاصل تھی، جو دوسرے قوانین کو تھی، اس لیے در اصل یہاں مسلمانوں نے جس سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی وہ مذہبی حکومت کے بجائے غیر مذہبی اور غیر جانبدار سلطنت (سیکولر اسٹیٹ) تھی پروفیسر حبیب اللہ نے یہ صحیح لکھا ہی کہ

> "مورخین کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہی کہ سلطنت خالص اسلامی ریاست تھی، جو اپنی پالیسی کو شریعت کے مطابق بنانے کی کوشش کرتی رہی، لیکن جیسا کہ گذشتہ ابواب سے معلوم ہوگا کہ عملاً ایسی نہ تھی، بادشاہت کے غیر اسلامی طرز کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں، برنی نے اس کا اعتراف کیا ہی، کہ دنیاداری جس کا منتہائے کمال بادشاہت ہی، وہ دینداری کے خلاف ہی، برنی نے یہ بتایا ہی کہ بادشاہت کے مشرکانہ طریقے اسلام میں جاری رہی اور اکا دکا... وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہی کہ بغیر غیر اسلامی طریقہ

کے بادشاہت ممکن نہیں، بعض خوش عقیدہ مذہبی گروہ اپنے کو یہ تسلی دے سکتا ہے، کہ سلطان صرف مذہب کی اشاعت اور شریعت کی بقا ہی کے لیے ہوتا ہے، لیکن بغیر کسی شک وشبہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اعمال میں جو چیزیں فیصلہ کن ہوتی تھیں، وہ قوت اور ضرورت کا قانون تھیں، برنی نے بادشاہت کی اصلیت اور نوعیت کی تفصیل بتائی ہے، وہ کہتا ہے کہ بادشاہت کے معنی استیلا کے ہیں، چاہے وہ قانونی طریقے ہو یا قوت سے ہو اور شریعت کی عملی طور پر اس سے زیادہ توقیر نہ تھی جتنی دوسرے قوانین کی، برنی کو یہ اعتراف ہے کہ مسلمانوں کو جو سزائیں دی جاتی تھیں وہ قرآن پاک کے خلاف تھیں، لیکن ان کو روا رکھا جاتا تھا، اسی طرح قانون وراثت اور حلال و حرام کا امتیاز اور دوسری معروف اعتقادی پابندیوں کو توڑ دیا جاتا تھا، مذہبی طبقہ اس کے خلاف احتجاج ضرور کرتا تھا، سود کے متعلق جو شرعی پابندیاں تھیں ان کا لحاظ مطلق نہیں کیا جاتا تھا، امیر خسرو نے واقعہ بیان کیا ہے، کہ ایک تنکہ پر ایک جیتل سود ماہوار لیا جاتا تھا، اور فریقین میں جب تحریری معاہدہ ہو جاتا تھا، تو اس کو قانونی درجہ حاصل ہو جاتا تھا، اور قاضی کو اس کو عمل میں لانا پڑتا تھا، وہ جو چار شرائط برنی نے بادشاہوں کو عمل کرنے کے لیے لکھے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جب کسی ضابطہ کو جاری کرے، تو ان میں سے اگر کوئی شریعت کے خلاف ہو تو وہ واپس نہ لیے جائیں، بلکہ جب تک ضرورت ہو اس کو قائم رکھا جا سکتا ہے[1]"

ہندوستان میں مسلمانوں کی اسی غیر مذہبی سلطنت کی تاسیس عمل میں آئی، اور بیشتر زمانوں میں اپنے کو غیر مذہبی حکمران تصور کیا، انھوں نے اپنی ذات اور مسلمانوں کے لیے دین کی عام پابندی کو لازم کر رکھا تھا، مگر مسلمانوں کے ساتھ اپنے سیاسی برتاؤ میں اس کا لحاظ نہیں رکھا، اس طرح وہ دینداری اور دنیاداری دونوں کو دونوں پلڑوں پر رکھ کر نظم حکومت سنبھالے ہوئے تھے اور ان میں سے جو سلاطین دینداری کی طرف مائل ہوتے، ان کا پلڑا کسی قدر جھک جاتا، اور جو خالص دنیاداری کے رخ کو سامنے رکھتے، وہ اس سمت کو جھک جاتے تھے، یہی طرز ملوک سلاطین ہند سے لے کر تیموری سلطنت کے چراغ کے بجھنے تک

---

[1] فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۲۱۵

قائم رہا، تیموری دور میں دین داری و دنیا داری کے دونوں سروں کو دو حکمرانوں عالمگیرؒ اور اکبر نے اپنے اپنے دوروں میں اپنے کردار سے زیادہ نمایاں کر دیا تھا اور اسی سبب ان دونوں کی بادشاہی کا طرز ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھا
بااین ہمہ پورے اسلامی دور میں کسی ایک حکمران کا بھی زمانہ ایسا مشکل سے مل سکتا ہے جس کو ہم خالص اسلامی حکومت سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جس میں ہم عہد صدیقی و فاروقی کی مثالیں دیکھ سکتے ہوں، بلکہ یہاں اسلامی حکومت کے بجائے مسلمان بادشاہوں کی حکومت قائم تھی جس میں جب حکمرانوں اور محکوموں میں ارتباط بڑھا تو دونوں کو یکساں حیثیت کے شہری حقوق حاصل ہو گئے اور حکومت کا کوئی عہدہ یا منصب محض نا مسلمان ہونے کے سبب سے کسی کے لیے بند نہیں رہ گیا۔

ہندستان کی حفاظت | مملوک سلاطین اپنے دور میں حکمرانی میں مغربی سرحد کی اہم خدمت انجام دیتے رہے، اس دور میں وسط ایشیا میں پے در پے انقلابات آئے اور ان کی لہریں دریائے سندھ تک بھی پہنچیں، مگر ان سلاطین نے ان کی موجوں کو پھیر دیا اور پنجاب تک کے علاقہ کو مضبوطی سے زیر نگین رکھا، ان کا یہ کارنامہ مغل سلاطین کے کارناموں سے بڑھا ہوا تھا، اس لیے کہ مغلوں کے تسلط میں افغانستان اور قندھار کا علاقہ بھی تھا اور انھیں آگے بڑھ کر ہندستان کی سرحد کی حفاظت کا موقع حاصل تھا۔

حکومت کا ڈھانچہ | اس لیے ان سلاطین دہلی کی مرکزی حکومت پر ملکی حفاظت و مدافعت کا عظیم بار تھا، اور اسی لحاظ سے ان کے غیر معمولی مصارف بھی تھے اور مرکزی حکومت سب سے زیادہ فوجی اخراجات ہی پر صرف کرتی تھی۔

اس دور وسطیٰ میں مسلمان سلاطین کی سلطانی کا استناد خلفاء کی منظوری سے حاصل ہوتا تھا، ہندستان کے یہ سلاطین بھی خلفاء سے اپنا رسمی رشتہ قائم رکھتے تھے اور رسماً خلیفۃ المسلمین کو سب پر تفوق حاصل تھا، اور یہ سلاطین گویا اس کی طرف سے نیابتہً حکومت کرتے تھے، اس لیے خطبوں میں خلفائے اسلام کے ساتھ ان کے نام لیے جاتے تھے

حکومت کے شعبے سلطان کے بعد قدرتاً وزرا کو اہمیت حاصل تھی، جنھیں نظام الملک، موید الملک، صدر الملک، عین الملک وغیرہ کے خطابات دیے جاتے تھے، لیکن یہ وزرا صرف کشوری امور کے مالک تھے، شعبہ عسکری، شعبہ مال، دیوان انشا، معاملات خارجیہ، اطلاعات اور وزارت اوقاف کے شعبے علیحدہ قائم تھے ان کے علاوہ امیر، حاجب، وکیل دار، سارجاندار اور کبھی نائب مملکت کے عہدہ دار مقرر ہوئے، پھر آخر میں نیابت کے عہدے مستقل کر دیے گئے جس میں نائب وزیر، نائب وکیل عہدہ دار تھے۔

فوج فوج کی کئی قسمیں تھیں، ایک تو شاہی فوج تھی جو ملک اور خصوصاً سرحد کی حفاظت پر مامور تھی، دوسرے صوبائی فوجیں صوبہ داروں کے ماتحت تھیں، کبھی ضرورت کے وقت بھرتی ہوتی تھی، فوج کے افسروں کو تنخواہیں دی جاتی تھیں، البتہ جاگیریں سپرد تھیں، البتہ قائم فوج کے سپاہیوں کی تنخواہیں، جو مواجب کہلاتی تھیں مقرر تھیں

آئین و عدالت قانون شریعت بنیادی آئین سمجھا جاتا تھا، مگر ضرورت کے مطابق اس کے خلاف عمل ہوا کرتا تھا، ہندوؤں کے لیے ہندو کوڈ کے مطابق قوانین نافذ تھے، خصوصاً پرسنل لا میں انھیں کامل آزادی حاصل تھی۔

صدر جہاں کا عہدہ ہندستان کی مرکزی عدالت کے چیف جسٹس کے لیے تھا امرا و وزرا سے رتبہ و احترام میں اس منصب کا درجہ اونچا تھا، چنانچہ مورخین نے فہرست میں شاہزادوں کے بعد ان کے نام لکھے ہیں وہ صدر جہاں کے علاوہ قاضی قضاۃ، قاضی ممالک یا شیخ الاسلام بھی کہے جاتے ہیں، عدالتی نظام و نصرام تقرر کے سارے اختیارات انہی کو حاصل تھے[۱]۔

پھر اس کے ماتحت عہدہ دار تھے، دیوانی کے مقدمات قاضی اور فوجداری کے مقدمات امیر داد سماعت کرتے تھے کوتوال اور محتسب پولیس کا کام کرتے تھے۔

زکوٰۃ کا نظم بھی قائم تھا اور دوسرے محاصل بھی لیے جاتے تھے مسی، نقرئی

---

[۱] طبقات ص ۱۲۵، ۱۷۷، برنی ص ۲۴، ۱۲۶

اور طلائی سکے کئی قسم کے جاری تھے[1] "ہندستان کے عہد اسلامی میں زکوٰۃ کا نظام" کے عنوان سے اس مجموعہ میں ایک مستقل تحریر علیحدہ مندرج ہے،

ڈاک کا نظم | ڈاک کے نظم کا بڑا عہدہ "دارد برید ممالک" کہا جاتا تھا، اس کا صدر دفتر پایۂ تخت میں تھا اس کے ماتحت راستوں کا معقول نظم قائم رہتا تھا۔

صوبوں کا نظم | صوبوں کا نظم اس طرح قائم تھا، کہ صوبہ دار اپنے حدود کے کامل ذمہ دار ہوتے تھے، کبھی نائب والی بھی مقرر ہوتے تھے صوبوں میں بھی چھوٹے پیمانہ پر حکومت کے وہ سب شعبے موجود تھے، جو مرکز میں قائم تھے اس زمانہ میں صوبوں کے لیے اقطاع کی اصطلاح قائم تھی، صاحب اقطاع کو عدالتی نظام میں دخل دینے کا اختیار حاصل نہ تھا، صوبہ دار شحنہ کوتوال کی مدد سے نظم و امن قائم رکھتا تھا اور مرکزی حکومت کی طرف سے خطبہ و سکہ جاری رہتا تھا، کبھی باجگذار صوبے اپنا سکہ علیحدہ بھی جاری کرتے تھے۔

سلاطین کا طرز بود و ماند | مورخین نے مملوک سلاطین کے شاہانہ طرز بود و ماند کی نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے، سلطان کے گرد صدہا نقیب و جاؤش پیادہ و سرہنگ امرا و فوجی سردار جمع رہتے تھے، اور ایسا دبدبہ چھایا رہتا تھا کہ کبھی بڑی بڑی سلطنتوں کے امرا و سفرا "خاک بوسی" یعنی سلام کے وقت شدت تاثر سے لڑکھڑا کر گرتے اور بے ہوش ہو جاتے تھے، اس طریقہ سے رعب و دبدبہ قائم کرکے فتنہ انگیزی کو روکنا مقصود تھا، حالانکہ خود پرستی و عظمت نمائی کے یہ طریق اسلام اور اس کی تعلیمات کے منافی تھے، لیکن بلبن خود کہتا ہے کہ ان کو جائز اس لیے رکھا گیا ہے کہ قیام امن و عدل میں ان سے مدد ملتی ہے، مظلوموں کی دادرسی ان سلاطین کا خاص شیوہ رہا، نیز وہ امور دین میں دینداری کو راہ دینے کا جذبہ بھی رکھتے تھے، لیکن انھوں نے اپنی حکومت کو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ نہیں بنایا۔

اسلام کی اشاعت | اس دور میں اسلام کی اشاعت ضرور ہوئی، مگر وہ حکومت کے بل پر ہونے کے بجائے مسلمانوں کے ہندستان کی منتشر آبادیوں میں

---

[1] [illegible]

گھل مل کر رہ بس جانے سے ہوئی، ہندوؤں میں "مورتی پوجا" پر عقیدہ کمزور ہوتا گیا توحید اور مساوات انسانی کے جذبات کی ان میں پرورش ہوئی۔ ہندوؤں کے مختلف فرقوں نے بعض اس زمانہ میں اور بعض آگے چل کر توحید کی تعلیمات کو اصول کے طور پر مانا اور ویش، شودر، کھتری اور برہمن کی تفریقوں کو مٹایا، صوفیہ کرام شمالی ہند کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکے تھے، اور اسلامی تصوف کے ذریعہ ہندستان میں اسلام کو فروغ ہوتا جاتا تھا، خصوصاً خانوادۂ چشتیہ نے وہ خدمات انجام دیے جو سلاطین دہلی سے انجام نہ پا سکے، کلاہ تتری رکھنے والے درویش صفت امیر اور خواجہ حسن نے سلطان نظام الدین کی چوکھٹ چومی۔

اس دور میں علمائے دین بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور خدمتیں انجام دیتے تھے، مسجدیں اور مدرسے ان کی سیادت میں معمور تھے۔

علوم کی ترقی جیسا کہ اوپر گزرا مملوک سلاطین نے علوم کی ترقی میں غیر معمولی دلچسپی لی، ضیاء الدین برنی نے ہر ایک سلطان کے عہد کے بیان میں شعراء، علماء فضلاء، فقہاء، محدثین وغیرہ کی طویل فہرست درج کی ہے۔ تذکرہ کی کتابوں میں مختلف مدارس کا حال ملتا ہے۔ اس دور میں جو علمی و تعلیمی ترقیاں ہوئیں ان کا ذکر اجمالاً اوپر گذرا اور تعلیمی ترقیوں کا تفصیلی بیان اس مجموعہ کے دوسرے مستقل مقالوں میں علٰحدہ آیا ہے۔

ایک نئے کلچر کی تخلیق اور انسانی آبادی کے طبقات ہندستان کے شمالی حصہ میں اس دور میں ایرانیوں افغانیوں اور ترکوں نے عربوں کے تمدن سے آمیزش کے بعد مسلمانوں کی سوسائٹی میں یہاں ایک طبقہ اعلیٰ قائم کر لیا تھا، اور پھر ہندوؤں میں سے ایک بڑا طبقہ اسلام میں داخل ہوا، اور جیسا کہ گزرا وہ ترقی کر کے نیابت مملکت کے منصب تک پہنچا اس طرح شمالی ہند میں ایک ایسے کلچر کی بنا پڑی جس میں عرب تمدن آمیز ایرانی افغانی، ترکی کلچر میں ہندی کلچر کی آمیزش ہوئی اور ایک نئے کلچر کی تشکیل عمل میں آئی، دوسری طرف سندھ میں عربوں کے غالب اثرات سے ہندی کلچر کی آمیزش سے ایک جداگانہ کلچر کی تشکیل ہو رہی تھی، اس طرح شمالی ہند

کے نئے کلچر میں ایرانی اور سندھ کے نئے کلچر میں عربی اثرات نمایاں تھے، مملوک سلاطین کے دور میں شمالی ہند اور سندھ و ملتان کے ان دونوں کلچروں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملا۔ اور ایک نیا ہندستانی کلچر عالم وجود میں آیا، اور سوسائٹی میں طبقۂ اعلیٰ کے وہ مسلمان جو مختلف نسلوں کے تھے اس کلچر کے روح رواں رہے۔ اس سوسائٹی میں اہل سیف اور اہل قلم کی دو قسمیں تھیں۔ اہل سیف میں ارباب حکومت اور اہل قلم میں ارباب علم و عمل تھے عدالت و قضا کا نظم موخر الذکر طبقہ ہی کے قبضہ میں تھا تیسرا گروہ "عوام" اور "خلق" کا تھا، تجار کا طبقہ ان ہی میں سے تھا، جن میں ملک التجار بھی ہوتے تھے اور امتیازی شان حاصل کرتے تھے، عوام کا بڑا طبقہ کاشتکاری اور کارخانوں میں کام کرتا تھا، مذہبی حیثیت سے ملک میں سنی شیعہ، صوفیہ اور نامسلمانوں کا تھا، شیعوں میں کا غالی طبقہ موسوم بہ ملاحدہ قرامطہ تھا، اسی طرح سنیوں میں حنفی و شافعی دونوں تھے

تجارتی ترقی

اس عہد میں ہندستان کے تجارتی تعلقات ایران و عرب سے قائم تھے، حالاں کہ مملوک سلاطین کے قبضہ میں کوئی بندرگاہ نہ تھی ملکی تجارت بھی فروغ پہ تھی، مختلف قسم کے کارخانے قائم تھے، جن میں سامان تیار ہوتا تھا، زرعی ترقی اس ملک کی جان تھی، حکومت، امن و امان قائم رکھ کر اور کسانوں کو آسانیاں مہیا کرکے زراعت کو ترقی دیتی تھی۔

اندرون ملک میں رستوں کا معقول نظم قائم تھا، تجارتی راستے زیادہ تر دریائی تھے بحری و بری راستوں اور ان کے وسیلوں کا نظم قائم رکھا گیا تھا جن سے ملک میں غیر معمولی تجارتی و صنعتی ترقیاں عمل میں آئیں۔

ہندستان کی مرکزیت عالم اسلامی میں

ہندستان کی تجارتی و صنعتی ترقیوں اور فراخ بالیوں کا شہرہ ایسا ہوا کہ ایشیا اور دوسرے اسلامی ملکوں سے لوگ نقل وطن کرکے آنے لگے اور مختلف صناع، کاریگر اور اہل حرفہ اس ملک میں آباد ہوگئے، اس تمدن کا سب سے اہم مرکز خود پایہ تخت دہلی تھا، چنانچہ اس دور کے خاتمہ کے چند سال بعد جب ۷۳۴ھ ۱۳۳۲ء میں مشہور سیاح ابن بطوطہ ہندستان آیا تو اس کو اعتراف کرنا پڑا کہ

"دہلی کو نہ صرف بلاد ہند بلکہ تمام مشرقی دنیائے اسلام کے شہروں پر تفوق و ترجیح حاصل ہے"

ہندوستان آٹھویں صدی ہجری میں

ابو العباس احمد قلقشندی (متوفی ۸۲۱ھ) کی مشہور کتاب صبح الاعشیٰ عربی علم ادب میں
لازوال شہرت رکھتی ہے اس کا موضوع فن انشا ہے، لیکن انشا سے مقصود انشا پردازی
نہیں ہے جیسا کہ اب سمجھا جاتا ہے بلکہ اس مجموعہ علم و فن سے مقصود ہے جس کی واقفیت ایک شاہی
سکریٹری کے فرائض بجا لانے کے لیے ضروری ہے، اور اس لیے مصنف نے اہل انشا کی عام علمی
عملی ضروریات کے اقتضا کے لحاظ سے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں ایک ایسا وسیع رستہ
اختیار کیا جس کی بدولت اس کی یہ تصنیف نہ صرف فن ادب کا ایک گرانمایہ تحفہ بنی بلکہ مختلف
علوم و فنون کا بھی ایک دلآویز مجموعہ بن گئی ہے۔ یہ کتاب تاریخ و سیر بھی ہے، اور لغت و ادب بھی
تفسیر و حدیث بھی ہے اور فقہ و انشا بھی، عالم اسلامی کا جغرافیہ بھی ہے اور اسلام کی تمدنی ترقیوں
کا تمدنی آئینہ بھی، فن انشا کے اصول و قوانین، مختلف ممالک اسلامی میں اس کے مختلف حالات و کیفیات
زبان عربی کی تمام خصوصیات اور عہد جاہلیت سے آٹھویں صدی ہجری تک تمام عالم اسلامی
میں اس کی تدریجی نشر و اشاعت، دیوان انشا کا قیام اور اسی مناسبت سے خلافت اسلامیہ کا
نوادر خلافت کے اصول و شرائط، خلفائے اسلام کے مفصل حالات، تمام عالم اسلامی میں ان کا
نفوذ و اثر، اور پھر اسی ضمن میں مشرق و مغرب کے تمام ممالک اسلامیہ کے جغرافی حدود، ان کی
حکومتوں کا اجمالی تذکرہ، اور خصوصاً مختلف ممالک کے تہذیب و تمدن، معاشرت اور عام طرز
بود و ماند کے حالات نہایت اختصار اور جامعیت سے مرتب کیے گئے ہیں۔

اس لیے یہ کتاب گویا ایک بحر زخار ہے۔ اس موقع پر اس کے اس ٹکڑے کو سامنے لانا
ہے جہاں اس میں ممالک اسلامیہ کے ذیل میں ہندوستان کے عام حالات بیان کیے گئے ہیں۔

صبح الاعشیٰ کا مصنف قلقشندی مصر کا رہنے والا تھا، اور یہیں دیوان انشا کا افسر اعلیٰ
مقرر ہوا ۷۵۶ھ میں قلقشندہ (ولایت مصر) میں پیدا ہوا، اور ۷۷۸ھ سے اس کی
علمی و عملی زندگی کا آغاز ہوا ۷۹۱ھ سے دیوان انشا مصر سے متوسل ہوا، اور اسی عہدہ میں

اس نے صبح الاعشیٰ کی تالیف کی ابتدا کی اور ۸۱۴ھ میں اس سے فارغ ہوگیا۔

اس لیے قلقشندی نے ممالک اسلامیہ کے ذیل میں ہندستان کے جو حالات فراہم کئے ہیں، وہ دراصل آٹھویں صدی ہجری سے متعلق ہیں۔ ہندستان کے یہ حالات یہاں کی کوئی مرتب تاریخ کی صورت میں نہیں ہیں، بلکہ اس نے سرزمین ہند کا نقشہ کھینچ کر اس کے ایسے خط وخال نمایاں کئے ہیں کہ آٹھویں صدی کے ہندستان کا ایک مرقع تیار ہوگیا ہے جس میں اس کے عام تہذیب وتمدن ومعاشرت کا پتہ چلتا ہو، اور ہندستان کی اسلامی حکومت کے نظام وطریق حکومت کا ایک ایسا نقشہ سامنے آتا ہے جو ہندستان کی عام فارسی تاریخوں میں اس مرتب شکل میں موجود نہیں۔

اس لیے قدرتی طور پر ہندستان کے ان حالات کے متعلق قلقشندی کے دو مآخذ ہیں ایک عرب سیاحوں کے جغرافیہ کی کتابیں اور دوسرے ہندستان کے بعض ایسے اہل علم کے بیانات جو ان ممالک اسلامی تک پہنچے تھے ہندستان کے اہل علم میں سے شیخ مبارک بن محمود الانباتی دکھمبائتی، شیخ سراج ہندی اور شیخ عبدالرحمٰن الریان الہندی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، یہ وہ زمانہ تھا جب محمد تغلق نے مصر کے عباسی خلفا کی بیعت کر لی تھی اور اس تعلق سے مصر وہند میں گہرے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔

قلقشندی نے ہندستان کے اس تذکرہ میں اولاً یہاں کا مفصل جغرافیہ دیا ہے، اس ضمن میں یہاں کے شہروں خصوصاً پایۂ تخت دہلی کے حالات نہایت دلچسپ ہیں، پھر ہندستان کے اقتصادی مباحث ہیں، اس میں یہاں کی عام پیداوار، حیوانات، صنعت، حرفت اور تجارت وغیرہ کے تذکرے کے ساتھ یہاں کے سکے اور نرخ وغیرہ کو تفصیل سے درج کیا ہے۔ پھر سلاطین اسلام کا ذکر ہے اور محمد بن تغلق شاہ کا تذکرہ کرکے اس کے عہد کے مفصل نظام حکومت کو پیش کیا ہے، اور خصوصیت کے ساتھ اسی کے طرز حکومت اور لوازم شاہی کو تفصیل سے دکھایا ہے۔ ہندستان کے ان حالات کا آغاز "القطر الرابع" سے شروع کرتا ہے، اولاً ہند کا اجمالی تعارف عرب جغرافیہ نویسوں صاحب مسالک الابصار اور صاحب تحفۃ الالباب محمد بن عبدالرحیم اندلسی وغیرہ کے اقتباسات سے کرایا ہے اور پھر شیخ محمد بن محمود انباتی وغیرہ کی روایت سے

حالات بیان کیے ہیں، غرض اس میں ہندستان کے متعلق قیمتی معلومات اختصار کے ساتھ یکجا ہوگئے اور اس لائق ہیں کہ انھیں اردو میں کسی خاص ترتیب کے ساتھ منتقل کی جائے۔ ذیل کی سطروں میں اسی خدمت کو انجام دیا گیا ہو:

ہندستان کا تعارف قلقشندی نے ہندستان کا تعارف صاحب مسالک الابصار کی زبان سے حسب ذیل شاندار الفاظ میں کرایا وہ لکھتا ہو:۔

"ہندوستان ایک عظیم الشان مملکت ہو اس کے حدود کی وسعت، دولت وثروت کی بہتات اور فرماں روایان ہند کا جاہ وحشم، شان وشوکت، اور خدم وحشم تمام روئے زمین میں یکتا و یگانہ ہو، یہی وہ خطۂ ارض ہو جس کے سمندر موتیوں سے بھرے ہوئے، طبقات زمین سونے کی کانوں سے پٹے ہوئے پہاڑ، یاقوت والماس سے مالامال، وادیاں عود وکافور سے بھرپور اور جنگل، ہاتھی اور گینڈے سے بسے ہوئے ہیں، یہیں کی چند تلواریں اپنی آب داری میں روز ازل سے مشہور ہیں، اور پھر نرخ کی ارزانی لشکر کی غیر محدود تعداد، اور باشندگان ہند کا علم وحکمت اور دانائی اور فرزانگی تعارف سے مستغنی ہو"

اس کے بعد قلقشندی نے ہندوستان کو دو اقلیموں، اقلیم سندھ اور ہند میں تقسیم کیا ہو، پہلے اقلیم سندھ کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہو:۔

اقلیم سندھ اقلیم سندھ کے حدود اربعہ یہ ہیں،

مغرب میں حدود کرمان اور صحرائے سجستان، جنوب میں صحرائے مابین کرمان وبحر ہند، مشرق میں بحر فارس اور شمال میں حدود ہند،

منصورہ پایۂ تخت سندھ سندھ کا پایۂ تخت منصورہ ہو، یہ سندھ کا مشہور ترین شہر ہو، اس کا قدیم نام "برہمناباد" ہو، منصورہ کی وجہ تسمیہ مختلف بیان کی جاتی ہو، بعض لوگوں کا بیان ہو، کہ جب اسلامی لشکر یہاں داخل ہوا، تو سپہ سالار کی زبان سے "نصرنا" نکلا، اور یہی لفظ "منصور" اور منصور سے "منصورہ" نام پڑگیا، لیکن مہلّبی کی روایت اس سے بالکل جداگانہ ہو، "یعنی یہ کہ

قدیم شہر نہیں بلکہ خلیفہ عباسی المنصور کے عہد میں عمر بن حفص المعروف بہ ہزارمرد نے اس کو آباد کیا، اور اسی نے خلیفۂ وقت کے نام سے اس کو موسوم کیا، لیکن مؤخر الذکر روایت صحیح نہیں ہے، حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس پر مفصل بحث کی ہے، اور ان کی تحقیق سے یہ بنی امیہ کے زمانہ میں محمد بن قاسم کے لڑکے عمرو کے ہاتھوں تعمیر پاچکا تھا[۱]

منصورہ نہایت عظیم الشان شہر ہے، طول بلدہ ۷۵ درجہ ۱۳ دقیقہ اور عرض ۲۴ درجہ ۴۲ دقیقہ ہے، دریائے مہران کی خلیج اس کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، جس سے ایک جزیرہ کی شکل پیدا ہوگئی ہے، یہاں کی آب وہوا نہایت گرم ہے، درخت بہت کم اوگتے ہیں، صرف کھجور اور گنے وغیرہ کی پیداوار ہے، یہاں سیب کے مانند ایک پھل نہایت ترش ہوتا ہے، جو "الیومہ" کہا جاتا ہے

سندھ کے شہر "اقلیم سندھ میں چند شہر خاص امتیاز رکھتے ہیں، اور وہی قابلِ ذکر ہیں، ان میں زیادہ شہرت دیبل، بیرون، سدوستان ملتان، اور آرزو وغیرہ کو حاصل ہے،

دیبل (ٹھٹھہ) منصورہ سے ۶ منزل پر واقع ہے، شہر زیادہ کچھ بڑا نہیں، گرمی سخت پڑتی ہے، بصرہ وغیرہ سے اس کے تجارتی تعلقات قائم ہیں، بصرہ سے کھجوریں آتی ہیں، اور یہاں سے "متاع دیبل" بھیجی جاتی ہے، تل وغیرہ کی پیداوار زیادہ ہے

بیرون یہ دیبل اور منصورہ کے درمیان میں ہے، یہاں مسلمانوں کی خالص آبادی ہے، ابوریحان بیرونی صاحب کتاب الہند اسی طرف شرف انتساب رکھتا ہے لیکن قلقشندی کا یہ بیان صحیح نہیں ہے، یہ شہر بیرون نہیں، نیرون ہے، جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "عرب وہند" میں یہ تحقیق کی ہے،[۲] الفنسٹن صاحب کی تحقیق کے رو سے حیدرآباد سندھ کا قدیم نام نیرون تھا، ہوسکتا ہے کہ وہی شہر ہو،

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھو "عرب وہند کے تعلقات" ص ۳۲۴، ۲ عرب وہند ص ۳۹۹،

یانی ابوریحان بیرونی کے انتساب کے متعلق قلقشندی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سرے سے صحیح نہیں، ابوریحان بیرونی "ہندوستانی" نہیں بلکہ "خوارزمی" تھا، البیرونی کا یہ انتساب خوارزم کے "بیرونی تعلق" کو ظاہر کرتا ہے، سمعانی نے اپنی کتاب الانساب میں ابوریحان کے اس نسبت سے منسوب ہونے کا تذکرہ خاص طور پر کیا ہے، اور یہی لائق اعتماد ہے، وہ لکھتا ہے :-

ہذہ النسبۃ الی خارج خوارزم فان بہا من یکون من	یہ نسبت خارج خوارزم کی طرف ہے، وہاں جو شخص
خارج البلد ولا یکون من نفسہا یقال لہ "فلاں بیرونی	شہر سے باہر رہتا ہو اور اندرون شہر کا نہ ہو اس
یقال فلان بیرونی است والمشہور بہذہ النسبۃ ابی	کے لیے کہا جاتا ہے کہ "یہ بیرونی ہے" یعنی فلان
ریحان المنجم البیرونی[۱]	بیرونی است" اور ابوریحان منجم بیرونی اسی طرف منسوب ہے

سدوسان ، یہ دریائے مہران کے مغرب میں نہایت خوب صورت شہر ہے، مضافات میں اچھے اچھے گاؤں آباد ہیں،

مولتان اکثر کتابوں میں، واؤ کے ساتھ "مولتان" لکھا ہوا ہے، اور بعض لوگ "ملتان" بھی لکھتے ہیں، اس کو ابوریحان بیرونی نے شہر سندھ میں اور ابن موقل نے ہند میں شمار کیا ہے، یہ منصورہ سے چھوٹا شہر ہے، ملتان کے ماتحت ایک لاکھ ۲۶ ہزار قریے آباد ہیں، اس کے ایک طرف مکران کی سرحد ہے، اور دوسری طرف منصورہ کی سرحد اس کے اور غزنی کے درمیان صرف ۶۸ فرسخ کا فاصلہ ہے،

آزور یہ تقریباً ملتان ہی کے برابر شہر ہے، اس میں دو تین بازار قائم ہیں، دریائے مہران پر واقع ہے، اس کی آبادی خالص اسلامی ہے، منصورہ کے ماتحت ہے، دونوں کے درمیان ۳ فرسخ کا فاصلہ ہے، غالباً اس کا صحیح نام الور ہے، اور عربوں نے کہیں اس کو "الرور" بھی لکھا ہے،

اسی طرح اقلیم سندھ میں چند دوسرے مشہور شہر مکران، تیز، طوران، اور بدھ وغیرہ

---

[۱] کتاب الانساب ورق ۹۰،

ہیں، جن کے مفصل حالات صاحب صبح الاعشیٰ نے تفصیل سے لکھے ہیں، جنھیں یہاں نقل کرنا چنداں ضروری نہیں،

اقلیم ہند اقلیم دوم، اقلیم ہند ہی، تقویم البلدان میں اس کے حدود اربعہ یہ ہیں:-

حدود اربعہ مغرب میں بحر فارس، جنوب میں بحر ہند، مشرق میں صحرائے مابین ہند وچین تقویم البلدان میں اس کی شمالی سرحد مذکور نہیں، لیکن مسالک الابصار میں اس کے شمال میں بلاد ترکستان کو بتایا گیا ہی،

دریا یہاں چھوٹے بڑے تقریبًا ایک ہزار دریا ہوں گے جن میں سے بعض دریائے نیل کے برابر وسیع ہیں، اور بعض اس سے چھوٹے ہیں، یہاں کے بڑے بڑے شہر بالعموم کسی دریا کے ساحل پر آباد ہیں،

آب وہوا یہاں کی آب وہوا اور موسم نہایت معتدل ہی، نہ زیادہ سرد ہی، نہ زیادہ گرم، بلکہ اس کا ہر ایک موسم گویا فصل بہار ہی، ہمیشہ نہایت لطیف اور خوش گوار ہوا کے جھونکے آتے رہتے ہیں، چار مہینے مسلسل بارش ہوتی ہی، جو بالعموم موسم گرما کے بعد اس کے آخر میں شروع ہو جاتی ہی،

پایۂ تخت حکومت ہند کے دو پایہ تخت ہیں، ان میں سے پہلا پایہ تخت دلی ہی، اور دوسرا دواگیر (دیوگیر دکن جہاں محمد تغلق نے اپنے زمانہ میں پایہ تخت کو منتقل کیا تھا)

دلی ہندوستان کا پہلا پایہ تخت ہی، اس کو دہلی بھی کہتے ہیں، یہ ہفت اقلیم میں سے اقلیم چہارم میں واقع ہی، طول بلدہ ۲ ۱ درجہ اور ۵۰ دقیقہ، اور عرض ۵ ۳ درجہ ۵۰ دقیقہ ہی

یہ روئے زمین کا ایک بہت بڑا شہر ہی، یہاں کی زمین پتھریلی ہی، اینٹ کی فصیل قائم ہی، جو حماۃ کی فصیل سے (جو دنیا کی بڑی فصیلوں میں سمجھی جاتی تھی) بھی زیادہ بڑی ہی، دریا (جمنا) سے کچھ دور پر آباد ہی، یہاں سے تقریبًا ایک فرسخ پر ایک دریا بہتا ہی، جو فرات سے بھی چھوٹا ہی، گرمیوں کے زمانہ میں بارش ہوتی ہی، باغ زیادہ نہیں ہیں،

خصوصًا انگور بالکل نہیں پیدا ہوتے ، اس کی "جامع مسجد" میں ایک مینار ہی ، جو تمام دنیا میں اپنی آپ مثال ہی ، سنگ سرخ کا بنا ہوا ہی ، جس میں تقریبًا ۳۰۰ سیڑھیاں ہیں ، خصوصًا اس کی بلندی خاص طور پر قابل ذکر ہی ، جو تقریبًا اسکندریہ کے مینار کے برابر ہوگی ، شیخ برہان الدین بن خلال بزی کوفی کا بیان ہی ، کہ یہ ۶۰۰ فیٹ بلند ہی ۔

دلی در اصل متعدد شہروں کے مجموعہ کا نام ہی ، ان کی مجموعی تعداد ۲۱ ہی ، ان میں سے ہر ایک شہر کے لیے جداگانہ نام ہیں ، ان میں ایک دلی بھی ہی ، پھر سب کے مجموعہ کو بھی دلی کہتے ہیں ،

پوری دلی تقریبًا ۴۰ میل کے دور میں ہوگی ، یہاں کے مکان ، پتھر اور اینٹ کے ہوتے ہیں ، چھتیں لکڑی کی ہوتی ہیں ، سڑکوں پر سنگ مرمر کی طرح کا ایک قسم کا سفید پتھر بچھایا گیا ہی ، مکان بالعموم دو منزلہ سے زیادہ نہیں ہوتے ، بلکہ اکثر مکان یک منزلہ ہیں ، مکانوں میں سنگ مرمر بچھانے کا حق بجز سلطان دلی کے اور کسی کو حاصل نہیں[1] ،

مدارس ، اسپتال اور خانقاہیں

یہاں ایک ہزار مدارس قائم ہیں ، جن میں سے صرف ایک مدرسہ شافعیوں کا ہی ، بقیہ تمام مدرسے احناف کے ہیں ، اسی طرح ۷۰ اسپتال ہیں ، جو دار الشفا کے جاتے ہیں ، تقریبًا دو ہزار خانقاہیں ہیں ، جہاں زائرین کا اژدحام لگا رہتا ہی ، بازار نہایت کشادہ اور وسیع ہیں ، جا بہ جا حمام قائم ہیں ،

شاہی محل

دلی سارے ہندوستان کا دار السلطنت اور سلطان ہند کی جائے قیام ہی ، مستقر سلطانی نہایت عالی شان ہی ، ایک وسیع سلسلۂ محلات قائم ہی ، جن میں سلطان اور حرم سلطانی کے جداگانہ مسکن ہیں ، اسی طرح سلطان کی خواص اور دوسرے پیش خدمتوں کے لیے بھی نہایت خوب صورت عمارتیں ہیں ، خوانین و امراء کو مستقر سلطانی میں رہنے کی اجازت نہیں ، اور نہ محل خاص میں بجز اجازت

---

[1] یہ عجیب روایت ہی جو کسی اور جگہ نظر سے نہیں گذری ،

خاص اور کارخاص کے کبھی کوئی باریاب ہو سکتا ہی، اگر کبھی ضرورت پیش آتی ہی، تو لوگ شاہی محل میں بلائے جاتے ہیں، اور کام کے ختم ہوتے ہی لوٹ آتے ہیں، شاہی محل کے تین طرف مشرق، جنوب، اور شمال میں گرداگرد خوب صورت باغ لگے ہوے ہیں، اور مغرب کی طرف ایک پہاڑی کے خوش نما قدرتی مناظر ہیں،

دولت آباد دواکیر (دیوگیر "دیوگرام" دولت آباد کے نام سے مشہور ہوا) یہ ہندوستان کا دوسرا پایہ تخت ہی، دواکیر (دیوگیر) نام کا ایک قدیم شہر تھا، اس کو محمد تغلق شاہ نے نئے سرے سے تعمیر کرانا شروع کیا، اور "قبۃ الاسلام" نام رکھا، لیکن اپنے جیتے جی اس کو پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا سکا،

سلطان محمد بن تغلق شاہ نے اس کی بنا ایک بالکل جدید طریقہ پر ڈالی تھی، مختلف قسم کے لوگوں کے لیے جداگانہ محلے قائم کیے تھے، مثلاً فوج کا ایک مخصوص محلہ تھا، وزراء کے لیے ایک جداگانہ محلہ، اہل انشا کے لیے ایک الگ آبادی، اور پھر اسی طرح قضاۃ علماء مشائخ، اور فقراء کے لیے الگ الگ محلے قائم کیے گئے تھے، پھر ہر ایک محلہ کے باشندوں کی ضروریات کی مناسبت سے مسجدیں، حمام، اور بازار کا مختلف اسلوب پر اہتمام کیا گیا تھا، اور ہر محلہ میں مختلف کاریگر اور صناع، رنگ ریز رنگ ساز، نجار، اور دبّاغ وغیرہ بسائے گئے تھے، تاکہ کسی ایک محلہ کے رہنے والے کو کسی دوسرے محلہ میں جاکر خرید و فروخت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے، گویا ان میں سے ہر ایک محلہ اپنی اپنی جگہ مستقل ایک چھوٹا سا شہر تھا؛

ہندوستان کے تین خطے اس کے بعد مصنف نے سارے ہندوستان کی آبادیوں کو عمومی طور پر تین قسموں اور خطوں میں تقسیم کیا ہی،

قسم اول بلاد جزرات (گجرات)، قسم دوم بلاد منبار (ملیبار) اور قسم سوم بلاد معبر ہیں،

قسم اول کے ممتاز شہروں میں نہلوارہ یا نہرداراہ (نہروالہ) کھنبایت، تانہ (تھانہ) صومنات (سومنات)، سندان، ناگور، جالور، اور منوری کو شمار کیا ہی، پھر ان میں سے ہر ایک کی وا ســـ؟ قوع طول بلد اور عرض بلد کے ذریعہ سے، اور ہر ایک کے اہم

خصوصیات بتائے ہیں،
نہلواره (نہروالہ) کی جاے وقوع وغیرہ بتانے کے بعد لکھتا ہے، یہ شہر کھنبایت سے بڑا ہے،
کھنبائت کے متعلق لکھتا ہے، کہ اس کو "انبایت" بھی کہتے ہیں، اور اسی سے "انباتی"
نسبت آتی ہے، شیخ مبارک انباتی اسی طرف منسوب ہیں، پھر جائے وقوع بتانے کے بعد
کہتا ہے، یہ بہت بڑا شہر ہے، مکان اینٹوں کے ہیں، اور شہر میں سپید سنگ خام بچھے ہوئے
ہیں، اسی طرح "تانہ" تھانہ (نزد بمبئی) کے متعلق کہتا ہے، یہ نہایت تجارتی شہر ہے، اس
کی زیادہ آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے، اور مسلمان بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں، عرب تاجروں
کی یہاں کثرت سے آمد و رفت ہے، اور اسی لیے اس کا نام تاجروں کے طبقہ میں ہر خاص
و عام کی زبان پر ہے، "تانشی" سے اس کی نسبت کو ظاہر کرتے ہیں، ہندوستان کا مشہور کپڑا
"ثیاب تانشیہ" یہیں بنا جاتا ہے،
سومنات کے متعلق کہتا ہے، اس کو بھی تجارتی حیثیت حاصل ہے، اور یہ زیادہ تر
"بلادلار" کے نام سے مشہور ہے، اس کی زیادہ شہرت اس بت کی وجہ سے ہے، جس کو
محمود بن سبکتگین نے فتح کے وقت توڑ ڈالا تھا، پھر اسی طرح سندان، ناگور،
جالور، اور منورہی کے حالات بیان کیے ہیں، **جالور** کے متعلق کہتا ہے، یہاں کی
آبادی نہایت وفاشعار ہے، کہا جاتا ہے کہ جالور نے سلطان دلی سے کبھی بغاوت نہیں کی

قسم دوم **بلاد میبنار** (ملیبار) کے مشہور شہروں میں ہنور، باسرور، منجرور
(منگلور) تند یور، شالیات (چالیات) شکلی اور کولم (موجودہ ٹراونکور میں داخل ہے)
وغیرہ ہیں، آخرالذکر شہر میں مسلمانوں کا ایک مخصوص محلہ ہے، جس میں جامع مسجد بھی ہے،
ورنہ اکثر شہروں میں ہندو آباد ہیں، اور اکثر شہر بھی غیر مسلم فرماں رواؤں کے قبضہ میں
ہیں، میبنار (مالابار) کا پورا خطہ نہایت سرسبز و شاداب ہے، باغ بکثرت ہیں، اور
ہر قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں، اس کے تجارتی تعلقات بھی دوسرے ممالک سے بہت
اچھے ہیں، اور مسافروں اور تاجروں کی عام آمد و رفت جاری رہتی ہے،
بلاد معبر میں چند مشہور شہر ہیں، جن میں **بیرداول** (بیر دھول) کو زیادہ شہرت

حاصل ہو، یہی یہاں کا پایہ تخت ہو، یہاں گھوڑوں کی درآمد بہت زیادہ ہو،

ہندوستان کے ان تین خطوں کے ماورا چند ایسے شہر رہ جاتے ہیں جو خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں سے ماہورہ (متھرا) لوہور (لاہور) اور قنوج خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں

ماہورہ (متھرا)، کے سر بہ فلک قلعے بہت شہرت رکھتے ہیں، انھیں زیر کرنا سخت دشوار ہو، یہاں خالص برہمنوں کی آبادی ہو،

لوہور (لاہور) بہت بڑا شہر ہو، اور بہت کچھ نفع بخش ہو، یہاں سے ممتاز اہل علم کی ایک جماعت پیدا ہوئی ہو

قنوج لہادر کا دارالحکومت ہو، ہندوستان کے بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا ہو، لوگوں میں اس کی آبادی اور دولت و ثروت کے متعلق مبالغہ آمیز داستانیں مشہور ہیں، کہا جاتا ہو، کہ یہاں تین سو بازار صرف جوہریوں کے ہیں، والی قنوج کے محل کے سامنے ڈھائی ہزار ہاتھی، جھومتے رہتے ہیں، سونے کی کانیں بہ کثرت ہیں، تجارت کا عام بازار گرم رہتا ہو، کشمیر اسی کے ماتحت ہو[۱]،

اسی طرح ہندوستان کا ایک خطہ قامرون (کامروپ یعنی آسام کے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہو، یہ وسیع سلسلہ کوہ ہو، جو ہندوستان اور چین کے درمیان حائل ہو، (سلسلۂ کوہستان ہمالیہ سے مقصود ہو)

ولایات ہند حکومت ہند کی تقسیم میں ہندوستان کل ۲۴[۲] اقلیموں میں منقسم ہو، اور یہ سب اقلیم فرماں روائے دلی کے ماتحت ہیں، قاضی سراج الدین ہندی نے سب کو نام بہ نام گنایا ہو، وہ یہ ہیں، اقلیم دہلی[۱]، اقلیم دواکیر[۲] (دیوگیر) اقلیم ملتان[۳]، کہران[۴] (کھکران علاقہ سرحد) اقلیم سامانا[۵]، سیوستان (سیستان) وجا[۶]

---

[۱] مصنف نے یہ معلومات کسی ابتدائی عربی جغرافیہ سے لیے ہیں، حالاں کہ آٹھویں صدی ہجری میں یہ حالات تمام تر بدل چکے تھے، [۲]

[۲] اقالیم کی تعداد متن میں ۲۳ لکھی ہو، اور ترجمے میں ۲۴ درج کیا ہو۔ اس لیے ۲۳ کے بجائے ۲۴ لکھا گیا۔

ہانسی (ہانسی)، سُرستی، معبتر (کارومنڈل)، تلنگ، گجرات (گجرات)، بدلون (بدایون)، عوض (اودھ)، قنوج، لکنوتی (بنگال)، بہار (بہار)، کرہ (کڑا یعنی دوآبہ الہ آباد) مالوہ (مالوہ)، لہاور (لاہور یعنی پنجاب)، اقلیم کلانور جاجنگر (جاجنگر مونگیر وغیرہ)، تلنج (تلنگ) اور چوبیسویں اقلیم دور سمند (جہاں اب میسور کی ریاست واقع ہے)

پھر ان تمام اقلیموں میں ایک ہزار دو (۱۰۰۲) شہر آباد ہیں، اس کے بعد ان شہروں میں کس قدر قریے ہیں، اس کے اعداد و شمار معلوم نہیں، البتہ قنوج کے متعلق معلوم ہے، کہ اس کے ماتحت ۱۲ لاکھ گاؤں آباد ہیں،

اس کے بعد قلقشندی نے جزائر ہند اور ہندوستان کے رستوں کا ذکر کیا ہے، پھر اس جغرافی تقسیم کے بعد یہاں کے حیوانات اور عام پیداوار وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان حالات میں سب سے دل چسپ بیان یہاں کے جانوروں کے متعلق ہے، لکھتا ہے:-

حیوانات یہاں گھوڑوں کی دو نسلیں ہوتی ہیں، ایک عربی اور دوسری براذین (معمولی گھوڑے)، لیکن براذین میں سے اکثر جانور بے کار ہوتے ہیں، اور اسی وجہ سے ہمسایہ ملکوں ترکستان، بحرین، یمن، اور عراق وغیرہ سے گھوڑے منگائے جاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں عربی گھوڑے بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہوتے ہیں،

خچر اور گدھوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے متعلق باشندگان ہند کی مخصوص ذہنیت کا اس طرح تذکرہ کرتا ہے،

یہاں خچر اور گدھے ہوتے ہیں، لیکن ان کی سواری معیوب ہے، اگرچہ عوام کبھی کبھی سوار ہو جاتے ہیں، لیکن معززین اور اہل علم میں سے کوئی کبھی بھی خچر پر سوار نہیں ہوتا لیکن گدھے کی سواری تو سخت ذلت آمیز اور باعث ننگ سمجھی جاتی ہے، اس لیے یہ خچر بوجھ اٹھانے کے کسی کام میں نہیں لائے جاتے، اور معززین او خواص کے طبقے تو گدھوں کو باربرداری کے کام میں لانا بھی پسند نہیں کرتے، گدھوں کے بجائے دیسی گھوڑے اور

بیل پر بوجھ لادتے ہیں،

گائے، بیل بھی کثرت سے ہیں، اور کاموں کے علاوہ ان پر بوجھ بھی لادتے ہیں،
اونٹ کم ہوتے ہیں، صرف سلاطین، خوانین، امراء وزراء اور اکابر سلطنت کے
یہاں بطور شان امتیاز رہتے ہیں،

چوپایہ جانوروں میں ان کے علاوہ بھینس، بکری، بینڈھا ہے، پرندوں میں
مرغیاں، کبوتر، اور وحشی جانوروں میں ہاتھی اور گینڈے کثرت سے ہیں، اور ان
کے علاوہ جنگلوں میں ہر قسم کے درندے بھی پائے جاتے ہیں،

پیداوار، صنعت وحرفت

اس کے بعد یہاں کی پیداوار کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے، اور
یہاں کے ہر قسم کے غلے، پھل، پھول، میوے، اور سبزی
ترکاریوں، وغیرہ کو نام بنام پوری تفصیل سے درج کیا گیا
ہے، اور پھر اسی سلسلہ میں مختلف صنعت وحرفت اور پیشہ والوں کا تذکرہ کیا ہے، جس میں
ارباب صنائع داخل ہیں، اس کے بعد ہندوستان کے سکوں کا تفصیل سے ذکر آیا ہے،
سکوں کے متعلق لکھتا ہے:-

سکے

یہاں چار قسم کے درہم رائج ہیں، ایک **ہشت گانی** (مساوی آٹھ آنہ)
ہے، کہا جاتا ہے، کہ یہ مصر کے نقرئی درہم کے مساوی ہوتا ہے، دونوں میں
بہت کم فرق ہے، ہندوستان میں آٹھ جیتل کا ایک ہشت گانی ہوتا ہے، اور ایک جیتل (مساوی
ایک آنہ) چار فلس (پیسوں) کا ہوتا ہے، یعنی ۳۲ پیسوں کا ایک ہشت گانی، ایک دوسرا سکہ
درہم **سلطانی** ہے، یہ دوگانی بھی کہا جاتا ہے، مصری درہم کا چوتھائی ہوتا ہے، اور جیتل
کا ایک درہم سلطانی ہوگا، گویا آٹھ پیسوں کا ایک درہم سلطانی ہوا، تیسرا سکہ
شش گانی ہے، یہ ہشت گانی کا نصف وربع ہوتا ہے، اور درہم سلطانی سے تین
درہم ہوں گے، چوتھی قسم کا سکہ **دوازدہ گانی**، یہ بھی ہشت گانی کا نصف وربع ہوتا
ہے، گویا **شش گانی** کے مساوی ہوتا ہے، اور پھر ہشت گانی کے آٹھ درہم مل کر ایک
تنکہ (ٹنکہ مساوی ایک روپیہ) ہوتا ہے،

پھر بیس سو سونے کے سکے شروع ہوتے ہیں، سونے کے سکوں کا حساب مثقال سے ہوتا ہو، تین مثقال کا ایک تنکہ ہوتا ہو) تنکہ سونے اور چاندی دونوں طرح کے رائج ہیں، سونے کا تنکہ، تنکہ سرخ اور چاندی کا تنکہ سپید (مساوی تقریباً ڈھائی روپیہ) اور پھر ایک لاکھ تنکہ کا ایک لک (لاکھ) ہوتا ہو، اور یہ بھی سونے اور چاندی کے لحاظ سے سرخ وسپید کہا جاتا ہو،

پیمانہ یہاں کا رطل ستر (سیر) کہا جاتا ہو، جو ۷ مثقال کا ہوتا ہو، اور پھر چالیس سیر کا ایک من ہوتا ہو، یہاں تمام خرید و فروخت وزن ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہو، ناپ (کیل) کا طریقہ رائج نہیں ہو،

نرخ ہندوستان میں عام نرخ نہایت ارزاں ہو، ایک ہندی عالم قاضی القضاۃ کا بیان ہو، کہ دہلی میں کام کاج کرنے والی باندیوں کی قیمت ۸ تنکہ (روپیہ) سے زیادہ نہیں ہو، اور جو باندیاں کام کاج بھی کرسکتی ہیں، اور ام ولد بھی بنائی جا سکتی ہیں، وہ ۱۵ تنکہ میں مل جاتی ہیں، یہ تو پایہ تخت کا حال ہو، ورنہ دوسرے شہروں میں اس سے بھی ارزاں قیمتوں پر فروخت ہوتی ہیں، خود سراج الدین ہندی نے ایک غلام صرف ۴ درہم میں خریدا تھا، لیکن اس ارزانی کے باوجود ہندوستان میں بعض لونڈیاں اپنے حسن وجمال کی قیمت بیس بیس ہزار تنکہ (روپیہ) سے بھی زیادہ پاتی ہیں، اور لوگ نہایت کشادہ دلی سے یہ قیمتیں ادا کرتے ہیں،

شیخ مبارک انباتی نے ایک بیان میں ہندوستان کے عام نرخ کا تذکرہ کیا ہو، جس سے آٹھویں صدی کے ہندوستان کی اقتصادی حالت کا عام اندازہ ہو سکتا ہو ان کے بیان میں نرخ کا حسب ذیل نقشہ ہو،

(ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۸)

---

[۱] ایک عربی مثقال ایک سو جو کے ہم وزن ہوتا ہو، جو ہندوستان کے موجودہ اوزان میں ۴ ماشہ ۴ رتی کے برابر ہوتا ہو،

نام	مقدار	قیمت	کیفیت
گیہوں	فی من	ڈیڑھ ہشت گانی درہم	یعنی ۱۲ر فی من
جو	〃 〃	ایک	
چاول	〃 〃	پونے دو ہشت گانی درہم	لیکن چاول کی بعض اچھی قسمیں اس سے زیادہ گراں قیمت ہیں
چنا	〃 〃	نصف 〃 〃	یعنی ۴ر من
گائے اور بکری کا گوشت	۴ سیر	ایک درہم سلطانی	
بط	ایک عدد	۲ درہم ہشت گانی	
مرغی	۴ عدد	ایک 〃 〃	
شکر	۵ سیر	ایک 〃 〃	ایک روپیہ
بکری	ایک عدد	ایک تنکہ (آٹھ درہم ہشتگانی)	یہ خوب تن و مندی بکری کی قیمت ہے
گائے	ایک عدد	۲ تنکہ	یہ خوب تنومند گائے کی قیمت ہے
بھینس	ایک 〃	〃	یعنی ۲ روپیہ

اسی طرح پرند کبوتر وغیرہ نہایت ارزاں قیمت پر ملتے ہیں، اور ہر قسم کے شکاری جانور بھی سستے داموں پر کثرت سے بکتے ہیں، یہاں گوشت زیادہ تر گائے اور بھیڑ کا کھایا جاتا ہے، حالانکہ بینڈھے بھی بر کثرت ملتے ہیں، اس لیے سوائے اس کے اور کوئی وجہ نہیں کہ لوگ لحم بقر کھانے کے زیادہ عادی ہو گئے ہیں،

نرخ کی عام ارزانی

صاحب مسالک الابصار نے شیخ خجندی کا ایک بیان نقل کیا ہے، جس سے یہاں کے نرخ کی عام ارزانی کا پتہ چلتا ہے، وہ کہتے ہیں

"میں اور میرے اور تین دوستوں نے دلی میں گائے کا گوشت، روٹی، اور گھی نہایت سیر ہو کر کھایا، اور چاروں آدمیوں کے پورے کھانے کی قیمت ایک جتیل یعنی صرف چار پیسے تھی،

سلاطین

اس کے بعد ہندوستان کے سلاطین اسلام کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے، جس میں سلاطین غزنویہ سے شروع کر کے سلطان غیاث الدین محمود کے عہد پر ختم کیا ہے، یہی آخر الذکر سلطان اور قلقشندی صاحب صبح الاعشیٰ دونوں، ہم عصر تھے۔

سلطان محمد بن تغلق شاہ

اس کے بعد ان سلاطین اسلام میں سے اپنے دور یعنی آٹھویں صدی ہجری کے فرمان روائے ہند سلطان محمد بن تغلق شاہ کے عہد کو کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے، کیونکہ شیخ مبارک انباتی وغیرہ اسی عہد میں گذرے ہیں، اور اسی کے دربار سے وابستہ تھے، محمد بن تغلق شاہ کے عہد حکومت کے یہ حالات ان ہی کے بیانوں سے ماخوذ ہیں، اس عہد حکومت کے حالات بیان کرتے ہوئے پہلے حکومت کے فوجی نظام اور عمال حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر سلطان کے عام مشاغل دربار، سیر وشکار اور طریقۂ حکومت کو بیان کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں لکھتا ہے:۔

شاہی فوج

سلطان محمد بن تغلق شاہ (جلوس ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء وفات ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء) کی شاہی فوج نو لاکھ سے زیادہ ہے، جس میں ترکی، ایرانی، اور ہندوستانی وغیرہ مختلف قومیں ہیں، فوج نہایت زرق برق لباس میں ملبوس اور نہایت شان و شوکت سے عربی گھوڑوں پر سوار رہتی ہے، شاہی فوج کے عہدے بہ ترتیب یہ ہیں، خوانین[۱]، ملوک، امراء، سپہ سالار اور سپاہی، ان تمام عہدے داروں کے ماتحت مختلف تعداد میں فوج ہوتی ہے، جس کا نقشہ حسب ذیل ہے،

(۱) خان دس ہزار سوار (۱۰۰۰۰) (۲) ملک ایک ہزار سوار (۱۰۰۰)

(۳) امیر ایک سو (۱۰۰) (۴) سپہ سالار ایک سو (۱۰۰) سے کم

خاص بارگاہ سلطانی میں ۸۰ سے زیادہ خوانین حاضر رہتے ہیں، چھوٹے عہدہ دار سپہ سالار وغیرہ بارگاہ سلطانی میں خود حاضر ہونے کی جرأت نہیں کرسکتے، اور حسب ضرورت وہ بھی بلند مرتبہ عہدہ داروں کے فرائض انجام دیتے ہیں،

سلطان حالت جنگ میں

میدان جنگ میں سلطان کے سر پر سات چتر لگائے جاتے ہیں، جن میں سے وہ خصوصیت کے ساتھ

[۱] "خان" کی فارسی جمع خانان، اس سے عربی جمع خوانین،

نہایت مرصع مطلا اور مذہب ہوتے ہیں، جنگ کا نقشہ یوں ہوتا ہے،

سلطان خود قلب فوج میں ہوتا ہے، اور اس کے گرداگرد ائمہ و علما، اور ان کے بعد تیر انداز پرے جمائے کھڑے ہوتے ہیں، پھر سلطان کے دو بازوؤں پر میمنہ میسرہ بنائے جاتے ہیں، اور اس کے سامنے ہاتھیوں کا جھنڈ ہوتا ہے، ہاتھیوں پر برجوں سے ڈھکے ہوئے آہنی ہودج رکھے جاتے ہیں، جن پر تیر انداز سوار رہتے ہیں، اور پھر ان ہی برجوں کے ہر سمت میں سوراخ بنے ہوتے ہیں، جن سے تاک تاک کر نشانے لگائے جاتے ہیں اور ان ہی ہودجوں میں روغن نفط ہوتا ہے، جو شیشہ کی نلکیوں سے دشمنوں پر اچھالا جاتا ہے جس سے شعلے پیدا ہوتے ہیں لے

ملازمین بارگاہ سلطانی اس شاہی فوج کے علاوہ ایک متعین تعداد ملازمین بارگاہ کی ہوتی ہے، جو امتثال امر کے لیے ہمہ وقت محل شاہی کے گرد موجود رہتے ہیں:۔

ترکی غلام دس ہزار (۱۰۰۰۰) خواجہ سرا دس ہزار (۱۰۰۰۰)

خزانہ دار ایک ہزار (۱۰۰۰) بشمقدار[لے] ایک ہزار (۱۰۰۰)

ہمرکاب غلام (باڈی گارڈ) دو ہزار (۲۰۰۰) یہ اسلحہ سے آراستہ ہمہ وقت ساتھ رہتے تھے،

شاہی فوج اور ملازمین بارگاہ کی تمام تنخواہیں دیوان سلطانی سے ادا ہوتی تھیں

عمال شاہی عمال شاہی میں ایک وزیر اعظم ہے، جس کے چار سکریٹری (کاتب سر) ہوتے ہیں، جو ملکی زبان میں دبیر کہے جاتے ہیں، اور پھر ہر دبیر کے ماتحت ۳۰۰ منشی ہیں، صیغہ عدالت شاہی میں سب سے بڑا عہدہ دار قاضی القضاۃ ہے، جو نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے، اس کے ماتحت محتسب، شیخ الشیوخ اور ۱۲۰۰ اطبا ہیں،

ان کے علاوہ سلطان کے عام درباری اور حاضر باش عہدہ دار اور ان کے مناصب حسب ذیل ہیں:۔

نام	تعداد	کیفیت
بازدار	۱۰۰۰	شکار کرنے والے جانوروں (باز وغیرہ) کو گھوڑے پر اٹھائے رکھتے ہیں،
سواق (شکار ہنکانے والے)	۳۰۰۰	شکار ہنکاتے ہوئے گھیر گھیر کر لاتے ہیں
ندیم (مصاحب)	۵۰۰	
مغنی و مغنیات	۱۲۰۰	ان میں سے ایک ہزار غلام فن موسیقی پر پورا کمال رکھتے ہیں
شعراء	۱۰۰۰	عربی، فارسی، اور ہندی زبان میں شاعری کرتے ہیں،

جاگیر اور تنخواہیں ان تمام عہدے داروں، اہل مناصب، اور درباری متوسلین کی مختلف جاگیریں اور تنخواہیں مقرر ہیں، جو خاص دیوان سلطانی سے ادا ہوتی ہیں، ممتاز عہدے دار اور اہل مناصب کی تنخواہیں اور جاگیریں حسب ذیل ہیں،

نام عہدہ	جاگیر یا تنخواہ	کیفیت
نائب کبیر	جاگیر ایک صوبہ	جو وسعت میں عراق کے اندر ہو
خان	تنخواہ ۲ لاکھ تنکہ (روپیہ)	
امیر	" ۳۰ ہزار سے ۴۰ ہزار تنکہ تک،	
سپہ سالار	۲۰ ہزار اور ۳۰ ہزار روپیہ	
سپاہی اور چھوٹے عہدہ دار	ایک ہزار تنکہ سے ۱۰ ہزار تک،	
مملوک،	ایک ہزار تنکہ سے ۵۰ ہزار تک،	
غلام	دس (۱۰) نقرئی تنکہ (ایک تنکہ ڈھائی روپیہ یا ہ) ۲ من گیہوں اور چاول اور ۳ سیر گوشت روزانہ	

ارباب قلم میں سے حسب ذیل عہدہ داروں کی حسب ذیل تنخواہیں اور جاگیریں ہیں،

وزیر اعظم	جاگیر ایک صوبہ	جو وسعت میں عراق کے مثل ہو،
دبیر	" ۴ شہر	جو اپنی آمدنی کے لحاظ سے نہایت ممتاز ہوتے ہیں،
نبی کبیر	(رہنما ایک)	تنخواہ ۱۰ ہزار تنکہ

۱ قاضی قضاۃ (صدر جہاں) جاگیر ۱۰ گاؤں جن کی آمدنی کم از کم ۶۶ ہزار تنکہ ہوتی ہی،
شیخ الشیوخ " " " " "
محتسب ایک گاؤں جن کی آمدنی ۸ ہزار تنکہ ہوتی ہی،
ندیم ایک یا دو گاؤں جن میں سے ہر ایک کی آمدنی ۲۰ ہزار سے
۴۰ ہزار تنکہ تک ہوتی ہی،

لیکن ان تمام عہدہ داروں اور اہل مناصب کے جملہ ذاتی اخراجات خورد و نوش، پوشش اور سواری کا سارا بار شاہی مطبخ اور شاہی خزانہ پر ہوتا ہی، علاوہ ازیں کبھی کبھی مختلف موقعوں پر مختلف اہل مناصب کو خلعت ہائے فاخرہ سے بھی سرفراز کیا جاتا ہی،

شاہی دسترخوان شاہی محل میں دو دسترخوان ہیں، ایک دسترخوان عام ہی، جس پر ۲۰ ہزار اکابر ملک، خوانین، ملوک، امرا اور ممتاز عمال حکومت روزانہ کھانا کھاتے ہیں، دوسرا دسترخوان خاص ہی، وہ مخصوص سلطان ہند کا ہی، دسترخوان پر سلطان کی معیت میں صرف ۲۰۰ علماء و فقہا شریک طعام ہوتے ہیں، اور دسترخوان ہی پر سلطان کے سامنے مختلف علمی و مذہبی مباحث پر سرگرم گفتگو ہوتی ہی،

شیخ ابوبکر بن خلال بیان کرتے ہیں، کہ انھوں نے شاہی محل کے باورچی سے روزانہ کے ذبیحوں کی تعداد دریافت کی تو معلوم ہوا کہ ۲۵۰۰ گائیں، ۲۰۰۰ بکرے روزانہ ذبح ہوتے ہیں، ان کے علاوہ دسترخوان پر مختلف قسم کے پرندوں کے گوشت بھی ضرور رہوتے ہیں،

ہفتہ وار دربار سلطان ہفتہ میں ہر سہ شنبہ کو دربار عام منعقد کرتا ہی، اس دربار کے لیے ایک بہت بڑا وسیع ایوان مخصوص ہی جو ہر قسم کے تکلفات سے آراستہ و پیراستہ رہتا ہی، صدر میں ایک نہایت بلند مرصع نشیمن زرنگار بچھا ہوتا ہی، سلطان اسی پر جلوس کرتا ہی، دائیں بائیں ارباب حکومت ایستادہ ہوتے ہیں، پشت پر ہتھیار بند سلحہ دار اور سامنے ارباب وظائف و اہل

مناصب حسب حیثیت و مرتبت کھڑے ہوتے ہیں، بیٹھنے کی اجازت صرف صدر جہاں یعنی قاضی القضاۃ اور خوانین کو ہوتی ہو، اور ان کے دبیر بھی اپنے دفاتر سنبھالے موجود ہوتے ہیں،

دربار کے افتتاح کے موقع پر ایک نقیب بہ آواز بلند پکارتا ہو "مظلومین اپنی فریاد سنائیں" "اہل حاجت اپنی ضرورتیں پیش کریں"، جسے کوئی شکایت ہو، یا ہر وہ شخص جو حاجت مند ہو اس کے لیے اذن عام ہو کہ حاضر حضور ہو جائے، نقیب کے خاموش ہوتے ہی اہل غرض بلا تکلف سامنے آجاتے ہیں، اور سامنے کھڑے ہو کر نہایت صفائی سے حالات بیان کرتے ہیں، اثناے بیان میں کسی کو کسی کے روکنے کی مجال نہیں، حالات سن کر سلطان خود فرمان قلم بند کرتا ہو،

سلسلہ رسل و رسائل

سلطان کے سلسلہ رسل و رسائل اور پرچہ نویسی کا نظام نہایت عمدہ ہو، اور اس کی مختلف قسمیں ہیں، مثلاً ملک کی عام رعایا کے درمیان چند ایسے افراد مخصوص ہوتے ہیں، جو عام حالات سے آگاہی حاصل کرنے پر مامور ہوتے ہیں، اور وہی لوگ اپنے اعلیٰ افسروں تک ہر قسم کی خبریں پہونچاتے ہیں جو بہ تدریج سلطان تک پہونچا دی جاتی ہیں،

دور دراز ممالک سے سلطان تک جلد تر خبر پہونچانے کا انتظام نہایت معقول ہو، تمام ممالک سے قصر سلطانی تک پختہ سڑکیں بنائی گئی ہیں، جن کے ذریعہ سے مصر و شام کی طرح ڈاک کا نہایت عمدہ انتظام ہو، اگرچہ ان ممالک میں ڈاک کا انتظام اس لیے زیادہ بہتر ہو، کہ آبادیاں ایک دوسرے سے دور نہیں ہیں، لیکن ہندوستان کی حالت اس سے مختلف ہو، وہاں نہایت دور دور پر آبادیاں قائم ہیں، لیکن اس دشواری کے باوجود ہر چار فرلانگ پر ایک مکان بنا ہوا ہو، اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچنے کے لیے دس دس ہرکارے مقرر ہیں، جو خطوط، فرامین، اور دوسری مرسلہ اشیاء نہایت تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچاتے ہیں، اور پھر اسی ترتیب سے نہایت سرعت کے ساتھ وہ ڈاک قصر شاہی اور قصر شاہی سے دوسرے مقام تک پہونچ جاتی

ہو ، ڈاک کے اس راستہ میں ہر جگہ مناسب موقع سے مسجدیں ، بازار اور کنوئیں موجود ہیں ،

شاہی سفر شاہی سفر بڑے تزک و احتشام سے انجام پاتا ہو ، ایک شخص گھوڑے پر سوار تاج شاہی پر چتر لگائے رہتا ہو ، سلاح دار زرق برق لباس میں ملبوس اپنے چمکیلے ہتھیار سنبھالے ہوے سواری کے پیچھے ہوتے ہیں ، دائیں بائیں تقریباً ۱۲ ہزار خدام پاپیادہ رہتے ہیں ، سواری کے آگے طبل بجتا رہتا ہو ، طبل میں ۲۰۰ نقارے ، ۴۰ کوس ، ۲۰ بوق ، اور ۱۰ چنگ ہوتے ہیں ، سلطان کے ساتھ دوسرے اعیان حکومت اپنے اپنے امتیازی جھنڈوں کے ساتھ ہم رکاب ہوتے ہیں ، بعض خوانین کو سات سات جھنڈوں کے رکھنے کی اجازت ہوتی ہو ، ان اعیان حکومت کے چند دیگر امتیازات خصوصی بھی ہوتے ہیں ، مثلاً خوانین عام طور پر دس کوتل گھوڑے اپنے ہم رکاب رکھ سکتے ہیں ، اور امراء کو صرف ۳ کوتل گھوڑوں کی اجازت ہوتی ہو ،

شکار شکار میں سلطان کی بالکل جداگانہ شان و شوکت ہوتی ہو ، وہ خود تو نہایت معمولی لباس میں ملبوس رہتا ہو ، لیکن ایک لاکھ سوار اور دو سو ہاتھی اس کے ہم رکاب رہتے ہیں ، شکار کے سلسلہ میں "قابل نقل و حرکت" محل خاص طور پر تذکرہ کے قابل ہو ، یہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ آراستہ و پیراستہ قصر ہوتے ہیں ، جو میدان میں دو منزلہ کھڑے کیے جاتے ہیں ، اور محل کی پوری عمارت زرکار ریشمی پردوں سے ڈھکی ہوتی ہو ، اس کا سامان دو سو اونٹوں پر بار ہوتا ہو ، اور دیگر خیمہ و خرگاہ جو شکار کے لیے مخصوص ہیں ، اس کے علاوہ ہیں ، لیکن جو سفر محض سیر و تفریح کی خاطر ہیں ، ان میں تقریباً تیس ہزار سوار اور ایک ہزار کوتل گھوڑے ساتھ ہوتے ، جو ہیرا و یاقوت کے طوقوں سے آراستہ ہوتے ہیں ،

سلطان و عمال سلطانی کے ... محلات شاہی میں سے ایک عظیم الشان قصر میں حکومت کا صدر دفتر ہو ، بارگاہ سلطانی میں کسی کو ہتھیار بند حاضر ہونے کی اجازت

نہیں، یہاں تک کہ معمولی چھڑی بھی ہاتھ میں نہیں رکھی جا سکتی، سلطان خود سات دروازوں کے اندر بیٹھتا ہے، باریاب ہونے والوں کو پہلے ہی دروازہ پر سواریوں سے اتر جانا پڑتا ہے، صرف چند مخصوص اہل مراتب چھ دروازوں تک سوار جا سکتے ہیں، لیکن یہ محض معدودے چند افراد کو خصوصیت حاصل ہے، پہلے دروازے پر بوق وطبل کا اہتمام ہوتا ہے، جب معزز عہدہ دار حاضر بارگاہ ہوتے ہیں، تو ان کی شان امتیاز کے لیے وہ بجائے جاتے ہیں، قصر شاہی کا ساتواں دروازہ صرف ایک مرتبہ کھلتا ہے، لوگ جیسے جیسے آتے جاتے ہیں، ساتویں دروازے پر کھڑے ہوتے جاتے ہیں، جب شرف حضوری رکھنے والوں میں سے ہر ایک شخص آجاتا ہے، تو خاص اہتمام سے وہ ساتواں دروازہ بھی کھول دیا جاتا ہے، تو سب لوگ ایک ساتھ باریاب ہو کر آداب شاہی بجالاتے ہیں، پھر جن اہل مناصب کو بیٹھنے کی اجازت عطا ہوتی ہے، وہ حسب مرتبت نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں، اور بقیہ تمام اشخاص سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں، باریابی کے ان آداب ورسوم کی ادائی کے بعد ہر شخص اپنے اپنے دفتر میں اپنی اپنی جگہوں پر چلا جاتا ہے، اور روزانہ کے کام میں مصروف ہو جاتا ہے، ان عمال شاہی میں سے وزیر اعظم، قاضی القضاۃ، اور دبیروں کی نشستیں علیحدہ کمروں میں سلطان کی نگاہ سے اوجھل ہوتی ہیں،

اس کے بعد مختلف حاجب اپنے اپنے افسر اعلیٰ کی خدمت میں آتے ہیں، اور ارباب مظالم اور مظلوموں کے تمام مقدمات کی مسلیں تفصیل سے پیش کرتے ہیں، پھر وہ افسر اعلیٰ ان تمام مسلوں کو سلطان کے سامنے پیش کرتا ہے، اور سلطان مطالعہ اور غور وخوض کے بعد اپنے احکام ثبت کرتا ہے، پھر سلطان کے اٹھ جانے کے بعد حاجب اعلیٰ تمام کاغذات دبیروں کے روبرو پیش کرتا ہے، اور وہی احکام سلطانی کو نافذ کرتے ہیں، سلطان شاہی دفتر سے اٹھ کر ایک دوسری بزم خاص میں آتا ہے، یہاں علماء، ماہرین فن، اور ارباب ادب جمع رہتے ہیں، اور سلسلہ بحث ومناظرہ جاری ہوتا ہے، اور پھر سب لوگ یہیں سے کھانے پر جمع ہوتے ہیں، اس کے بعد ہر شخص اپنی اپنی اقامت گاہ

پر چلا جاتا ہے، اور سلطان قصر شاہی میں جاکر آرام کرتا ہے،

محمد بن تغلق شاہ کا عہد حکومت

شیخ مبارک انباتی سلطان محمد بن تغلق شاہ کے شان و شوکت، جاہ و جلال اور خدم و حشم پر عام طور سے یوں تبصرہ کرتے ہیں،

"مسند شاہی اپنے عظمت و جلال اور قوانین شاہی اپنے عدل و انصاف اور نظام حکومت اپنے ضبط و نظم میں ساری دنیا میں بے نظیر ہیں، دنیا نے اس سے پہلے صرف دو نظارے دیکھے تھے، ایک سکندر ذوالقرنین کے وقت میں اور دوسرے ملک شاہ بن الپ ارسلان کے عہد میں، اور اب وہی شان و شوکت، جاہ و جلال اور کر و فر محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں ہندوستان میں نظر آتا ہے"،

(دسمبر ۱۹۲۲ء)

عیدین کے مراسم اسلامی ہند میں

ہر قوم اور مذہب کی اجتماعی زندگی میں چند ایسے دن پائے جاتے ہیں جو قومی اور مذہبی حیثیت سے ان کی خوشی کے دن ہوتے ہیں اور اس دن پوری قوم دلی جوش اور ولولہ سے خوشی مناتی ہے۔

یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو شخص مسلسل کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے وہ کسی وقت دفعتہً کام چھوڑ کر کسی اضطراری حرکت میں مشغول ہو جاتا ہے جس سے اس کی پچھلی مشغولیت اور اس کے بعد کے کرنے والے کام میں ایک فصل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے اس کی تھکن دور ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے قویٰ کو سمیٹ کر نئی قوت اور تازگی سے کام شروع کر دیتا ہے، جو حال افراد کا ہوتا ہے، وہی جماعتوں اور قوموں کا ہے، قوموں کی زندگی مسلسل طور پر اپنی جد و جہد میں لگی ہے، اور اجتماعی حیثیت سے کسی راہ پر جا رہی ہے۔ اس لیے اسے بھی پیدا کرنے اور اس میں نئی قوت اور تازگی پیدا کرنے کے لیے ایک کروٹ لینے کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ وہ بھی اپنی پچھلی و آئندہ زندگی میں فصل پیدا کرے، اور نئے جوش اور ولولہ سے نئی راہ پر چلنے کے لیے تیار ہو جائے، اسی روز فصل کو مختلف قوموں اور ملتوں میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، اور جشن کی صورت میں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

عیدین کے مصالح امت اسلامیہ کے لیے بھی پچھلی امتوں کی طرح سال کے دو موقعوں پر جشن کے لیے دن مقرر کیے گئے، اور جس طرح پچھلی امتوں میں ان کی قومیت، ملت اور [illegible] اہم واقعوں کی یاد منانے کے لیے وہ دن مقرر تھے، اسی طرح اسلام نے بھی دو اہم موقعوں کی یاد جشن عام کی صورت میں منانے کا حکم دیا، یہ دونوں عید فطر اور عید اضحیٰ ہیں۔

اس کے ساتھ اسلام نے ان دونوں عیدوں کے منانے میں مسلمانوں کے لیے

مختلف قسم کے دینی، معاشرتی، اور اجتماعی فوائد ملحوظ رکھے ہیں، مثلاً

(۱) مسلمانوں کے لیے قومی و ملی حیثیت سے سب سے زیادہ مبارک دن وہ ہو جس دن قرآن پاک اس زمین پر اترا اس کے ذریعہ سے باطل مٹا یا گیا، اور حق کا بول بالا ہوا، جہل کی تاریکی چھٹ گئی، اور علم کی روشنی پھیلی، اور انسان نے سیدھی اور سچی راہ پر چلنا سیکھا، اس لیے اس کو قومی مسرت کا باعث قرار دیا گیا، روزے اس ماہ مبارک میں فرض کیے گئے جس میں قرآن پاک نازل ہوا اور پھر ان کی ادائی کے شکر میں جشن عید منانے کا حکم دیا گیا، فرمایا:-

ولتکبروا اللہ علی ما ھدٰ لکم (بقرہ - ۲۲)

(۲) عید اضحیٰ کے ذریعہ سنت ابراہیمی کی یاد تازہ کی جاتی ہو کہ انھوں نے حق کی راہ میں اپنی عزیز اولاد کی گردن پر اپنے ہاتھ سے چھری پھیر دینے میں تامل نہیں کیا، اور دنیا کو سبق سکھایا کہ حق کے آگے عزیز ترین اولاد تک کو قربان کردینا چاہیے، اور اسی قربانی سے حق کے علم بردار نے نمرودی طاقت پر فتح پائی، اس بے مثال فدائیت کے اعزاز میں اس دن کو مسلمانوں کے لیے خوشی کا دن قرار دیا گیا، ارشاد ہوا:-

وفدینٰہ بذبح عظیم (صٰفٰت)

(۳) دین فطرت کا ظہور عرب کی بے آب وگیاہ زمین سے ہوا تھا۔ خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لاکر اس دین کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا، اور مکہ میں خدا کا جو سب سے پہلا گھر بنایا گیا، دینی حیثیت سے اس کی مرکزیت کی تصدیق فرمائی، اور استطاعت رکھنے والوں کے لیے اس کی زیارت کرنا فرض ٹھہرایا، حکم دیا گیا،

وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا

(آل عمران ۱۰)

(۴) جیسا کہ حج میں مختلف ملکوں اور گروہوں کے ایک جگہ جمع ہونے اور دین

اور دنیا کے مسئلوں پر تبادلۂ خیال کرنے سے اسلام کو اجتماعی حیثیت سے فائدہ پہونچانے، مسلمانوں کی باہمی اصلاح کرنے اور مختلف ملکوں کے مسلمانوں کی ضرورتوں سے ایک دوسرے کے باخبر ہونے کے موقع حاصل ہونے کے امکانات رکھے گئے۔

فاجعل افئدۃ من الناس تہوی الیھم (ابراہیم - ۶)

(۵) اسلام نے عالمگیر مساوات اور برادری اور انسانی ہمدردی کی دعوت دی ہے عیدین کے تہواروں کے ذریعہ سے اس نے اس مقصد کے حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہے، ان تہواروں کو امیر اور غریب، دولت مند اور فقیر سب کے لیے یکساں خوشی کا دن بنایا اور ان موقعوں پر ان دونوں طبقوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش کی جشن میں ہم رنگ ہو کر ملنے جلنے کے موقعے بہم پہونچائے، امیروں کی دولت میں سے اس خاص موقع پر ایک مقرر رقم غریبوں کے لیے نکالنے کا حکم دیا، عید فطر میں صدقۂ فطر کے نام سے ہر استطاعت رکھنے والے پر غلہ کی ایک مقدار یا اس مقدار کی قیمت نقد رقم کی شکل میں نکال کر غریبوں میں بانٹنے کا حکم دیا، عید اضحیٰ میں قربانی کے گوشت میں سے ایک حصہ غریبوں کے لیے خاص کر دیا، اور تاکید کی کہ اگر وہ حصہ انھیں دے نہ دیا جائے، تو درحقیقت قربانی ادا نہ ہوگی، شریعت نے عیدین کے تہواروں میں اور اسی قسم کی بہت سی مصلحتیں پنہاں رکھی ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے ان مصالح پر اجمالی نظر ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"عیدین کی بنیاد یہ ہے کہ ہر قوم میں ایک دن ایسا ہوتا ہے جس میں وہ زیب و زینت کرتی ہے، اور اپنے گھروں سے اسی زیب و زینت میں نکلتی ہے، یہ ایک ایسی روش ہے جس سے عرب و عجم کی کوئی قوم خالی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو اہل مدینہ دو دنوں میں کھیل کود کرتے تھے، آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ دو دن کیسے ہیں؟ ان لوگوں نے کہا کہ ہم زمانہ جاہلیت میں ان دونوں دنوں میں کھیل کود کرتے تھے، ارشاد ہوا کہ خدا نے ان کو ان دونوں سے بہتر دنوں سے بدل دیا، اور وہ دونوں عید اور بقرعید کے دن ہیں۔"

کہا جاتا ہے، کہ وہ دونوں دن نوروز اور مہرجان کے تھے، لیکن وہ اس لیے بدل دیے گئے، کہ لوگ جو عید مناتے ہیں۔ اس کا سبب یا تو یہ ہوتا ہے کہ اوس ہی شعائر دین کا بول بالا ہوتا ہے، یا کسی پیشوائے مذہب کی توقیر مقصود ہوتی ہے، یا اسی قسم کا کوئی اور سبب ہوتا ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کو یہ خیال ہوا کہ اگر اہل مدینہ کو اسی روش پر چھوڑ دیا گیا تو اس سے یا تو کسی جاہلی شعار کا بول بالا ہوگا، یا نامور ان جاہلیت کی کسی سنت کی ترویج ہوگی۔"

اس لیے آپ نے ان کو ایسے دو دنوں سے بدل دیا جن سے ملت ابراہیمی کے شعائر کا بول بالا اور ان دنوں میں زیب و زینت کے ساتھ ذکر خدا اور اطاعت الٰہی کے چند ابواب بھی شامل کر دیے تاکہ مسلمانوں کا اجتماع محض لہو و لعب کے لیے نہ ہو اور نہ ان کا کوئی اجتماع اعلائے کلمۃ اللہ سے خالی نہ ہو ان میں ایک دن تو وہ ہے جب وہ لوگ روزہ سے فارغ ہو چکتے ہیں اور ایک قسم کی زکوٰۃ ادا کر چکتے ہیں اس لیے ایک تو طبعی خوشی ہوتی ہے، کہ جو چیز ان پر شاق تھی، اوس سے فرغت حاصل ہو گئی، اور فقیروں نے صدقات لے لیے، دوسرے عقلی مسرت ہوتی ہے، کہ خدا نے جو چیز اون پر فرض کی تھی اوس کے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی، اور ان کے اہل و عیال کو دوسرے سال تک رکھ کر اون پر احسان فرمایا۔"

دوسرا دن وہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمعیل کو ذبح کرنا چاہا، لیکن خدا نے اول اون پر احسان کیا، کہ ان کے بدلے ایک دوسرا فدیہ لے لیا، اس طرح اوس دن ملت حنیفیہ کے پیشواؤں کی یاد تازہ ہوتی ہے، اور خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی اور صبر کا اون سے سبق لیا جاتا ہے ان دونوں میں نعرۂ تکبیر خاص طور پر بلند کرنے کا حکم دیا گیا، کیوں کہ اس میں حاجیوں کی مشابہت، ان کی عزت، اور وہ جس حال میں ہیں اوس کی طرف شوق کا بھی اظہار ہوتا ہے، اس لیے تکبیر کہنا سنت ہے، اور خدا نے اس آیت میں اس کا حکم دیا ہے، ولتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم یعنی خدا نے تم کو روزے کی جو توفیق عطا فرمائی ہے، یہ اس کا شکریہ

اس لیے قربانی کرنا اور ایام منیٰ میں باآواز بلند تکبیر کہنا مسنون فرمایا، اور جو شخص قربانی کرنا چاہتا ہو، اس کے لیے یہ مستحب ٹھہرایا کہ بال نہ منڈوائے اور نماز اور خطبہ کو مسنون کیا تاکہ مسلمانوں کا کوئی اجتماع خدا کے ذکر اور شعائر دین کی سربلندی سے خالی نہ ہو،

اس کے ساتھ شارع نے شریعت کے مقاصد میں سے چند چیزیں اس میں ملا دیں وہ یہ کہ ہر ملت کے لیے ایک جلسے نمود کی ضرورت ہوتی ہے، جہاں جمع ہو کر وہ اپنی شوکت اور اپنی تعداد کی کثرت کی نمایش کر سکیں اس لیے تمام لوگوں کو عیدگاہ میں جانے کو مستحب کیا گیا، یہاں تک کہ بچوں، بوڑھی عورتوں، جوان اور کم سن لڑکیوں کے نکلنے کی بھی اجازت دی گئی، اور اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ جانے اور آنے میں راستے بدلتے تھے، تاکہ مختلف راستوں کے لوگوں کی نظر سے مسلمانوں کی شوکت کا نظارہ گذرے، اور چونکہ عید کی اصل زیب و زینت تھی، اس لیے خوش پوشی اور گانے بجانے کے تفریحی سامانوں کی اجازت دی گئی[۱]

عیدین کے موقعوں پر تفریحی مشاغل اور ان سے چشم پوشی

اسلام کی عملی زندگی میں لہو و لعب اور تفریحی مشغلوں کی گنجایش نہیں، مگر جیسا کہ اقتباس بالا میں اشارۃً گذرا، عید کے موقع پر استثنائی طور پر ان مشاغل کی طرف سے چشم پوشی کی گئی ہے، حبشی عورتوں کا اپنی عید کے دن گانا بجانا، حضرت عائشہ صدیقہؓ کا تماشا دیکھنا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تماشا دکھانا، حدیث کا مشہور واقعہ ہے، امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس حدیث کو کتاب العیدین میں ایک خاص باب باندھ کر درج کیا ہے،

اسلام میں عید منانے کا طریقہ

پھر امام بخاری نے "اہل اسلام کے لیے عید منانے کا طریقہ" کے عنوان سے ایک باب باندھا ہے، اور اس میں حسب ذیل روایتیں درج کی ہیں،

حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے ہوئے سنا، آپ نے فرمایا کہ آج کے دن ہم سب سے پہلے جو کام شروع کریں گے، وہ یہ کہ ہم نماز پڑھیں گے، پھر ہم واپس جا کر قربانی کریں گے، جس نے ایسا کیا اس نے ہمارے طریقہ کو پورا کیا،

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ ابوبکرؓ آئے اور ہمارے پاس انصار کی دو باندیاں وہ اشعار

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۲۳

گارہی تھیں، جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے، اور یہ دونوں باندیاں مغنیہ نہیں تھیں، دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا "یہ شیطانی مزامیر رسول اللہ کے گھر میں" اور وہ دن عید کا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت ابوبکرؓ سے جواب میں) فرمایا "اے ابوبکر! ہر قوم کے لیے عید کا دن ہوتا ہے، یا یہ فرمایا کہ

"یہ ہماری عید کا دن ہے"[۱]

حافظ ابن حجر نے ان حدیثوں پر غنا اور لہو ولعب کے رد میں لمبی بحث کی ہے، تاہم انھوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ ان حدیثوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ "عیدوں میں خوشی کا ظاہر کرنا دین کے شعائر میں سے ہے"[۲]

عید منانے کی اصلی غایت

حجۃ اللہ البالغہ، صحیح بخاری اور فتح الباری کے ان اقتباسوں سے یہ اندازہ ہوگا، کہ مسلمانوں کے ان دونوں تہواروں میں دو چیزیں شامل ہیں۔

(۱) دین اور شعائر دین کو سربلند کرنا۔

(۲) اجتماعی حیثیت سے جشن مسرت منانا، چنانچہ مسلمان اپنی ترقی کے زمانہ میں جب ان کی سلطنت کو عروج تھا، پورے جوش و خروش سے عید مناتے تھے، اور ان میں اسلام کے تہواروں کے حقیقی نشا کے پہلو نمایاں رہتے تھے، اگرچہ دولت و ثروت کی بہتات سے لہو ولعب اور تفریحی مشاغل حد افراط تک پہنچ گئے تھے، مگر پھر بھی اسلامی تہواروں کے دوسرے حقیقی نشا نظر انداز نہ ہوتے تھے، مسلمان مورخین اور سیاحوں نے مختلف ملکوں کے حالات میں وہاں عید منانے کے طریقوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، خصوصاً مکہ معظمہ، دمشق، مصر، اور خراسان وغیرہ میں عید کے جشن بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے، عید سے ایک دن پہلے ہزاروں جوڑے کپڑے خلعت کے طور پر تقسیم کیے جاتے، عید کے دن سلاطین بڑے تزک و احتشام سے شاہی محل سے نکلتے اور جلوس کی شکل میں عیدگاہ جاتے، واپس آکر دربار منعقد کرتے، امراء سے نذر قبول کرتے، اور غریبوں میں ہزاروں لاکھوں روپے تقسیم کرتے، عید کی دعوت بڑی دھوم دھام سے ہوتی، اور فقراء میں کھانے تقسیم کیے جاتے، ہزاروں بکریاں اور مینڈھوں کی قربانی کی جاتی، اور گوشت عوتوں میں تقسیم ہوتا، اور غریبوں میں بانٹا جاتا، تھوڑے تھوڑے فرقوں کے ساتھ مختلف ملکوں میں یہی طریقے رائج تھے،

---

[۱] بخاری کتاب العیدین باب سنۃ العیدین لاہل الاسلام [۲] فتح الباری ج ۲ ص ۳۶۶ تا ۳۷۱

ہندوستان میں عید کے تہوار مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری میں سلطان محمد بن تغلق کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا، اس نے یہاں کے عید کے جشن کے چشم دید حالات اپنے سفرنامہ میں لکھے ہیں، جن سے ہندوستان کے عہد اسلامی میں مسلمان سلاطین کا عید کی خوشی منانے کے طریقوں کا حال معلوم ہوتا ہے، ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپ ہوگا۔

خلعت کی تقسیم چنانچہ دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی سلطان عید کے خلعت سے خاص و عام کو سرفراز کرتا تھا، اور خلعت عید کی صبح طلوع ہونے سے پہلے لوگوں کے پاس بھیج دیا جاتا تھا تاکہ وہ شاہی خلعت میں ملبوس ہو کر عید کے مراسم میں شریک ہوسکیں، ابن بطوطہ لکھتا ہے:۔

"سلطان نے عید کی رات کو امیروں، خواصوں، سلطنت کے معززوں، حاشیہ نشینوں، عہدہ داروں، نقیبوں، افسروں، غلاموں اور پرچہ نویسوں کے پاس دستور کے مطابق عمومیت کے ساتھ خلعت بھیجے۔"

عید کا شاہی جلوس اس کے بعد اس نے عید کی صبح سے شب تک کا دلچسپ نظارہ قلم بند کیا ہے، وہ لکھتا ہے

جب عید کی صبح آئی تو سب ہاتھی ریشمی جھولوں اور سونے اور جواہرات سے سنوارے گئے ان میں سے ۱۶ ہاتھی خاص شاہی سواری کے لیے تھے ان پر کوئی سوار نہیں ہوسکتا تھا بلکہ ہر ہاتھی کے اوپر جواہرات سے مرصع ریشم کا چتر تھا، اور ہر چتر سونے کے ڈنڈوں میں لگے ہوئے تھے اور ہر ہاتھی پر جواہرات ٹکے ہوئے ریشمی گدے بچھے ہوئے تھے، ان میں سے ایک ہاتھی پر بادشاہ سوار ہوتا ہے بادشاہ کی سواری کے آگے غلاموں کی پاپیادہ صف ہوتی ہے جو سروں پر مطلا کلاہ شاشیہ پہنے رہتے ہیں اور ان کی کمر میں طلائی مطلا پٹی بندھی رہتی ہے، غلاموں کی صف کے بعد تقریباً تین سو کی تعداد میں نقیب ہوتے ہیں، جو پوستین کی مطلا کلاہ اوڑھے پہنے ہیں، اور ان کی کمر میں مطلا پٹی ہوتی ہے اور ان کے ہاتھوں میں سونے کے دستہ کی چابک ہوتی ہے، پھر قاضی القضاۃ، صدر جہان، کمال الدین غزنوی، قاضی القضاۃ صدر جہان ناصر الدین خوارزمی اور دوسرے تمام

عراقی، شامی، مصری، اور مغربی قضاۃ ایک ایک ہاتھی پر سوار رہتے ہیں، پھر موذنوں کی صف ہاتھیوں پر ہوتی ہے، جو بلند آواز سے تکبیر کہتے جاتے ہیں۔

سلطان جلوس کی اسی ترتیب کے ساتھ شاہی محل سے نکلتا ہے، محل کے سامنے فوجیں اس کی منتظر رہتی ہیں، ہر امیر اپنا اپنا لشکر اپنی اپنی نوبت اور علم کے ساتھ لیے علیحدہ کھڑا رہتا ہے، سلطان جب باہر آتا ہے تو اس کے آگے آگے وہی لوگ چلتے ہیں، جن کا ہم اوپر تذکرہ کر آئے ہیں اور سلطان کے پیچھے اس کے خدام، علم بردار، نوبت بردار، نقارچی باجے والے اور اس کے خادموں کی جماعت ہوتی ہے۔

جلوس میں ان سب کے بعد سلطان کے بھائی مبارک خان کی سواری، اس کے خدم و حشم اور لاؤ لشکر کے ساتھ ہوتی ہے، پھر اسی ترتیب سے سلطان کا بھتیجا بہرام خان اور اس کے خدم و حشم، پھر چچا زاد بھائی ملک فیروز مع خدم و حشم شاہی خاندان کے بعد وزراء و امراء کا نمبر آتا ہے، وہ (یہاں پر ترتیب بہت سے امراء کے نام ہیں) اپنی اپنی حیثیت و مرتبہ کے لحاظ سے یکے بعد دیگرے جلوس میں شریک رہتے ہیں، ان میں سے جن لوگوں کو نوبت و نقارہ رکھنے کا اعزاز حاصل ہے، وہ نوبت و نقارہ کے ساتھ اور جو اس مرتبہ تک نہیں پہنچے ہیں، وہ نوبت و نقارہ کے بغیر چلتے ہیں، نیز ان میں ہر شخص زرہ پوش ہوتا ہے

شہنشاہ ہندستان عیدگاہ میں

جب یہ شاہی جلوس عیدگاہ کے دروازے پر پہونچتا ہے تو سلطان عیدگاہ کے دروازہ پر خود ہاتھی سے اترتا ہے، اور امام نماز پڑھا کر خطبہ دیتا ہے جس میں سلطان شریک رہتا ہے،

شہنشاہ کا قربانی کرنا

اور اگر عید بقرعید ہوتی ہے، تو نماز کے بعد سلطان قربان گاہ میں آتا ہے اور ایک نیزے سے اونٹ کو نحر (قربانی) کرتا ہے، اس وقت وہ ایک ریشمی چادر اوڑھ لیتا ہے، تاکہ خون کی چھینٹوں سے کپڑے خراب نہ ہونے پائیں، پھر سلطان قربانی کے بعد شاہی محل میں واپس چلا جاتا ہے

عید کا دربار

عید کے دن محل بڑی خوبیوں سے سجایا جاتا ہے، پورے محل میں فرش بچھایا جاتا ہے، صحن میں بہت بڑا شامیانہ جسے بارگاہ (بارگاہ) کہتے ہیں،

بہت سے سونے کھمبوں پر کھڑا کیا جاتا ہے، اور اس کی چاروں طرف اس سے لگے ہوئے خیمے کھڑے کئے جاتے ہیں، اس شامیانہ کے اندر جگہ جگہ پر مصنوعی درخت لگائے جاتے ہیں جن میں کھلے ہوئے پھول اور کلیاں بنائی جاتی ہیں، ان درختوں کی تین قطاریں ہوتی ہیں، اور ان کے بیچ میں سونے کا بڑا تخت بچھایا جاتا ہے، اس پر ریشمی گدے بچھائے جاتے ہیں جس میں جواہرات ٹکے ہوتے ہیں، یہ تخت خالص سونے کا ہے، اس کا طول ۲۴ بالشت اور عرض ۱۰ بالشت ہے، یہ تخت الگ الگ ٹکڑوں کا بنا ہوا ہے، جو بچھاتے وقت جوڑ دیے جاتے ہیں، ان میں سے ہر ایک ٹکڑا اس قدر وزنی ہے، کہ اس کو کئی آدمی مل کر اٹھاتے ہیں، اس تخت کے اوپر کرسی بچھائی جاتی ہے، اس پر سلطان جلوہ فرما ہوتا ہے

تخت کے پاس سونے کی ایک بڑی انگیٹھی رکھی جاتی ہے، یہ بھی تین ٹکڑوں کی بنی ہوئی ہے، جو ایک دوسرے سے ملائے جاتے ہیں، اس انگیٹھی میں تین خانے ہیں، اس میں عود و عنبر اور الایچی جلا کر دربار میں خوشبو کرتے ہیں،

بارگہ کے تین دروازے ہوتے ہیں، اول دروازے پر عماد الملک سرتیز کھڑا ہوتا ہے، دوسرے دروازے پر ملک کبیر اور تیسرے پر یوسف بغرا۔ ان کے دائیں بائیں دوسرے امرا کھڑے ہوتے ہیں، بارگہ کا کوتوال طغی ہے، اس کے ہاتھ میں سونے کی چھڑی ہوتی ہے، اور اس کے نائب کے ہاتھ میں چاندی کی، یہ دونوں درباریوں کو ان کی اپنی اپنی جگہ پر بٹھاتے ہیں، اور صفوں کو درست کرتے ہیں، وزیر اور کاتب اس کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں، حاجب اور نقیب اپنی اپنی جگہ پر ہوتے ہیں، اور غلاموں کے ہاتھوں میں چاندی سونے کے گلاب پاش ہوتے ہیں، وہ حاضرین پر گلاب چھڑکتے رہتے ہیں،

جس وقت سلطان تخت پر قدم رکھتا ہے، حاجب و نقیب بلند آواز سے بسم اللہ کہتے ہیں، پھر لوگ سلام کرنے (مجرا بجالانے) کے لیے یکے بعد دیگرے حاضر ہوتے ہیں، سب سے پہلے قاضی القضاۃ آتا ہے، اس کے بعد خطباء، علماء، شرفاء، مشائخ، شاہی خاندان کے ارکان معززین، وزراء، قائدین، لشکر وغیرہ (یہاں پر عہدوں کے نام بترتیب ہیں) آتے ہیں اور اسی ترتیب سے مجرا بجالاتے ہیں،

دربار میں جشن عید کی نذریں

دربار میں شاہی آداب کے مطابق نذریں پیش کی جاتی ہیں، چنانچہ بڑے بڑے جاگیردار ریشمی رومالوں میں اشرفیاں باندھ لاتے ہیں، اور ان میں ان کے نام کا پرچہ بھی لکھا ہوا رہتا ہے، وہ ان رومالوں کو سونے کے ایک طشت میں جو اسی غرض سے سلطان کے سامنے رکھا رہتا ہے، رکھ دیتے ہیں، اس طریقہ سے بہت بڑی رقم جمع ہو جاتی ہے اور سلطان جسے بخشش کرنا چاہتا ہے، دیتا ہے:۔

یعنی یہ رقمیں شاہی خزانہ میں داخل نہیں کی جاتی تھیں، بلکہ سلطان ان رقموں کو مختلف لوگوں میں داد و دہش کے طور پر تقسیم کر دیتا تھا، اور جشن عید کی خوشی میں امیروں کی جیب سے غریبوں کی احتیاجیں سلطان کے توسط سے پوری ہوتی تھیں۔

دعوت طعام اور محفل رقص و سرود

دربار کے شاہی مراسم کے ادا ہونے کے بعد کھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا، اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد گانے والوں کے طائفے آتے تھے، اور دیر تک رقص و سرود کی محفل جمی رہتی تھی، اس کے بعد دربار برخاست ہو جاتا تھا، چنانچہ ابن بطوطہ لکھتا ہے:۔

"سلام ہو چکتا ہے، تو کھانا آتا ہے، اور حسب مراتب لوگوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔۔۔۔ پھر گانے والوں کے طائفے آتے ہیں، اور اپنے رقص و سرود کا کمال دکھاتے ہیں۔۔۔۔ دربار عصر کے وقت شروع ہوتا ہے، پھر دوسرے دن عصر کے بعد اسی ترتیب سے دربار لگتا ہے، اور رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی ہیں، تیسرے دن شاہی خاندان کے لڑکوں کے نکاح ہوتے ہیں، اور ان کو بڑی جاگیریں عطا کی جاتی ہیں، چوتھے دن غلام آزاد کیے جاتے ہیں، پانچویں دن باندیوں کے آزاد کرنے کی باری آتی ہے، چھٹے دن غلاموں و باندیوں کے نکاح ہوتے ہیں، اور ساتویں دن خیرات تقسیم کی جاتی ہے، جو بڑی مقدار و تعداد میں تقسیم ہوتی ہے۔[۱]"

اس عہد کے اسلامی ہند میں عید ین کے ان مراسم میں اگرچہ شاہانہ شان و شوکت کی غیر معمولی نمائش اور مصرفانہ تکلفات کی جھلک نظر آتی ہے، تاہم اسلام کے تہواروں کے منانے میں شارع علیہ السلام نے جو حقیقی مصالح پنہاں رکھے تھے اور جن کا اجمالی نقشہ اوپر پیش کیا گیا، ان کے کچھ نہ کچھ دھندلے نقوش ان شاہانہ مراسم میں بھی موجود تھے جو اب ہماری معاشرتی زندگی میں گویا خواب و خیال بن گئے ہیں۔

(فروری ۱۹۳۸ء)

---

[۱] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۴۴ تا ۴۷

پٹھان اور مغل کی اصلیت

(مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی (مدیر صدق لکھنؤ) اپنے ایک گرامی نامہ میں فرماتے ہیں "صدق میں ایک سوال آیا ہوا ہے)

"مجھے عرصہ سے مغل اور پٹھان کی تحقیق کی ضرورت ہے، بعضوں کا خیال ہے، کہ جن مسلمانوں نے ہندستان کو فتح کیا۔ ان کو فتح خان یا فتحان کہتے تھے۔ یہی رفتہ رفتہ پٹھان ہو گیا، بہرحال سوال یہ ہے کہ ان دونوں قوموں کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اور ان کا سلسلۂ نسب کیا ہے؟ جواب اس کا خواہ معارف ہی میں نکلے، خواہ صدق کے لیے الگ آجائے، بہرحال مجھے اطلاع جلد مل جائے تو بہتر ہے،"

نیز جناب محمد اعظم صاحب (جہلم) کا ایک استفسار آیا تھا کہ

"کیا ترک، کیانی، مغل، تاتاری، چغتائی قومیں ایک ہی اصل سے ہیں یا علیحدہ علیحدہ ہیں"

ان استفساروں کے جواب میں جو کچھ عرض کیا گیا، وہ درج ذیل ہے

لفظ پٹھان کی وجہ تسمیہ

لفظ پٹھان کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف اقوال منقول ہیں جن میں سے بعض کا بے حقیقت ہونا ظاہر ہے، جیسے فرشتہ کا بیان کہ چوں کہ افغان پٹنہ میں آکر آباد ہوئے تھے، اس لیے وہ پٹھان کہے گئے۔ حالاں کہ پٹھانوں کے متعلق معلوم ہے، کہ وہ پہلے شمالی مغربی ہند کے میدان پنجاب سندھ میں آکر آباد ہوئے تھے، شمالی مشرقی میدان میں وہ اس کے بہت دنوں کے بعد آئے تھے، اسی طرح مرسلہ سوال نامہ میں پٹھان کی وجہ تسمیہ فتح خان یا فتحان جو بیان کی گئی ہے اس کو بھی اسی قسم کی ایک بے اصل روایت سمجھنا چاہیے،

پٹھانوں کو افغان بھی کہا جاتا ہے، اور اس سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ پٹھان در اصل وہی ہیں، جو افغانستان سے آئے ہیں، اس سے یہ مطلب ہے کہ پٹھان و افغان دونوں ہم معنی لفظ قرار پاتے ہیں، اور اسی لیے ہندستان میں پٹھانوں کی حکومت کو افغانی حکومت سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن بعض لوگوں نے ان دونوں کے مفہوم میں اطلاق میں فرق کیا ہے، اور افغان سے [illegible] مراد لیا ہے، اور پٹھان سے ان تمام قبائل کو موسوم کیا ہے، جو پشتو زبان بولتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے، کہ اس قوم [illegible] موسوم کیا

پھر رفتہ رفتہ درانیوں اور بعض دوسرے پٹھان قبائل نے اپنے کو افغان کے نام سے موسوم کرلیا، اور باقی ماندہ دوسرے قبائل غلزئی، آفریدی، بنگش، شیرانی، اور بیترانی وغیرہ مثل سابق کے پٹھان کہے جاتے رہے، کیوں کہ محققین کے نزدیک اس قسم کی کوئی تقسیم کسی تاریخی یا ذاتی بنیاد پر کبھی نہیں کی گئی، بلکہ اصلیت کے اعتبار سے ان دونوں کا قدیم قومی نام "پشتان" (Pushtan) یا پکھتان (Pakhtan) تھا جو مقام پشتانار (Pushtanar) یا پکھتانار (Pakhtanar) کی طرف منسوب تھا، اور یہی قدیم لفظ آگے چل کر تلفظ میں "پٹھان" بن گیا،

اس لیے ان دونوں قسم کے قبائل درانیوں اور غلزیوں وغیرہ میں افغان اور پٹھان کے جانے میں جو کچھ فرق ہو، وہ آگے چل کر اعتباری طور پر اختیار کیا گیا، ورنہ نسل، وطن یا کسی تاریخی ذاتیت کی بنیاد پر ابتداءً ان میں باہم کوئی امتیاز نہیں تھا،

البتہ جب آگے چل کر ان میں سے بعض کے وطن میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی، اور ان میں کے بعض قبائل مغرب سے مشرق کی سمت قندھار وغیرہ کے علاقہ میں آکر آباد ہو گئے، تو ان کی اور دوسری قوموں کی آبادی مخلوط ہوئی، اس وقت انھیں ان دوسری قوموں سے ممتاز رکھنے کے لیے خاص طور پر ان کے قدیم نام پٹھان سے موسوم کیا گیا، کیوں کہ یہ لوگ یہاں (گندھار) قندھار میں ہندوستانی آبادی سے آکر ملے تھے، اور ان ہی ہندوستانیوں سے انھوں نے پشتو زبان سیکھی تھی، کیوں کہ یہ زبان بھی پراکرت ہی کی ایک شاخ ہے، اور شاید ان ہی کی نسبت سے پشتو سے موسوم ہوئی ہے۔

اس طرح یہ سمجھا جا سکتا ہے، کہ وہ افغانستانی جو مغرب سے مشرق کی سمت میں آگئے وہ لوگ اگرچہ مغربی افغانستانیوں سے نسل میں تو متحد رہے، مگر وطن میں ان سے اختلاف پیدا ہو گیا، اور اب پٹھان کا نام جو ان دونوں گروہوں کا قدیم قومی نام تھا، خاص طور پر ہندوستان اور اس کی سرحد میں اس نو آباد گروہ کے لیے مخصوص ہو گیا، ورنہ قدیم قومیت کے اعتبار سے ہر افغانستانی خواہ وہ مغربی افغانستان کا ہو یا مشرقی کا یا ہندوستان کے شمالی میدان کے مغربی حصہ میں آباد ہوا ہو یا خروج میں، وہ پٹھان ہے، اور اس لحاظ سے ان میں کا ہر گروہ اس نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے،

اس مجموعہ میں ایک مقالہ "پٹھانوں کی تاریخ" کے عنوان سے بھی ہے، اس سے اس سلسلہ

گفتگو میں مزید معلومات مل سکتے ہیں، خصوصًا ایسی فارسی اور اردو کی کتابوں کا پتہ چلے گا جن میں پٹھانوں کی قومیت، نسل، وطن، اور سیاسی کارناموں کا خاص طور پر ذکر آیا ہے، مناسب یہ ہے کہ مزید معلومات کے لیے اسی کی طرف رجوع کیا جائے۔

مغل کی وجہ تسمیہ

باقی رہے مغل تو ان کا پٹھانوں سے کوئی تعلق نہیں، امیر تیمور کا شاہی خاندان جس نے ہندوستان میں حکومت کی، نسلاً ترک تھا وہ لوگ مغل اس لیے کہے گئے، کہ امیر تیمور کا یہ قدیم ترکی قبیلہ دراصل منگول سے وابستہ تھا اس لیے مغل کے قدیم نسل و وطن کی ساری داستان وہی ہے جو منگول کے نام سے تاریخوں میں ملتی ہے، منگول یا مونگل "کے لغوی معنی "جوان مرد" یا "دروہلی" قوم کے بیان کیے گئے ہیں یہ قوم دراصل تنگوسی قبیلہ پر مشتمل تھی تنگوسی ایک قدیم ترکی قبیلہ سائبیریا کا ان کے ممتاز قبائل میں سے تھا۔

اس لفظ مونگل یا منگول سے لفظ مغل بنا ہے، نون غنہ اور گاف کا عربی میں غین سے کام لیا جاتا ہے، دور حاضر میں عمومًا ہندوستان کے مورخین نے "منگول" اور "مغل" میں ایک اصطلاحی فرق قرار دے لیا تھا، منگول کا اطلاق صرف ان صحرا نورد غیر مسلم خانہ بدوش لوگوں پر کیا جانے لگا جن کا سردار چنگیز خاں تھا، اور مغل کا لفظ صرف ان مسلمان ترکوں کے لیے وقف کر دیا ہے، جنھیں سلاطین تیموریہ کہا جاتا ہے، اس لیے ہندوستان میں مغل وہی ہیں جو یہاں کے حکمران مغلیہ خاندان سے سلسلۂ تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سرحدی پٹھانوں کو جو اسی ۱۸۴۸ء تک ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں کاروبار کرتے تھے، عوام مغل کہتے تھے، اس کو امر واقعہ اور تاریخی حقیقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا، یہ محض ان کا ایک عرفی نام ہے، جس سے ان کی شہرت ہو گئی ہے،

مغل ترک و تاتار کی اصلیت

(الف) قدیم تاریخ کے بیان کے مطابق بحر خزر، کوہ اورال، التائی، خطائی، اور ہمالیہ کے درمیان جو وسیع خطہ ارض ہے، اس کے ایک حصہ کو آج کل ترکستان کہا جاتا ہے، [illegible] ممالک داخل ہیں، جہاں تاتاری قوم آباد تھی، ترک، تاتاری اور [illegible]

سے اٹھے، اور مختلف زمانوں میں دنیا کے مختلف گوشوں میں پہونچے، اور مختلف ناموں سے یاد کیے گئے، مغربی مورخین اس نتیجہ تک پہونچے ہیں، کہ یہ سب قومیں واحد الاصل ہیں، اور انھیں ابتداءً ترک کہا جاتا تھا[۵۱]

ہیرلڈلیمب لکھتا ہے:-

"" مونگل "ابتداء میں" مونگ کو" یا "منگ" کو" تھا ... ...منگو خانہ بدوش تھے، گلوں پر بسر اوقات، چراگاہوں کی تلاش میں ادہر گرد ... ... دشت گوبی اور شمال کی ہموار زمین ان کا مسکن یا جولان گاہ تھیں اور یہ وہی قوم تھی جسے یونان کے مورخ ہیرو ڈوٹس نے "سیتھین" [۵۳] لکھا ہے، جو ہون اور آلام قوموں کے ہمزاد تھے چین کے باشندے منگولوں کو "ہی انگ نو" کہتے تھے، چینیوں نے اپنے ملک سے باہر رکھنے کے لیے چین کی سرحد پر ایک بڑی دیوار بنائی تھی ... ہی انگ نو کے معنی خانہ بدوش قوموں کے ہیں سنہ ۱۱۶۲ء میں چنگیز خاں کے زمانہ میں اس مجموعہ اقوام یعنی ہی انگ نو میں بیسیوں قومیں شامل تھیں ... چنگیز خاں نے جو مونگل کا سردار تھا باقی قوموں پر غلبہ حاصل کیا اور ان قوموں سے سلطنت مونگل یا مغل کا قلب و صدر پیدا کر دیا چنگیز خاں مغلوں کی سلطنت کا بانی تھا تمام مغل اس کے سب سے پہلے متبعین میں تھے۔[۵۲]

کیانیوں کا قدیم وطن

باقی رہے کیانی تو یہ ان سے مختلف الاصل ہیں، ان کا تعلق ایران سے ہی، یہ ابتداً دریائے سیحون و جیحون کے سواحل پر آباد تھے، اقوام ترک نے انھیں یہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا، ایران میں آبسے اور اسی سرزمین پر حکمرانی کرنے لگے،[۵۴]

(جون سنہ ۹۴۳ء جنوری سنہ ۱۹۴۷ء)

---

۵۱ تاریخ دولت عثمانیہ دلاؤن کیمبرج ج ۱ ص ۲ ، ۵۲ تاریخ منطقی جدید ایران ص ۱۲ ، ۱۹ ۵۳ سیتھین کا تعلق عہد قدیم سے بھی پیدا ہوا- اور ہندستان کی سرزمین ا پر ان نسلوں کی معرکہ آرائی کا جولان گاہ بنی، اس لیے ہندوستان سے مغلوں کا تعلق اس کے عہد قدیم ہی سے وابستہ ہوتا ہے، ۵۴ تیمور ص ۲۰۹، ۲۱۰،

پٹھانوں کی تاریخ کے ماخذ

یہ مقالہ جناب ایس کے مالیار (انور پورہ اٹک) کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا گیا، انھوں نے دریافت کیا تھا کہ:—

مجھے پٹھانوں کی تاریخ سے خاص انس ہے، اور چاہتا ہوں کہ اس کی تلاش کروں، مگر ادھوری واقفیت میری جستجو کی رہنمائی نہیں کر سکتی، براہ کرم مطلع فرمائیں کہ پٹھان اور افغان کی مکمل اور واضح تاریخ موجود ہے اگر ہے تو کون سی ہے،

پٹھان قوم کا مفہوم

ہندوستان میں پٹھان قوم کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے، بعض یورپین مورخین مثلاً جنرل برگز (BRIGGS) وغیرہ کی غلطیوں سے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے وہ مسلمان سلاطین جو مغلوں سے پہلے گذرے ہیں، عام طور پر پٹھان سمجھے گئے، جو صریح غلطی ہے، ان سلاطین کے بیشتر خانوادے ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے، صحیح معنوں میں جس پٹھان خاندان نے ہندوستان پر حکومت کی، وہ سوریہ یعنی شیر شاہی خاندان ہے، البتہ سوریوں سے پہلے لودھیوں کا زمانہ گذرا ہے، جن کو سلاطین افغانستان شمار کیا جاتا ہے، بلکہ کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی سے پہلے خود افغانستان میں کسی افغانی نسل حکمران کا وجود نہیں ہے،

اس لیے جہاں تک پٹھانوں کی تاریخ مملکت کا تعلق ہے، وہ ان ہی خانوادوں کی سیاسی تاریخ پر مشتمل ہے، جنھوں نے تھوڑے زمانہ تک ہندوستان اور افغانستان میں حکمرانی کی ہے، ان میں سے ہندوستان کے سوریہ خاندان کی تاریخ درحقیقت شیر شاہ کی تاریخ ہے، اور اسی سلسلہ میں افغانوں اور پٹھانوں کا ذکر آتا ہے، شیر شاہ کے حالات کے ماخذ کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں، یعنی

افغانی مورخین کی کتابیں

ایک تو وہ مورخین ہیں جو نسلاً افغان یا پٹھان تھے

دوسرے وہ مورخین ہیں جو اس نسل سے تعلق نہ رکھتے تھے، ان میں سے اول الذکر مورخین کی نسلی وقبائلی ہمدردی قدرتاً شیرشاہ اور اس خاندان کے ساتھ تھی، اور موخر الذکر مورخین میں کچھ لوگ ایسے تھے، جو سوریوں کے حریف مغلوں کی سلطنت سے وابستہ تھے، اور ان کے پیش نظر انہی کی تاریخ مرتب کرنا تھا، اس لیے ان کا لب ولہجہ سوریوں اور شیرشاہ کے متعلق بہرحال خوش گوار نہیں ہے،

ان میں سے اول الذکر کتابوں میں تحفۂ اکبرشاہی معروف بہ تاریخ شیرشاہی (عباس سروانی)، مخزن افاغنہ (نعمت اللہ) اور تاریخ داؤدی (عبداللہ) معیاری افغانی تاریخیں ہیں۔

۱۔ تاریخ شیرشاہی

اگرچہ اکبر کے زمانہ میں اسی کے حکم سے لکھی گئی، لیکن اس کا مصنف عباسی سروانی افغان تھا، اس کی شادی شیرشاہ کے خاندان میں ہوئی تھی، شیرشاہ کے عہد حکومت کے چالیس سال کے بعد اس نے اس کتاب کو لکھا، ایسے لوگ موجود تھے، جو شیرشاہ کے ساتھ وقائع میں شریک تھے، نیز بہت سی خاندانی روایتیں گھروں میں موجود تھیں، عباس سروانی نے ان ہی مآخذ سے یہ تاریخ مرتب کی، اگرچہ خاندانی روایتوں میں طب ویابس کی آمیزش ہو چکی تھی، بایں ہمہ شیرشاہ کے متعلق مستند معلومات کا یہ بہترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے، الیٹ نے کتاب کے مباحث کی تلخیص اپنی تاریخ میں درج کی ہے[۱]،

۲۔ مخزن افاغنہ

نعمت اللہ کی معروف تصنیف ہے، یہ عہد جہانگیری میں تصنیف ہوئی یہ تاریخ خان جہانی مخزن افغانی" کے نام سے بھی مشہور ہے، اس لیے کہ یہ خان جہاں لودی کی ہدایت سے لکھی گئی، اور اس کا آخری باب خان جہاں ہی کے حالات پر مشتمل ہے، الیٹ نے اس کا بھی مفصل تذکرہ کیا ہے[۲]، ڈورن نے بھی اس کتاب کا انگریزی ترجمہ "تاریخ افغان" کے نام سے ۱۸۲۹ء میں شائع کیا ہے، ڈورن کے ترجمہ اور برٹش میوزیم کے اصل نسخہ میں جو فرق ہے، اس کا تذکرہ ریو نے نسخہ کے حال میں لکھا ہے[۳]، بہرحال گویا یہ افغانوں کی تاریخ پر ایک مستقل تصنیف ہے، جس میں ان کے نسب، خاندان، اور افغان حکمران خاندانوں

---

[۱] تاریخ ہند الیٹ ج ۴ ص ۳۰۱ تا ۴۳۳، [۲] ج ۵ ص ۶۷ تا ۱۱۵ [۳] فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ج ۱ ص ۲۱۰

کے سیاسی احوال بیان کیے گئے ہیں ،

۳۔ تاریخ داؤدی کا مصنف عبداللہ کے نام سے موسوم ہو ، یہ بھی جہانگیر کے زمانہ میں لکھی گئی ، اس میں سلطان بہلول لودھی ، سکندر ابراہیم ، شیر شاہ ، اسلام شاہ محمد عادل ، اور داؤد شاہ کے زمانہ حکومت کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں ، الیٹ نے اس کے کچھ مضامین اپنی تاریخ میں ترجمہ کرکے نقل کیے ہیں[۵۱] ، اور ریو نے بھی فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم میں تذکرہ کیا ہے[۵۲] ،

۴۔ افسانہ شاہان اس کا مصنف ایک افغان محمد کبیر بن شیخ اسماعیل خربا (نواسہ شیخ خلیل اللہ حقانی) ہو مصنف کا بیان ہو ، کہ اس کے جد بزرگوار اکبر کے زمانہ میں ایک افغانی روحانی پیشوا تھے ، جو راجگیر (بہار) میں متوطن تھے ، اور جنھوں نے پنجاب میں وفات پائی ، مصنف کا بیان ہے ، کہ اس نے یہ کتاب اپنے نوجوان لڑکے محمود کی موت کا غم غلط کرنے کے لیے لکھنی شروع کی ، جس نے اس کو ۱۶ برس کی عمر میں مارگزیدگی سے اپنا ناک داغ مفارقت دیا تھا ، ریو کا بیان ہو ، کہ مصنف نے اس کتاب کو تاریخ کے طرز پر لکھنے کے بجائے دل چسپ انداز اور شگفتہ عبارت میں انشا و حکایات کے رنگ میں لکھا ہو ، اس میں حسب ذیل شخصیتوں کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں ، کالا لودھی (پدر بہلول لودھی) بہلول ، سکندر ، ابراہیم ، شیر شاہ ، اسلام شاہ عادل ابراہیم ، سکندر سور ، کالا پہاڑ اور داؤد لودھی[۵۳]

غیر افغانی مورخین کی تصنیفات میں پٹھانوں کا ذکر

غیر افغانی مورخین کی کتابیں بھی دو قسموں کی ہیں ، ایک تو مغل سلاطین ، ہمایوں ، اکبر وغیرہ پر جو خاص طور پر لکھی گئی ہیں ، اور ان میں شیر شاہ اور دوسرے سلاطین سوریہ کے واقعات کا ذکر آیا ہو ، دوسرے ہندوستان کی عام تاریخیں ہیں جن میں دوسرے خاندانوں کے سلاطین کی طرح افغان سلاطین کا بھی ذکر آیا ہے ، اور ان کے لیے بھی ابواب قائم کیے گئے ہیں ، یہ تاریخیں عام طور پر معروف و مشہور ہیں ، مثلاً تزک بابری ، ہمایوں نامہ ، گلبدن بیگم ، اکبر نامہ

---

۵۱ الیٹ ، ۴ ، ص ۴۳۴ ۵۲ فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ج ۱ ص ۲۴۳ ۵۳ ایضاً

ابوالفضل، تاریخ رشیدی، مرزا محمد حیدر، تذکرۂ واقعات جوہر آفتابچی، طبقات اکبرشاہی نظام الدین احمد، منتخب التواریخ عبدالقادر بدایونی، آئین اکبری ابوالفضل، تاریخ فرشتہ خلاصۃ التواریخ سبحان رائے، منتخب اللباب خوافی خان، زبدۃ التواریخ نورالحق مشرقی، تاریخ نورسامہ، لب التواریخ رائے بندرابن، منتخب التواریخ جگ جیون داس، تحفۃ الھند لال رام، حقیقت ہائے ہندوستان لچھمی نراین شفیق وغیرہ،

یورپین مورخین کی تصنیفات افغان سلاطین پر

یورپین مورخین کی تصنیفات میں بھی بعض کتابیں خاص افغان سلاطین کے حالات میں ہیں، اور بعض ہندوستان کی عمومی تاریخیں ہیں، ان میں سے ایک پرتگالی مورخ کی تصنیف پٹھانوں کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، کہ وہ پرتگالی شیرشاہ اور محمود شاہ اور ہمایوں کی لڑائیوں کا چشم دید گواہ ہے، پروفیسر سرکار نے اس کا تعارف کرایا، اور کالی کرنجن قانون گو مصنف "شیرشاہ" کے آخذ میں ہے، اسی طرح رچرڈ ٹیمپل کی "شیرشاہ ایک نئے زاویہ سے" A new view of Sher shah sori جو ۱۹۲۲ء میں شایع ہوئی، اور دوسری ایچ، ڈبلو، بیلو کی "افغانستان کا جائزہ علم الاقوام کے رو سے" An enquiry into the Ethnography of Afghanistan. ہے جو ۱۸۹۱ء میں چھپی ہے قابل ذکر ہیں،

ان کے علاوہ الفنسٹن، ارسکین، تھامس، الیٹ وغیرہ کی تاریخ ہند ہیں، اسی طرح انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (سور) وغیرہ میں بھی ذکر آیا ہے،

شیرشاہ پر چند اور کتابیں

ہندوستان میں شیرشاہ پر دو قابل ذکر کتابیں انگریزی زبان میں نکلی ہیں، ایک تو مذکورۂ بالا کالی کرنجن قانون گو پروفیسر رام جس کالج دہلی کی "شیرشاہ" ہے، یہ شیرشاہ پر معیاری تصنیف سمجھی جاتی ہے، مصنف نے آخر میں اپنے آخذ کی فہرست بھی دی ہے، دوسری کتاب سر ذوالفقار علی خاں کی "شیرشاہ سوری" ہے، جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی ہے، یہ ایک مقالہ ہے جسے مصنف

نے سنہ ۱۹۱۵ء میں پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی میں پڑھا تھا،

اردو میں اس سلسلہ میں صرف دو کتابیں قابل ذکر ہو سکتی ہیں، ایک محمد عبد السلام خاں پنشنر سب جج کی "نسب افاغنہ" ہے، جس کو مصنف نے بڑی محنت اور تلاش و تحقیق سے لکھا ہے، مصنف کے نظریہ کے مطابق افغان نسلاً اسرائیلی ہیں، اس میں مصنف نے افغانوں کے ہندوستان میں آنے اور "پٹھان" سے موسوم ہونے کا بھی تذکرہ کیا ہے، یہ کتاب سنہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی ہے، دوسری جناب سید احمد مرتضیٰ کی "صولت شیر شاہی" ہے، جس میں شیر شاہ کے سادہ وقائع زندگی بیان کیے گئے ہیں، یہ سنہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی ہے،

مختلف زمانوں میں مختلف صوبوں میں مختلف پٹھان صوبہ دار بھی رہے ہیں، جنہوں نے کبھی اپنی خود مختار یا نیم مختار حکومتیں قائم کیں، اور ایک دو نسل تک ان کے خاندان میں رہیں، ان کے حالات صوبائی حکومتوں کی تاریخوں میں ملیں گے، جن کی تفصیلات میں جانا بڑا طول امل ہے، کسی خاص مقام یا خاص خاندان کے متعلق کچھ دریافت کیا جاتا تو جواباً کچھ عرض کیا جا سکتا تھا،

(جولائی سنہ ۱۹۴۴ء)

گیتا کا منظوم فارسی ترجمہ

جناب ہری پرشاد صاحب گروانی باغ پٹنہ دریافت فرماتے ہیں:۔

گیتا کا فیضی کا منظوم ترجمہ عام طور پر متداول ہے، پیش نظر نسخہ چھوٹی تقطیع پر لاہور کے کسی پریس سے شایع ہوا ہے، اس میں کتابت کی بعض غلطیاں ہیں، علامہ شبلی نے شعر العجم میں ... فیضی کا تذکرہ کیا ہے، اس کے تالیفات و تراجم کو بالتفصیل لکھا ہے، مگر علامہ موصوف نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ فیضی نے گیتا کا بھی ترجمہ کیا ہے، ازراہ کرم وقت نکال کر معارف میں اس پر روشنی ڈالیں، کہ فیضی نے گیتا کا ترجمہ کیا تھا، یا متداول ترجمہ فیضی کے نام سے دوگوں نے منسوب کر دیا ہے، عین عنایت ہوگی۔

اس کے جواب میں لکھا گیا:۔

افسوس ہے کہ گیتا کے منظوم فارسی ترجمہ کا ذکر میری نظر سے نہیں گذرا، مراۃ عالم، بدایونی، اکبر نامہ اور مآثر الکرام وغیرہ میں فیضی کا جو تذکرہ آیا ہے، وہ گیتا کے منظوم ترجمہ کے ذکر سے خالی ہے،

لیکن نہ صرف مولانا شبلی مرحوم، بلکہ متقدم مورخین نے بھی فیضی کی تصانیف کو نام بنام نہیں گنایا ہے، صاحب مراۃ عالم نے اجمالی حیثیت سے صرف یہ کہا ہے کہ

"گویند صد و یک کتاب و رسالہ تالیف نمود"[1]

پھر چند کتابوں کے نام لکھے ہیں، جو وہی ہیں جن کا ذکر دوسری تاریخوں میں آیا ہے،

لیکن میرا خیال ہے کہ گیتا کا جو منظوم ترجمہ فیضی سے منسوب لاہور سے شایع ہوا ہے، اور جس کا آخری اڈیشن آرٹ پیپر پر اہتمام سے چھاپا گیا ہے، فیضی کی طرف اس کا انتساب صحیح ہے۔

گیتا کے متعلق یہ معلوم ہے کہ در اصل یہ مہا بھارت ہی کا ایک حصہ ہے، جس کو مہا بھارت

---

[1] مراۃ عالم ص ۴۴۳ (قلمی)

سے "اس حیثیت سے الگ کر لیا گیا ہے، کہ اس میں سری کرشن جی کے اقوال قلم بند ہو گئے ہیں
اگرچہ مولانا شبلی مرحوم نے مہابھارت کے فارسی ترجمہ میں اس کے منظوم ترجمہ کا ذکر
نہیں کیا ہے اور صرف اسی قدر لکھنے پر اکتفا فرمایا ہے، کہ

"۹۹۰ھ میں اکبر نے حکم دیا کہ چھ چھ تین پنڈت جمع ہوں، اکبر خود عبارت کا مطلب
نقیب خاں کو سمجھاتا جاتا تھا، اور وہ فارسی میں ترجمہ کرتا تھا، پھر عبد القادر بدایونی
ملا شیری وغیرہ کو الگ الگ ٹکڑے سپرد کیے، دو فن فیضی کے حصہ میں آئے"[51]

لیکن ملا عبد القادر نے جہاں اس کا تذکرہ کیا ہے، اس میں فیضی کے قلم سے اس کے منظوم
ترجمہ کا ذکر بھی آیا ہے وہ کہتا ہے،

"بعد ازاں شیخ فیضی امور شد کہ نظم و نثر بنویسد و آں ہم بیشتر از دو فن صورت نیافت"[52]

فیضی نے یہ فارسی ترجمہ مہابھارت کے فارسی نثر کے ترجمہ کو سامنے رکھ کر شروع کیا
تھا، لیکن وہ اس کو مکمل نہ کر سکا، الیٹ نے لکھا ہے،

"پھر شیخ فیضی پاکیزہ نظم و نثر میں اس کو اجمالی ترجمہ کے ذریعہ منتقل کرنے پر مامور کیے گئے لیکن
وہ دو حصوں سے زیادہ مکمل نہ کر سکے"[53]

گیتا کے نثر میں فارسی ترجمہ کے نسخے ایک سے زیادہ انڈیا آفس بنگال ایشیاٹک سوسائٹی
اور بانکی پور میں موجود ہیں[54]، ان میں سے ایک ترجمہ ابو الفضل کا بھی کیا ہوا ہے[55]، اس میں آغاز
کتاب کی یہ عبارت ہمارے لیے مفید مطلب ہے،

---

[51] شعر العجم ج ۳ ص ۶۹ [52] بدایونی ج ۲ ص ۳۲۱ [53] تاریخ ہند الیٹ ج ۵ ص ۵۳۷
[54] فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس ج ۱ ص ۹۹۵ ، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ورک نمبر ۲۲۱
ص ۵۰۴ و کتاب نمبر ۴۶۹۰ ، بانکی پور ج ۱۶ ص ۱۲۹ [55] بعض مستشرقین نے اس ترجمے کے ابو الفضل
کی طرف انتساب کو صحیح نہیں سمجھا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک ان کی یہ رائے صحیح نہیں ہے، مہابھارت کے
مختلف حصوں کا ترجمہ مختلف اہل علم نے کیا تھا، اگر ابو الفضل نے اس کے اس حصہ کو فارسی میں منتقل
کیا، جو گیتا پر مشتمل تھا، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، خصوصاً جب کہ دیباچہ میں ابو الفضل
کی یہ عبارت بھی موجود ہے:-

"این نسخہ گیتا کہ در انکشاف اسرار قدرت ذو الجلال و اکتشاف حقیقت معرفت لایزال ہست
آن را با جازت سلطان عادل و برہان کامل ...... جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی -
بندہ شیخ ابو الفضل از زبان سنسکرت ترجمہ بعبارت لسان فرس و عربی در آوردہ"
(فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس ج ۱ ص ۵۶)

"گیتا بزبان فارسی تصنیف شیخ ابوالفضل علامی از کتاب مہابھارت از فنِ ششم کہ آن را

بحکم پرب گوبند سری کرشن جیو و ارجن بنیاد "

یعنی یہ رسالہ اگرچہ گیتا کا ترجمہ ہے، لیکن اس کو فارسی میں مہابھارت کے فن ششم کو سامنے رکھ کر منتقل کیا گیا ہے، اس لیے اس کو مہابھارت کے جزوی ترجمہ سے بھی موسوم کر سکتے ہیں اور چوں کہ یہی حصّہ گیتا کے نام سے بھی موسوم ہے، اس لیے اس کو گیتا کا فارسی ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں، بہت ممکن ہے کہ فیضی نے اسی فارسی نثر سے اس کو نظم میں منتقل کیا ہو[۱]

نیز اس منظوم فارسی ترجمہ کا نسخہ بھی جس پر اس وقت گفتگو جاری ہے، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود ہے، اگرچہ اس میں کوئی دیباچہ نہیں ہے، لیکن اس نسخہ کے سرورق پر مترجم کی حیثیت سے فیضی کا نام درج ہے، اور ہمارے نزدیک اتنی شہادت بھی فیضی کی طرف اس کے انتساب کی صحت کے لیے کافی ہے، اس نسخہ کا پہلا شعر وہی ہے جو مطبوعہ نسخہ میں پایا جاتا ہے یعنی

طرازندۂ داستانِ کہن ۔۔۔ بدنیسان، بیفگند طرح سخن[۲]

اس نسخہ میں دیباچہ کے موجود نہ ہونے سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے، کہ فیضی نے در اصل مہابھارت کے بعض اجزا کا ترجمہ نظم میں کیا تھا، اور ان اجزا میں وہ حصہ بھی تھا، جس پر بھاگوت گیتا مشتمل ہے، اور اسی وجہ سے بھاگوت گیتا کے منظوم ترجمہ کا ذکر فیضی کے سوانح میں نہیں آیا ہے، اس قیاس کی تردید اسی صورت میں ہو سکتی ہے، کہ فیضی کے سوانح میں اس ترجمہ کے انتساب کا ذکر نظر آجائے، اور اس وقت یہ سمجھا جا سکتا ہے، کہ اُس نے گیتا کے علٰحدہ نسخہ کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا تھا، لیکن پھر اس پر کسی دیباچہ کا موجود نہ ہونا تعجب خیز ہوگا،

بہرحال خواہ کہیں انفرادی طور پر ذکر مل جائے، یا نہ ملے، فیضی کی طرف اس نسخہ کا انتساب صحیح ہے، اور اسی وجہ سے ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخہ میں عہد قدیم ہی میں کسی نے اس کے سرورق پر فیضی کا نام لکھ دیا تھا، اور غالباً یہ منظوم ترجمہ جس قلمی نسخہ سے پہلی مرتبہ چھاپ کر شائع کیا گیا ہے، اس پر بھی فیضی کا نام درج ہوگا،، فقط

---

[۱] انڈیا آفس ج ۱ ص ۹ و بنگال ایشیاٹک سوسائٹی درک نمبر ۲۴۱ ص ۴۵۸ کتاب نمبر ۶۹۴
[۲] فہرست مخطوطات بنگال ایشیاٹک سوسائٹی درک نمبر ۲۴۰ ص ۱۴۱۷ کتاب نمبر ۹۱۰

کیا عالمگیر کے عہد میں تاریخ نویسی قانوناً جرم تھی

عالمگیر کی فرد قرارداد جرم میں ایک یہ جرم بھی بیان کیا جاتا ہو، کہ اس نے اپنے مظالم کی پردہ پوشی کے لیے اپنے عہد میں تاریخ نویسی کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا تھا چنانچہ دور حاضر کے ایک ممتاز مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب ایم، اے ڈی لٹ پروفیسر تاریخ الٰہ آباد یونی ورسٹی اپنی تاریخ ہندوستان میں جو اسکول کے اوپر کے درجوں کے لیے لکھی گئی ہے، عالمگیر کے جرائم تعصب و تشدد میں ایک اس جرم کا بھی اضافہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:۔

" اورنگ زیب نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ کوئی اس کے زمانے کے واقعات کا حال نہ لکھے " مگر

" ایک ہم عصر مسلمان مورخ محمد ہاشم خفیہ طور سے اس زمانہ کے حالات لکھتا رہا اس لیے وہ خافی خان کہلاتا ہو، اس کی کتاب "منتخب اللباب" سے اورنگ زیب کے زمانے کا بہت کچھ حال معلوم ہوتا ہو۔[1] "

ہمارے ڈاکٹر صاحب نے یہ بیان غالباً اپنے پیش رو انگریز مورخین کی تقلید میں لکھا ہو، بہرحال اس دعوی کے یہ تین ٹکڑے ہیں

(۱) عالمگیر نے اپنے عہد میں تاریخ نویسی کی ممانعت کر دی،

(۲) محمد ہاشم خفیہ طور پر اس کے عہد میں اپنی تاریخ لکھتا رہا،

(۳) اسی خفیہ نویسی کی وجہ سے وہ "خافی خان" کہلایا،

واقعہ یہ ہے، کہ جب محمد ہاشم کی منتخب اللباب شائع ہوئی اور اس

خافی خان کے مطبوعہ نسخے کے سرورق پر مصنف کا لقب "خافی خان" نظر آیا، تو

[1] تاریخ ہندوستان ایشوری پرشاد ص ۲۰۲ مطبوعہ انڈین پریس الٰہ آباد ۱۹۲۳ء

اسی زمانہ سے بہ طور تخمین و قیاس یہ آواز پیدا ہو گئی تھی، کہ وہ اپنی خفیہ نگاری کے باعث اس لقب سے ملقب ہوا ہوگا اور یہ اس لیے کہ عالمگیر نے اپنے عہد کے مظالم کی پردہ پوشی کے لیے تاریخ نویسی کی ممانعت کردی ہوگی، اور نیز منتخب اللباب کے دیباچہ کے بعض بیان سے اس قیاس آرائی کی مزید تائید ہوئی جس کا تذکرہ آیندہ آئے گا، پہلے ہمیں محمد ہاشم کے لقب اور منتخب اللباب کے عہد تالیف پر نظر ڈالنی ہے،

یہ عجیب اتفاق ہے، کہ جس طرح عالمگیر کے عہد میں عمال حکومت اور فوج سے کبھی جو غلطیاں سرزد ہوئیں، وہ براہ راست عالمگیر کے سر تھوپ دی گئیں، اسی طرح آج چند صدیاں گذرنے کے بعد بھی جب عالمگیر کے عہد کی واقعات کی تاریخ مطبع سے شائع ہوئی اور اس سے ایک اتفاقی غلطی سرزد ہو گئی تو اس کو بھی ایک مستقل الزام بنا کر عالمگیر کے سر ڈال دیا گیا،

"خافی خان" کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے نسخہ کی ایک اتفاقی غلطی ہے، کہ اس میں محمد ہاشم نظام الملکی کا لقب "خوافی خان" کے بجائے "خافی خان" شائع ہوا، خواف نیشاپور (خراسان) کے ایک قصبہ کا نام ہے، خوافی سے اسی کی طرف نسبت کی جاتی ہے، معجم البلدان میں ہے،

خواف۔۔ قصبۃ کبیرۃ من اعمال نیسابور بخراسان۔۔	خواف۔۔ نیشاپور (خراسان) کا ایک بڑا قصبہ ہے۔۔
ینسب الیہا جماعۃ من اہل العلم والادب۔۔ منہم ابو المظفر	اس کی طرف اہل علم و ادب کی ایک جماعت منسوب ہے،
احمد بن محمد بن المظفر الخوافی[1]۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۔۔۔۔ ان ہی میں ابو المظفر احمد بن محمد بن مظفر خوافی ہیں،

اسی طرح کتاب الانساب سمعانی میں ہے:-

خوافی۔۔۔ ہذہ النسبۃ الی خواف وہی ناحیۃ من نواحی نیسابور	خوافی۔۔۔ نسبت خواف کی طرف ہے، جو نواحی نیشاپور میں
۔۔ کان منہا جماعۃ من العلماء والمحدثین[2]،	ہے۔۔ یہاں سے علماء و محدثین کی ایک جماعت پیدا ہوئی،

خواف کے اکثر اہل علم و فن سلاطین مغلیہ کے دامن سے وابستہ تھے، اور معزز عہدوں پر فائز تھے، منتخب اللباب میں بھی ان کا جا بجا تذکرہ ہے، مثلاً عبد الخالق خوافی (ج ۱ ص ۲۶۲)

---

[1] معجم البلدان ج ۳ ص ۴۶۹ مطبوعہ مصر [2] کتاب الانساب (گب) ورق ۲۱۰

شیخ میر خوافی (ج ۲ ص ۱۲-۱۶-۲۳-۲۵-۲۷-۳۰ وغیرہ) اور خواجہ کلاں خوافی کفایت خاں وغیرہ (ج ۲ ص ۱۹، ۲۰ وغیرہ)

اور محمد ہاشم نے کہیں کہیں ان لوگوں سے اپنی رشتہ داری اور نسبت بھی بیان کی ہو، خواجہ کلاں خوافی کے ذیل میں لکھتا ہو:۔

"خواجہ کلاں خوافی کہ خالوی محرر اوراق می شد اصالۃً دیوانی اجین کہ ...... "[1]

اور اسی طرح اپنے وطن خواف اور ابنائے وطن کے متعلق عالمگیر اور شیخ میر خوافی کے تذکرہ کے ایک سلسلہ میں لکھتا ہے:۔

گویند بہ سبب چناں جاں فشانی کہ بداں ارادت وعقیدت از شیخ میر بظہور آمد،

بادشاہ قدرداں خانہ زاد پرور را نسبت بہ مردم خواف توجہ تمام بہم رسید آں قدر کہ

در عہد خلد مکان عالمگیر بادشاہ مردم خواف کہ محقرترین الکاے خراسان است پیش آمدند ترقی

نمودند در ہیچ عہدے از بادشاہان سلف در تواریخ بنظر نیامدہ و فی الحقیقت اگرچہ مردم

خواف نسبت بہ مردم خراسان در ظاہر درشت و بیرو واقع شدہ اند۔ اما اکثر در کارہا راست

و درست اند و در طریقۂ پاس حق نمک آقا از جملۂ ثابت قدمان حق توان محسوب نمود۔[2]

چنانچہ منتخب اللباب کے بعد کی تاریخوں میں جن کا وہ ماخذ ہو، کتاب کے مؤلف کا نام ہر جگہ خوافی خان ملتا ہو، مثلاً مآثر الامرا نواب صمصام الدولہ، شاہ نواز خاں میں چند جگہ اس کا نام آیا ہو، اور ہر جگہ یہی نام مذکور ہو،

دیباچہ میں ماخذوں کی فہرست میں ہو،

"لب لباب تالیف خوافی خان"

ج ۱ ص ۴۶۲ میں ہو:۔

خوافی خان صاحب تاریخ لب لباب ...... آوردہ

اور اسی طرح ج ۱ ص ۱۵۴ میں ہو،

اما خوافی خان در تاریخ خود ز بانی خواجہ مکارم جان نثار خاں ...... آوردہ

---

[1] منتخب اللباب ج ۲ ص ۱۹ [2] ایضاً ج ۲ ص ۲۱۲۔

اور پھر ج ۳ ص ۶۰۰ میں ہے

خوافی خاں صاحب تاریخ منتخب اللباب ... نقل می کرد۔

منتخب اللباب کا عہد تصنیف

باقی رہا منتخب اللباب کو عہد عالمگیر کی تالیف بتانا ایک ایسی سخت حیرت انگیز غلطی ہے جس کا ارتکاب ہندوستان کی ایک عظیم الشان یونی ورسٹی کے پروفیسر تاریخ سے صد درجہ تعجب انگیز ہے، اگر تاریخ ہندوستان کی تالیف کے وقت منتخب اللباب سامنے موجود نہ تھی، تو اس کتاب کا حوالہ دیتے وقت کم از کم کسی فہرست مخطوطات ہی میں اس کو دیکھ لیا جاتا، تو یہ التباس دور ہو جاتا، مثلاً فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس میں ہے:۔

یہ سنہ ۱۱۴۳ھ - ۳۱-۱۷۳۰ء سے پہلے مکمل نہیں ہوئی، اور مؤلف نے سنہ ۱۱۴۴ء میں وفات پائی [1]

ورنہ منتخب اللباب میں سنہ تالیف وغیرہ کے علاوہ کہ جس سے عہد عالمگیر کی وفات کے دس برس بعد کی یہ تالیف ثابت ہوتی ہے، جا بجا ایسے واضح قرائن موجود ہیں، کہ اس کو عہد عالمگیری کی تالیف غلطی سے بھی نہیں کہا جا سکتا، مثلاً عالمگیر کے حالات میں اکثر مواقع پر اس کو "خلد مکانی" سے موصوف کیا گیا، اور اس کے برخلاف دیباچہ کے شروع ہی میں جہاں محمد شاہ کا تذکرہ آیا ہے اس کا نام فرماں روائے وقت کی حیثیت سے لکھا گیا ہے، دیباچہ میں ہے

"تا ذکر سلطنت عہد مبارک پادشاہ جم جاہ، جواں بخت، فرازندہ تاج و تخت، خسرو ربع جہاں بانی، گوہر درج صاحبقرانی آبرو بخش دولت دوبارہ تیموری، ابو الظفر ناصر الدین محمد شاہ بادشاہ غازی لغایت سنہ ہزار و صد و سی کہ بہ تالیف آں جلد پرداختہ در مدت دو صد سال قمری بہ چہاردہ بادشاہ زینت افزائے تخت ہندوستان پرداخت گشتہ اند، "

پھر تمام کتاب میں ہے،

"لغایت شروع سنہ چہاردہ بہ تحریر مجملی از سوانح عہد محمد شاہ بادشاہ پرداختہ انشاء اللہ تعالیٰ بعد ازیں بہ شرط بقائے حیات و وفا نمودن فرصت آنچہ اتفاق افتد بہ تسطیر تغیر و تبدیل دفتر نگارندہ قلم رنجہ خواہد ساخت [2]"

---

[1] فہرست مخطوطات انڈیا آفس نمبر کتاب ۳۹۶ ص ۱۳۹، [2]

کتاب کے آغاز و اختتام کو آپ نے پڑھ لیا، کیا یہ عہد عالمگیری کی عبارت ہو! کہ یہ کہا جا سکے۔ کہ عالمگیر کا ایک ہم عصر مسلمان مورخ محمد ہاشم خفیہ طور سے اس زمانہ کے حالات لکھتا رہا، اور اس لیے وہ خافی خاں کہلاتا ہے "

لیکن اگر اس موقع پر ہمارے لائق مورخ عہد عالمگیری میں تاریخ نویسی کی ممانعت کا ازالہ "ہم عصر مسلمان مورخ" کے نام لقب سے ثابت کرنے کے بجائے ہم مسلمان مورخ کے بعض بیانات سے ثابت کرتے، تو وہ اولاً نیسی فاش تاریخی غلطیوں میں نہ پڑتے، بلکہ بہ ظاہر کسی حد تک وہ ترجیح قیاس واقعہ نظر آتا، وہ وہی بیان ہو جس کی طرف ہم ابھی اوپر اشارہ کر آئے ہیں، منتخب اللباب کے دیباچہ میں ہے:۔

> اگرچہ خلاصۂ سوانح پنجاہ سال عہد آں پادشاہ ہم جاہ جند کار آوردن، آب دریا بکوزہ پیمودن است خصوص احوال چہل سال او اخر کہ مورخان از تسطیر آں ممنوع گشتہ رشتہ بیان نہ کشیدہ اند بسیار بیت بے پایان[۵۷] "

محمد ہاشم کا یہ ایک ایسا بیان تھا، جس سے عہد عالمگیری میں تاریخ کی تدوین کے امتناع کا حکم نکل سکتا تھا، لیکن درحقیقت اس بیان کو بھی اس الزام سے دور کا بھی سروکار نہیں، اس میں ایک بالکل جداگانہ واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہو

تاریخ نویسی کا سرکاری محکمہ

واقعہ یہ ہو کہ سلاطین مغلیہ کے دربار میں تاریخ نویسی کا ایک سرکاری محکمہ ہوتا تھا، دربار کے چند اہل قلم تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور تھے، وہ تزارہ بادشاہ اور دربار کے چھوٹے بڑے واقعات اور سلطنت کے حوادث و وقائع کو ترتیب دے کر کتاب کی شکل میں مرتب کرتے، اور پھر یہ کتاب فرماں روائے وقت کے سامنے پیش کی جاتی، وہ جہاں چاہتا اس میں رد و بدل کر دیتا، چنانچہ تزک بابری، اکبرنامہ، جہانگیرنامہ، اور شاہجہاں نامہ وغیرہ اسی قسم کی تالیفات ہیں، جو سلاطین مغلیہ کی نگرانی میں ترتیب پائی ہیں، اور خود عالمگیر کے ابتدائی عہد حکومت کے دس سالوں تک یہ طریقہ رائج رہا، چنانچہ اس کے ابتدائی دہ سالہ عہد حکومت کی تاریخ عالمگیرنامہ ہو، جس کو منشی محمد کاظم بن محمد امین نے مرتب کیا ہو، اور وہ ایشیاٹک سوسائٹی سے شائع ہو چکی ہو، محمد کاظم اس کا مسودہ مرتب کرتا، اور اس کو عالمگیر خود ملاحظہ کرتا، اور پھر سال بہ سال یہ کتاب ترتیب پاتی جاتی تھی،

لیکن اگر مورخانہ دیانت داری سے دیکھا جائے، تو ان کتابوں کی حیثیت کسی آزادانہ تاریخی تصنیف کی نہیں قرار پاسکتی بلکہ اس کی ایک حد تک وہی حیثیت ہوسکتی ہے، جو آج کل حکومتوں کی سالانہ رودادوں کی ہوتی ہے۔ بلکہ پھر ان رودادوں اور ان تصنیفوں میں بھی ایک اصولی فرق ہوگا، کہ ان رودادوں کی اشاعت و ترتیب کی ذمہ دار خود حکومت ہوتی ہے، اور اس لیے سیاسی و دیگر معاملات حکومت میں حکومت اپنے طریق کار کی حمایت کرتی ہے لیکن شاہان مغلیہ کے عہد کی وہ کتابیں اگرچہ حکومت کی جانب سے ترتیب پاتی تھیں، اور ان میں اسی کے نقطۂ نظر کو واضح کیا جاتا تھا، لیکن ان بیانات کی صداقت اور ان رایوں کی صحت کی تمام تر ذمہ داری ان ہی مصنفین کے سر ہوتی تھی، اور ایک آزاد مورخ کے نام سے حکومت کی جا و بے جا حمایت کرائی جاتی تھی، اسی لیے یہ فیصلہ با آسانی ہوسکتا ہے، کہ حکومت کے مخالف پہلوؤں کے موقعوں پر ان کتابوں کا تاریخی پایہ کتنا وکیا ہوسکتا،

عالمگیر کا جرم

عالمگیر کا اگر کوئی جرم ہے، تو یہی کہ اس نے اس مذموم تاریخ نویسی کے سلسلہ کو ایک قلم ممنوع قرار دے دیا، کہ تاریخیں وہ ہوں گی جو دوسرے اہل قلم لکھیں نہ کہ وہ ہوں گی جو حکومت کے زیر سایہ ترتیب پائیں، چنانچہ اسی حکم کے مطابق منشی محمد کاظم کی تالیف عالمگیر نامہ کی ترتیب کا سلسلہ صرف دس برس کے حالات تک پہونچ کر منقطع ہوگیا۔ عالمگیر نامہ ایشیاٹک سوسائٹی سے شائع ہوچکی ہے، اسے دیکھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے، کہ یہ کسی آزاد نگار مورخ کا تاریخی شاہکار ہے، یا سرکاری دفتر کی سرکاری کھتونی، کہ جس میں مخالف حکومت اشخاص کے نام تک تحقیر و تذلیل سے لکھے گئے ہیں، اور خصوصاً "دارا شکوہ" ہر جگہ دارائے بے شکوہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے،

عالمگیر نے اسی غیر مناسب سلسلۂ تاریخ نویسی کو مسدود کردیا، چنانچہ جب عالمگیر کے عہد حکومت کے بعد ہی طرح اس کے بقیہ پچاس سال حکومت کی تاریخ "مآثر عالمگیری" مستعد خان کے قلم سے ترتیب پائی تو اس نے اپنے دیباچہ میں اس حقیقت کو واضح کیا وہ لکھتا ہے:۔

> و چون بادکتاب باعث انتصاب دوالخطاب عالمگیر نامہ متضمن وقائع دہ سالہ[1]
>
> از ... ... ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی نگاشتہ
>
> خامہ بدائع نگار میرزا محمد کاظم صدر آئین سخنان نادرہ کار است و چون خدیو عالم صورت حقیقی
>
> و [illegible] "

[1] [illegible]

اسی بنا پر عالمگیر نامہ کے مقدمہ میں مصحح کتاب کا بیان حسب ذیل ہے:۔

> وچوں بندگان حضرت اعلیٰ خاقانی بہ مقتضائے دانش خداداد و فطرت بلند و علو ہمت
> و وسعت حوصلہ ابقائے آثار ظاہر را در جنب بحوان دقیقہ نہادہ بہ تاسیس آثار باطن بیشتر
> توجہ داشتند بعد از تدوین واقعات دہ سالہ حکم حقیقت شیم صادر شد کہ گذارندۂ داستان
> مفاخر و مکارم محمد کاظم مصنف کتاب مستطاب عالمگیر نامہ من بعد وقائع را بقید کتاب
> در نیاورد۔ لہٰذا او ہم بداں قدر اکتفا نمود۔[۱]

یہ ہے اس الزام کی اصل حقیقت غریب عالمگیر اپنی خاکساری و فروتنی سے اپنے مفاخر و مکارم کی زمزمہ داستان گوئی کو منتشر کرتا ہے لیکن اس پر الزام یہ آتا ہے، کہ اس نے اپنے عہد کے مظالم کی پردہ پوشی کے لیے تدوین تاریخ پر عام حکم امتناع جاری کر دیا، اگر یہ واقعہ ہوتا تو ظالم عالمگیر کو اپنے پہلے دہ سالہ جرائم کے اخفا کے لیے جو باپ اور بھائیوں کے ساتھ اس نے کیے، اپنے ابتدائی دہ سالہ تاریخ کو خاکستر کرنا چاہیے تھا، نہ کہ آئندہ کے واقعات کو جس میں مرہٹوں کی جنگ کے سوا کوئی اور اہم باب نہیں،

بہرحال اگر حقیقت عالمگیر کے عہد میں تدوین تاریخ کا سلسلہ قطعی روک دیا گیا ہوتا تو آج بہت سی کتابیں جو عہد عالمگیر میں ترتیب پائی ہیں، عالم وجود میں نہ آئی ہوتیں، ورنہ عالمگیر کے عہد میں پرچہ نویسی و واقعہ نگاری کا جو نظام قائم تھا، اس سے ممکن نہ تھا، کہ مورخین اپنی کتابیں لکھتے اور پرچہ نویس ان سے بے خبر ہوتے چنانچہ اس وقت یورپ اور ہندوستان وغیرہ کے مختلف کتب خانوں میں عہد عالمگیری کی بہ کثرت کتابیں موجود ہیں، اور سب سے پر لطف یہ ہے کہ ان تالیفات میں نہ صرف مسلمان مورخین کی کتابیں ہیں، بلکہ اس عہد کے ممتاز ہندو اہل قلم کی تصنیفات بھی ہیں

عہد عالمگیری تاریخی تصنیفات

ذیل میں عہد عالمگیر کی تاریخی تصنیفات کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے، امید ہے کہ یہ فہرست ہمارے لائق مورخ کے تمام شکوک و شبہات کو دور کر دے گی، اس سلسلہ میں پہلے مسلمان مورخین کی کتابیں درج کی جاتی ہیں، اور پھر ہندو مورخین کی کتابیں درج کی جائیں گی مسلمان مورخین کی کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ **واقعات عالمگیری** مصنفہ امیر خاں، اس میں عالمگیر کی ولادت، شاہزادگی، اور تخت

---

[۱] مقدمہ عالمگیر نامہ ص ۵،

نشینی سے شاہ جہاں کی وفات تک کے حالات ہیں ، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین میں ہے ،

۲۔ عجیبہ غریبہ جو فتحیہ عبریہ یا عبریہ بھی کہلاتی ہے ، مؤلفہ شہاب الدین طالش بن محمد ولی احمد یہ کوچ بہار اور آسام کی فتح عالمگیری کی تاریخ ہے ، جو عہد عالمگیری کے ابتدائی سالوں میں پیش آئی ، زمانہ تالیف ۱۰۷۳ھ ہے ،

۳۔ واقعات عالمگیر مؤلفہ عاقل خاں رازی ، عالمگیر کے ابتدائی سالوں از ۱۰۶۸ھ تا ۱۰۷۰ھ تک کی تاریخ ہے ،

۴۔ تاریخ شاہ شجاعی مؤلفہ محمد معصوم بن حسن صالح ، شاہ شجاع کی جنگوں کے حال میں ہے ، زمانہ تالیف ۱۰۷۰ھ ہے ،[۱]

۵۔ آئینۂ بخت ۔ مؤلفہ بختاور خاں ، کتاب کا آغاز تصنیف ۱۰۷۸ھ میں ہوا ، اس میں بابر سے شاہ جہاں کے مختصر حالات اور عہد عالمگیر کے ابتدائی دس سالہ حکومت کے مفصل واقعات ہیں اور مصنف کے بیان کے مطابق علت غائی اس تالیف کی عالمگیر کے حالات ہیں ، یہ نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے اور اس کا مفصل تذکرہ معارف ج ۷۹ نمبر ۲ میں شائع ہو چکا ہے ، بختاور خاں نے ۱۰۹۶ھ میں وفات پائی ، اور عالمگیر نے خود نماز جنازہ پڑھائی تھی ، مآثر عالمگیری ص ۱۰۹ پر ۱۰۹۵ھ میں ہے ،

۶۔ مراۃ العالم بختاور خاں کی ایک دوسری تالیف مراۃ العالم کے نام سے برٹش میوزیم میں موجود ہے ،[۲] اس تصنیف کی تاریخ بھی "آئینۂ بخت" ہے ، منشی احمد علی خاں صاحب مہتمم کتب خانہ رامپور کا خیال ہے ، کہ غالباً بختاور خاں نے ابتداءً صرف بابر سے عالمگیر تک کے حالات لکھے ، اور اس کا نام آئینۂ بخت رکھا ، پھر اسی کو وسعت دیا ، اور اس کو "مراۃ العالم" کے نام سے موسوم کیا ، اور اس کا تاریخی نام "آئینۂ بخت" باقی رکھا ، لیکن انڈیا آفس کی فہرست مخطوطات کے مرتب نے اس تالیف مراۃ العالم کو شیخ محمد بقا (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۹۴ھ) کی تالیف قرار دیا ہے ،[۳] عجب نہیں کہ شیخ محمد بقا موصوف کی تصنیف مراۃ جہان نما سے جس کا ذکر آگے آتا ہے ، التباس ہو گیا ہو ، صمصام الدولہ

۱؎ فہرست مخطوطات رامپور ص ۱۰۱ ۲؎ فہرست مخطوطات برٹش میوزیم ج ۱ ص ۱۲۵ ۳؎ انڈیا آفس نمبر کتاب ۱۲۳۳

شاہ نواز خاں نے مآثر الامرا میں بختاور خاں کا ذکر کیا ہے، اور اس کی تصنیف مراۃ العالم کو اپنے ماخذ میں شمار کیا ہے[۵۳]، مراۃ العالم کا نسخہ دار المصنفین میں بھی موجود ہے،

۷۔ مراۃ جہان نما۔ یہ اسی شیخ محمد بقا (مولود ۱۰۳۷ھ متوفی ۱۰۹۴ھ) کی تالیف ہے جس میں عالمگیر کے دہ سالہ حکومت تک کی تاریخ ہے، اور ۱۰۹۴ھ میں مصنف کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے محمد شفیع (۱۰۹۵ھ) نے اس کو عہد عالمگیری ہی میں اڈٹ کیا، انڈیا آفس میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے[۵۴]،

۸۔ زینت التواریخ مؤلفہ عزیز اللہ، یہ تاریخ عام ہے، زمانہ تالیف ۱۱۱۶ھ ہے۔ برٹش میوزیم میں موجود ہے،

۹۔ تنقیح الاخبار مؤلفہ ملا محمد یحییٰ عہد عالمگیری کی تالیف ہے، یہ فرخ سیر کے عہد ۱۱۲۵ھ تک کی عام تاریخ ہے، عہد عالمگیر میں ۱۱۰۶ھ سے اس کی تالیف شروع ہوئی،

۱۰ آداب عالمگیری۔ مؤلفہ منشی الممالک شیخ ابو الفتح قابل خاں، یہ کتاب عہد عالمگیری کے سرکاری دستاویزات اور خطوط وغیرہ پر مشتمل ہے، ۱۱۱۵ھ میں یہ مجموعہ کتاب کی شکل میں مرتب ہوا، اور اس کی تاریخ "گل از باغ جان" سے متعین کی گئی ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ہمارے کتب خانہ دار المصنفین میں بھی موجود ہے،

۱۱ خلاصہ عالمگیر نامہ مولفہ حاتم خاں، یہ اگرچہ عالمگیر کے ابتدائی دہ سالہ عہد کی تاریخ ہے لیکن اس دسویں سال کے بعد ترتیب پائی ہے، جب عالمگیر نے محمد کاظم کے عالمگیر نامہ کی ترتیب روک دی تھی، یہ تمام تر اسی کا خلاصہ ہے، اور برٹش میوزیم کا نسخہ عالمگیر کے ۴۷ ویں سال حکومت ۱۱۱۵ھ کا مکتوب ہے،

۱۲۔ وقائع نعمت خان عالی۔ اس میں عالمگیر کے حملہ، حیدرآباد ۱۰۹۷ھ کے چند دنوں کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں، جو اسی زمانہ میں لکھے گئے تھے، اس کا نسخہ عام طور پر شائع ہے،

۱۳۔ جواہر التواریخ مؤلفہ سلمان قزوینی یہ از ابتدائے آفرینش تا عہد عالمگیر کے حالات

---

۵۳ دیباچہ مآثر الامراء ۵۴ نمبر کتاب ۱۲۶

پر مشتمل ہے، لیکن بوڈلین لائبریری میں جو نسخہ ہے، وہ جہانگیر کے عہد تک کے حالات میں ہے۔ مگر مصنف نے دیباچہ میں عہد عالمگیر تک کی تاریخ کی ترتیب بتائی ہے، اور مرتب فہرست نے اس کو عہد عالمگیری کی تصنیف قرار دیا ہے، کتاب میں عالمگیر کے نام کے ساتھ "خلد اللہ ملکہ" کے الفاظ بھی موجود ہیں۔[۵۱]

۱۴ **مجموعہ اقتباس تواریخ مختلفہ** - یہ بوڈلین لائبریری کا ایک نسخہ ہے، مصنف کا نام درج نہیں، لیکن زمانہ تالیف ۱۰۸۰ھ ہے، اس میں حسب ذیل تاریخوں کے خلاصے ہیں، تاریخ سلاطین خلافت تزئین سلسلہ علویہ صفویہ مشتمل بر حالات از ۹۰۶ھ تا ۱۰۸۰ھ، تواریخ بعضے از فتوحات تسخیر قلاع و ولادت و سوانح و واقعات و بنائے مساجد و روضات و ابنیہ و عمارات و حیاض و باغات و تولد و عروسی شاہزادۂ عالی کامگار مشتمل بر حالات تا ۱۰۶۲ھ، تاریخ سلطنت بادشاہ خلجیہ، تاریخ سلاطین سلسلہ علیہ صاحبقران امیر تیمور گورگانی، فتح نامہ کہ مولانا علی کل از برائے حسین نظام شاہ نوشت و تاریخ سلاطین سلسلہ علیہ قطب شاہیہ تا حالات ۱۰۸۰ھ۔[۵۲]

اب ذیل میں عہد عالمگیر کے چند ہندو مورخین کی کتابیں پیش ہیں :-

۱۵ **فتوحات عالمگیری** مصنفہ ایسر داس قوم ناگر متوطن بلدۂ پٹن، اس میں عالمگیر کی تخت نشینی سے ۳۴ ویں سال حکومت ۱۱۰۲ھ تک کے حالات ہیں، یہ عہد عالمگیری کی تالیف ہے،[۵۳]

۱۶ **نسخۂ دل کشا** مؤلفہ بھیم سین ولد رگھونندن داس، یہ عالمگیر کی دکنی معرکہ آرائیوں کی رزمیہ تاریخ ہے جس میں عالمگیر کی فوج کشی سے شاہ عالم کی تخت نشینی تک کے حالات ہیں، بھیم سین ۱۶۴۹ء میں پیدا ہوا، اور عالمگیر کی دکنی فوج سے وابستہ تھا، تاریخ کی ترتیب اگرچہ عالمگیر کی وفات کے دو سال بعد ۱۱۲۰ھ میں اختتام کو پہنچی، لیکن اس کا بیشتر حصہ وہ عہد عالمگیری کے عہد حکومت میں جب وہ مختلف مقامات پر جاتا رہا ترتیب دیتا رہا۔ (برٹش میوزیم)

۱۷ - **منتخب التواریخ** مؤلفہ جگ جیون داس ولد منوہر داس، اس کا مصنف عالمگیر کے عہد حکومت میں ۱۰۸۰ھ سے اس کا مواد فراہم کرتا رہا، لیکن ترتیب کا موقع نہیں ملا، یہاں تک

---

۵۱ فہرست مخطوطات بوڈلین لائبریری نمبر کتاب ۱۶۸، ۵۲ فہرست مخطوطات بوڈلین لائبریری نمبر کتاب ۱۷۸ - ۵۳ فہرست مخطوطات برٹش میوزیم ج ۱ ص ۲۶۹۔

کہ سنہ ۱۱۲۰ھ میں اس کو مرتب کیا (برٹش میوزیم)

۱۸ لب التواریخ ہند مؤلفہ رائے بندرابن پسر رائے بہارا مل، اس میں ہندوستان کے مسلمان فرمانروا شہاب الدین غوری (۵۷۶ھ) کے عہد سے عالمگیر کے ۳۰ویں سال حکومت سنہ ۱۱۰۰ھ تک کے حالات ہیں، عالمگیر کے عہد میں تالیف ہوئی، اور اس کا ایک نسخہ اسی عہد عالمگیر کے ۴۲ویں سال حکومت سنہ ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۸ کا لکھا ہوا انڈیا آفس میں موجود ہے،

اس کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس ہندو مصنف نے اپنی یہ تالیف نو، عالمگیر کے نام معنون کی ہے،

۱۹ خلاصۃ التواریخ مولفہ سجان رائے بعض نسخوں میں سنجان رائے یا بعض میں سوجن رائے یہ بھی ہندوستان کی عام تاریخ ہے، اور عالمگیر کے عہد کے چالیس سال یعنی سنہ ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ تک کے حالات پر ختم ہوتی ہے، اور اسی سال یعنی سنہ ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ میں اختتام کو پہونچی، اور عالمگیر کی خوش قسمتی سے اس ہندو مصنف نے اپنی یہ تاریخی تالیف عالمگیر کے نام معنون کی ہے، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ دار المصنفین میں بھی موجود ہے، اور اس میں مصنف کا نام سنجان رائے متوطن بٹالہ (یا پٹیالہ) ہے،

لیکن تاریخی حیثیت سے عہد عالمگیری کی ان تصنیفات سے زیادہ اس عہد کے مجموعہ مکاتیب و فرامین و احکام کو اہمیت حاصل ہے، یہ خطوط و احکام حسب ضرورت صادر ہوئے، اور روزانہ جو حوادث پیش آئے، اور حوادث کے مختلف پہلوؤں میں جو حکمت عملی اختیار کی گئی، اور جو سیاست برتی گئی، یہ خطوط و فرامین ان کا صحیح ترین مرقع ہیں، یہ اس عہد کے پوشیدہ سے پوشیدہ رسل و رسائل کی وہ کڑیاں ہیں، جنھیں دور حاضر کی حکومتیں بھی انتہا اخفا میں رکھتی ہیں، اس لیے عالمگیری عہد کی تاریخ کا حقیقی آئینہ یہی بن سکتی ہیں، کیوں کہ یہ خطوط و فرامین جب صادر ہوئے تھے۔ اس وقت نہ ان کی اشاعت کا خیال تھا، اور نہ انہیں حوادث عالمگیری کے حق و باطل میں فیصلہ کن قرار دینے کا تخیل تھا،

لیکن عہد عالمگیری کے چند سال گذرنے کے بعد جب لوگوں کو ان مکاتیب و فرامین کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا، تو عالمگیر نے اس میں کوئی مزاحمت نہیں کی، اور اسی عہد میں اس قسم کے مختلف مجموعے تیار ہوگئے۔ اور ان خطوط میں صرف عالمگیر کے مکاتیب نہیں ہیں بلکہ اس عہد کی اہم شخصیتوں

شاہجہاں، برادران عالمگیر، شاہزادگان عالمگیر، سیواجی، جے سنگھ، اور مختلف سرآوردہ عمال حکومت کے خطوط جمع کیے گئے،

اسی طرح لوگوں نے عالمگیر کے سرکاری کاغذات کو استعمال کیا، اور ان سے فرامین احکام کے مختلف مجموعے تیار کیے گئے۔ لیکن عالمگیر نے ان سرکاری کاغذات سے جمع و ترتیب کرنے میں منع نہیں کیا،

نیز خود عالمگیر نے اپنے سرکاری کاغذات کا مکمل و منظم دفتر قائم رکھا، جو اس عہد کی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتے تھے، چنانچہ اس وقت بھی انڈیا آفس میں عالمگیری عہد کے سرکاری کاغذات کا ریکارڈ موسومہ "اخبارات دربار معلی" موجود ہے، جس میں عالمگیر کے ۲۲ویں سال حکومت تک کے جستہ جستہ کاغذات ہیں، اور ۳۲ویں سال حکومت سے عہد آخر تک کی مکمل کڑیاں موجود ہیں،

اسی طرح عہد عالمگیری کے مکاتیب و فرامین کے بکثرت مجموعے مختلف مقامات پر آج بھی پائے جاتے ہیں، جن کے حوالے سرجدوناتھ سرکار اور ہمارے دوست سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم، اے نے اپنی تالیف میں مفصل درج کیے ہیں، ان مجموعوں کو نہ صرف مسلمان اہل قلم نے جمع کیا ہے، بلکہ ان میں متعدد ہندو مرتبین بھی شامل ہیں،

اس لیے عالمگیر پر یہ الزام لگانا کہ اس نے تاریخ نویسی کو قانوناً جرم قرار دیدیا تھا، عالمگیر پر ظلم ہو [illegible] برعکس کس قدر صریح ظلم ہے،

(مئی سنہ ۳۲ء)

"مہربانی کرکے آپ میری تاریخ اورنگ زیب جلد سوم متعلقات نمبر ۵ ص ۲۸۰ تا ۲۸۶ ملاحظہ کریں، جس میں ایسی فارسی تاریخوں کے ترجمے درج ہیں، جو مسلمانوں کی لکھی ہوئی ہیں، ان میں سے بیشتر اورنگ زیب سے متعلق ہیں، اور ثابت کرتی ہیں، کہ شہنشاہ نے حکم دیا کہ ہندوؤں کے سب کے سب مندر توڑ دیے جائیں اور اس نے اس کی مشق اپنی تخت نشینی کی پہلے سے شروع کردی تھی، مولانا شبلی نے اس کی کوئی وجہ نہیں لکھی کہ کیوں اورنگ زیب کے عہد حکومت کی ایسی سرکاری تاریخ کو قابل یقین نہ سمجھا جائے، جس کو محمد ساقی نے شہنشاہ کے مقرب مصاحب (مرید خاص) عنایت اللہ کی ہدایت کے مطابق سرکاری کاغذات کی مدد سے مرتب کیا ہو، اور جس میں بیان کیا گیا ہو، کہ

"سنہ ۱۰۷۹ء احکام اسلام نظام بناظمان کل صوبجات صادر شد کہ مدارس معابد بے دینان دست خوش انہدام سازند" (ص ۸۱)"

اس سے ثابت ہوتا ہی، کہ ۱۶۶۹ء میں یہ فرمان صادر ہوا کہ مندر مسمار کیے جائیں اور سنسکرت کے اسکول پورے مغلیہ سلطنت میں بند کردیے جائیں، یہ مثال اس امر کے ثبوت میں ہی کہ یہ حکم اورنگ زیب کے بہت ہی آخر عہد حکومت (ختم عہد ۱۷۰۷ء) میں صادر ہوا، اور اس کی مثالیں میری کتاب میں موجود ہیں، جو مستند مورخین سے ماخوذ ہیں، اور مسجد کے انہدام کا کوئی واقعہ اورنگ زیب کی تاریخ میں موجود نہیں"

تنقیح طلب امور | ان دونوں مراسلوں میں حسب ذیل امور تنقیح طلب نکلتے ہیں:-

۱- مولانا شبلی مرحوم نے اپنے اس بیان کی تائید میں کوئی حوالہ نہیں دیا کہ مندر جو ڈھائے یا منہدم کیے گئے،

۲- اورنگ زیب نے اپنی شاہزادگی کے زمانہ سے مندروں کے مسمار کرنے کی مشق شروع کی، پھر اپنے دور حکومت میں کل صوبوں میں مندروں کے انہدام اور ہندوؤں کے مدرسوں کے بند کرنے کا عام فرمان جاری کیا، اور اسی بنا پر عالمگیر کے زمانہ میں بہت سے مندر مسمار

کیے گئے، جن کا تذکرہ مستند مورخین نے کیا ہی، اور جنہیں سر جدو ناتھ سرکار نے اپنی تاریخ میں جمع کیا ہی،

۳۔ مولانا شبلی مرحوم نے ان مورخین خصوصاً محمد ساقی کے اس بیان کے باور نہ کرنے کے وجوہ بتائے کہ ۱۰۷۹ھ میں مندروں کے مسمار کرنے، اور مدرسوں کے بند کرنے کا عام فرمان جاری ہوا،

اب ذیل میں سلسلہ وار معروضات پیش ہیں :۔

مولانا شبلی مرحوم کا بیان

مولانا شبلی مرحوم کے متعلق یہ لکھنا صحیح نہیں کہ انھوں نے عالمگیر کے زمانہ میں مسجدوں کے مسمار کیے جانے اور مسلمانوں کے ہندو بنائے جانے کا ذکر کیا ہی، کہ اس نے اپنے عہد کی ان حرکتوں کے جواب میں مندروں کو مسمار کر دیا، بلکہ انھوں نے اکبر کے عہد سے عالمگیر کے زمانہ تک کے ہندوؤں کے طرز عمل کا جائزہ لیا ہی، اور دکھایا ہی کہ

"اب ہندوؤں نے علانیہ مسلمانوں پر تعدی اور ظلم شروع کیا، نوبت یہاں تک پہونچی کہ ہندو مسلمان عورتوں سے بہ جبر شادی کرتے تھے، اور ان کو گھروں میں ڈال لیتے تھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ مسجدوں کو توڑ کر اپنی عمارتوں میں داخل کرتے تھے، شاہجہاں نامہ عبد الحمید لاہوری جو شاہجہاں کی شاہی تاریخ ہو اور خود شاہجہاں کے حکم سے لکھی گئی ہو، اس میں یہ واقعہ تفصیل سے لکھا ہی،"

چناں چہ اس کی عبارت یہ ہی :۔

"چوں رایات جلال بہ حوالی گجرات پنجاب رسید جمع از سادات و مشائخ آں قصبہ مستغاثہ نمودند کہ برخے از کفار ناپاکار دراں اثر دیار مومنہ را در تصرف دارند و چندے از بنیان مساجد بہ تعدی در عمارات خود آوردہ بنا برآں شیخ محمود گجراتی کہ از رسمی دانش بہرہ در است دارو غگی مردم جدید الاسلام بر و مقرر گشت تا بعد از ثبوت نساء مسلمہ را از تصرف کفار برآرد و مساجد و عمارات آں طاعین جدا سازد، او مطابق حکم بہ عمل آوردہ بہ هفتاد و هفت مساجد بہ موضع از تصرف کفرہ

قحبہ برآورد و ہر جا کہ مسجدے در زیر عمارت ہنود درآمدہ بود، بعد از تحقیق آں را فرا از نمود و روزے اذاں جابہ طریق جرمانہ گرفتہ بہ دستور سابق مسجد ساخت، پس اذان کہ ایں ماجرا بمسامع جلال رسید یعنی قضا قضا از صادر شد کہ بہ دستور قدیم ہر کہ مسلمان شود مسلمہ را بعقد مجدد و یاد بگذارند پس از دو روز فرمان حجت از سادات یا دری بہ پایۂ اسلام رسیدہ زنان مسلمہ را بہ نکاح جدید متصرف گشتند و حکم شد کہ در کل ممالک محروسہ ہر جا چنیں واقع شدہ باشد، بدیں دستور عمل نماید، چناں چہ اناث بسیار از دست کفار برآمدہ در نکاح مسلماناں درآمدند دگر وہ ازکفار بہ قبول دین مبین .... از آتش دوزخ رہائی یافتند وبت خانہا منہدم گردید و بجائے آں مساجد بنا یافت[۵] ......

کیا شاہ جہاں نامہ کی یہ عبارت مولانا شبلی مرحوم کے مدعا کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہے؟

عالمگیر کے ہاتھوں مندروں کے انہدام کی حقیقت

۲۔ اورنگ زیب کی شاہزادگی کے زمانہ سے آخر دورِ حکومت تک مندروں کے مسمار کیے جانے کے جو واقعات پیش آئے، ان کی حقیقت سمجھنے کے لیے ان اسباب کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے، جو وقتاً فوقتاً پیش آتے گئے، اور ان کے نتیجہ میں مندر منہدم کیے گئے:

شاہ جہاں کے زمانہ میں ہندوؤں کی زیادتیاں

الف۔ شاہ جہاں کے زمانہ میں ہندوؤں کی جو زیادتیاں ہوتی رہتی تھیں، ان کا حوالہ مولانا شبلی مرحوم کی تحریر بالا میں گزر چکا، محمد صالح لاہوری نے عمل صالح معروف بہ شاہ جہاں نامہ میں اس واقعہ کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے:-

چوں ظاہر قصبۂ گجرات پنجاب مضرب خیام دولت و اقبال شد، چندے از

---

[۵] مضامین عالمگیر مولانا شبلی ص ۶۶ بہ حوالہ شاہ جہاں نامہ ج دوم ص ۵۷، ۵۸ واقعات ششم جلوس۔

سادات و مشائخ آں قصبہ معروض واقفان عتبہ سدرہ رتبہ داشتند کہ بعضے از
کفرہ فجرہ زنان و کنیزان مسلمان را در تحت تصرف داشتند، گروہے بد بخت خارج
از دائرہ دین نیز از طور حد و اندازہ خود پائے بیرون نہادہ، مساجد را داخل عمارات
خود نمودہ اند، بندگان حضرت تحقیق حقیقت ایں امر را بہ شیخ محمود گجراتی کہ داروغگی
ہمگی نو مسلمانان بدو مفوض بود مرجوع فرمودہ مقرر ساختند کہ بعض از ثبوت ایں
مقدمہ زنان و کنیزان را از ایشاں گرفتہ مساجد را از منازل ایں بے دینان جدا نمودہ
حقیقت بعرض مقدس رسانند، چوں شیخ بآں قصبہ رسید، ہفتاد جمیلہ و کنیز مسلمہ را
از تصرف آں مردوداں برآوردہ بمردم متدین پرہیزگار سپرد و چندیں مسجد را
از خانہائے ایشاں فراز ساخت و بے سعادتے کہ نسبت بہ مصحف مجید استخفافے
ازو سر نمودہ بود، بعد از اثبات او را گردن زدند، آں گاہ امر اعلیٰ بصدور پیوست
کہ در سائر ولایت پنجاب ہر جا ایں صورت بے معنی رو نمودہ باشد متکفلان
مہمات شرعی و متصدیان خدمت عرفی شرائط تفحص و تجسس بجا آرند و مسلمات را از
قبضۂ تصرف و کار جنی مساجد را از خانہ کفار برآوردہ بعقد مسلمانان در آورند،
قریب چہار صد ہندو بطیب خاطر قائل کلمتین طیبین گشتہ از تہ دل مسلمانان شدند
و ہفت مسجد از کفرہ فجرہ برآمدہ بتازگی عبادت گاہ اہل اسلام گردید، و سہ بت خانہ
از بیخ و بنیاد برکندہ شد و بجائے آں مساجد معابد اساس یافت[1] "

یہ صورت حال شاہ جہاں کے زمانہ میں جو ہر طبقہ میں غیر متعصب حکمراں مانا گیا ہے، قائم تھی، اور صرف کسی ایک قصبہ کا نہیں بلکہ پورے صوبہ پنجاب میں جا بجا اس کی مثالیں پائی گئیں، اور یہ ایک ایسے صوبہ کا حال تھا، جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں آباد تھے، اور جو بہت ہی قریب زمانہ میں دار الحکومت رہ چکا تھا، اور ہندوستان کے شہنشاہ کو اکثر یہاں کی آبادیوں سے گذرنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا، اسی مناسبت سے ان صوبوں کے مسلمانوں کا حال تصور کیا جا سکتا ہے، جو دار الحکومت سے دور پڑتے تھے، اور جہاں مسلمانوں کی آبادی بھی زیادہ موجود نہ تھی، پھر

---
۱ عمل صالح ج ۲ ص ۶۴-۶۵

شاہ جہاں کے آخر عہد حکومت میں دارا شکوہ کا دار دورہ ہوا جس کی ہندو پرستی کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے، اس لیے ہندوؤں کے متشدد مذہبی گروہ کا جبر و تعدی اس زمانہ میں جس حد تک نہ بڑھ گیا ہو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی،

عالمگیر کے عہد میں مسلمانوں میں گمراہی پھیلانے والے مرکز

ملک کے ایسے ماحول میں عالمگیر تخت نشین ہوا، اس نے رعایا کے مختلف فرقوں کے مذہبی وسیاسی و معاشرتی حقوق متعین کیے، اور ہر فرقہ کو کسی دوسرے پر ظلم کرنے سے روکا، لیکن ہندوؤں کے مذہبی گروہ کی جانب سے اس نوعیت کے واقعات اپنی شکل بدل کر اس کی حکومت کے دور میں بھی پیش آئے، جیسے کہ شاہ جہاں کے زمانہ میں پیش آچکے تھے، اس لیے اس کو بھی انسدادی کارروائیاں عمل میں لانی پڑیں، چناں چہ شاہ جہاں کے زمانہ میں اگر یہ تعیین یہ معلوم ہوا کہ مسلمان عورتوں کو ہندوؤں نے اپنے گھروں میں ڈال لیا، مسجدوں کو اپنے مکانوں میں داخل کر لیا، اور قرآن مجید کے ساتھ سوء ادب سے پیش آئے، اور شاہ جہاں نے ان کے انسداد میں جو ایسی کارروائیاں کیں، تو عالمگیر کے زمانہ میں ان واقعات نے یہ قالب اختیار کیا، کہ ہندوؤں کے مذہبی مقتدا مسلمان بچوں کو پاٹ شالوں میں داخل کرنے، اور انہیں مختلف ترغیبیں دے کر دور دور سے بلانے لگے، اور ان کے پاٹ شالے اور مندر مسلمانوں میں کفر و شرک پھیلانے کا ایک ذریعہ بن گئے، اور یہ خطرہ سامنے آیا، کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل کی نسل اسلام کی آغوش سے نکل کر ہندوؤں میں جذب ہو جائے، اس لیے عالمگیر نے اس کا تدارک کیا، اور یہی کہتے تدارک میں وہ فرمان نافذ کیا جس کو سر جدو ناتھ سرکار نے اپنے مکتوب میں نقل کیا ہے،

لیکن افسوس ہے کہ مسٹر موصوف نے صرف بیچ کی عبارت نقل کر دی، اور اس سے اوپر اور نیچے کی وہ عبارتیں چھوڑ دیں جن سے اس فرمان کا اصل منشا ظاہر ہوتا ہے، اور وہ واقعات علم میں آتے ہیں جو اوپر بیان کیے گئے، مآثر عالمگیری کی وہ پوری عبارت ذیل میں پیش ہے،

> بعرض خدا وند دین پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھہ و ملتان خصوص بنارس برہمنان
>
> بطالت نشان در مدارس مقررہ بہ تدریس کتب باطلہ اشتغال دارند و راغبان طالبان
>
> از ہنود و مسلمانان مسافتہائے بعیدہ طے نمودہ جہت تحصیل علوم شوم، نزد آں جماعہ

میں مندروں کے انہدام کی حقیقت سمجھنے کے لیے یہ ذہن نشین رکھنا بھی ضروری ہو، کہ اس زمانہ میں یہ کچھ دستور سا ہو گیا تھا، کہ لڑائیوں کے موقع پر دشمن کی عبادت گاہیں ڈھائی جاتی تھیں، چناں چہ ہندو اگر کسی مسلمان حکمراں پر فتح مند ہوتے، تو مسجدوں اور مصحفوں کی بے حرمتی کرتے، اور انہیں برباد کر دیتے تھے، اور مسلمان عورتوں کی عصمت تک محفوظ نہ رکھتے تھے، فیروز شاہ کے زمانہ میں قرت حسن کانگو معبر پر مستولی ہو گیا تھا، ایک ہندو سرکش بکن اس پر چڑھ دوڑا، اور معبر میں اوس نے جو تباہی پھیلائی، شمس سراج عفیف نے اپنی تاریخ میں اس کو درج کیا ہو، لکھتا ہو :-

"بکن مفسد کہ در حوالی معبر بود با شد با جمعیت انبوہ و پیلان با شکوہ در معبر در آمد و قرت حسن کانگو را زندہ گرفتہ، بعد از کشتن شہر معبر خود گرفت و بتمام معبر کہ شہر مسلمانان بودند خراب گردانیدہ بلکہ عورات مسلمانان بدست ہندو گرفتار شدہ در شہر معبر بکن اقامت کردہ[1] "

اسی طرح اگر مسلمان حکمراں کو کسی باغی ہندو آبادی پر فتح ہوتی، تو وہ مفتوحہ علاقہ کے مندروں پر حملے کرتے تھے یہاں تک، کہ اگر کوئی ہندو راجہ کسی والی کی مدد کے لیے کسی دوسرے مسلمان حکمراں کے مقابلہ میں آتا، تو بھی وہ مفتوح علاقہ کی مسجدوں و مصحفوں کی بے حرمتی سے باز نہ آتا تھا، چناں چہ ۹۷۶ھ میں علی عادل شاہ دکنی نے رام راج والی بیجانگر کو نظام شاہ کے مقابلہ میں اپنی مدد کے لیے بلایا تو رام راج کی فوج کے ہاتھوں خود علی عادل شاہ کے ملک کی مسجدیں اور مصاحف بے حرمتی سے نہ بچ سکیں، اور دونوں نذر آتش ہوئیں، حالاں کہ علی عادل شاہ نے معمول کے مطابق بے حرمتی کے حادثے پیش آنے کے خطرہ سے پہلے ہی وعدہ لے لیا تھا کہ کسی موقع پر مساجد و مصاحف کی بے حرمتی نہ کی جائے گی، لیکن موقع کے وقت رام راج اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکا چناں چہ مرقوم ہو کہ

"کفار بیجانگر ... دست بیداد دراز کردہ ... مساجد و معابد سوختند[2] "

اکبر اور جہانگیر کے عہد میں اسلامی معابد و شعائر کی بے حرمتی کا نقشہ دوسری تاریخوں سے

۱؎ تاریخ فیروز شاہی عفیف، ص ۲۶۳، ۲؎ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۶ و ۳۷

قطع نظر کرکے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی میں جا بجا نظر آتا ہے، اور اس سے مغلوں کے اس دور میں اسلامی معابد کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ جاری تھا، . . . . . . اندازہ کیا جا سکتا ہے، مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:-

کفار ہند بے تحاشی ہدم مساجد می نمایند و در آں جا بیعہ برائے خود می سازند۔

. . . . کفار بر ملا مراسم کفر بجا می آرند و مسلمانان در اجرائے اکثر احکام اسلام عاجز اند[1]

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:-

غربت اسلام نزدیک بہ یک قرن بجہے قرار یافتہ است کہ اہل کفر بہ مجرد اجرائے احکام کفر بر بر ملا در بلاد اسلام راضی نمی شوند، می خواہند کہ احکام اسلامیہ بالکلیہ زائل گردند و اثرے از مسلمانان و مسلمانی پیدا نہ شود، کار را تا بآں سرحد رسانیدہ اند کہ اگر مسلمان از شعائر اسلام اظہار نماید بقتل می رسد[2]۔

ایسے ہی زمانہ کے بعد عالمگیر کی شاہزادگی کا زمانہ شروع ہوتا ہے، جس کے متعلق سرجدو ناتھ سرکار فرماتے ہیں کہ اس نے شاہزادگی کے زمانہ سے مندروں کے انہدام کی مشق شروع کردی تھی لیکن جو واقعات اوپر نقل کیے گئے، ان سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں عبادت گاہوں کے احترام کے متعلق دو متحارب قوموں کا سلوک ایک دوسرے کے ساتھ کس طور و طریق پر قائم تھا، ایسے ہی ماحول میں عالمگیر کی شاہزادگی کا زمانہ گذرا، اور پھر وہ تخت نشین ہوا، اس لیے عام طریق کے مطابق اس کے زمانہ میں بھی بغاوتوں کے انسداد میں بت خانے منہدم کیے گئے، کیوں کہ عالمگیر اپنی مطیع رعایا کی عبادت گاہوں کی حفاظت کا ذمہ دار تھا، نہ کہ باغیوں اور سرکشوں کی، جب باغیوں کے جرم کی سزا میں ان کی جانوں کی قیمت باقی نہ تھی، تو ان کی عبادت گاہوں کا کیوں احترام ہوتا، اگر انہیں اپنی عبادت گاہوں کو بچانا تھا، تو اطاعت کا سر جھکائے رہتے۔

عالمگیر کے عہد میں مندروں کے انہدام کا واقعات

اس لیے جب عالمگیر کے عہد میں بغاوتوں سرکشیوں، اور شورشوں کے حالات

---

[1] مکتوبات امام ربانی ج ۲ ص (۱۶۱) [2] ۔ ۔ ج ۱ ص ۱۰۶

پیش آئے، تو اس عہد کے عام طریق کے مطابق مندروں کے انہدام کے واقعات کا پیش آنا بھی ضروری تھا، سرجدوناتھ سرکار نے اپنی تاریخ میں مندروں کی مسماری کے جو واقعات بیان کیے ہیں، اگر ان سب کو استقصا کے ساتھ دیکھا جائے، تو وہ کسی نہ کسی بغاوت، سرکشی، اور شورش کے نتیجہ میں ثابت ہوں گے، مثلاً سرموصوف نے سب سے پہلے اورنگ زیب کی شاہزادگی کی "مشق" دکھانے کے لیے مرات احمدی کے حوالہ سے چنتامن مندر کے مسمار کیے جانے کا ذکر کیا ہی، جو سرش پور میں واقع تھا، اور ستیا داس جوہری کا تعمیر کردہ تھا[۱۵۱]، اب یہ دیکھا جا سکتا ہی، کہ اورنگ زیب ۱۰۵۵ھ میں گجرات کا والی بن کر وہاں گیا، اور ۱۰۵۶ھ میں ایک دوسرے اہم منصب پر بھیج دیا گیا، عبدالحمید لاہوری اور صاحب مراۃ احمدی لکھتے ہیں، کہ گجرات میں اورنگ زیب کا یہ پورا زمانہ یہاں کے سرکشوں کو زیر کرنے میں گذرا اور اس کے اہتمام میں اس کو مزید فوج رکھنی پڑی، غیر معمولی انہماک سے اس نے سرکشوں کو زیر کیا، اور شہنشاہ سے خراج تحسین وصول کیا[۱۵۲]، اس لیے قدرۃً یہی سمجھا جائے گا، کہ اس مندر کی بربادی بھی ان ہی بغاوتوں کے زیر اثر عمل میں آئی، بلکہ اس موقع پر نہ صرف ایک مندر بلکہ کئی مندر مسمار کیے گئے، جیسا کہ مراۃ احمدی میں عالمگیر کے فرمان مورخہ ۲۲ جمادی الاول ۸ جلوس مطابق ۲۰ نومبر ۱۶۶۵ء سے آشکارا ہی[۱۵۳]، لیکن سرموصوف نے اس فرمان کو علیحدہ حیثیت سے جگہ دیا ہی، اور بت خانوں کے انہدام کے واقعات میں اضافہ کیا ہی[۱۵۴]، حالاں کہ اس فرمان میں گجرات کے باغیوں کے ان ہی مندروں کا ذکر ہی، جو گجرات کی صوبہ داری کے زمانہ میں اس نے مسمار کرائے تھے، اور جن کو وہاں کے باشندوں نے دوبارہ تعمیر کرکے پوجا شروع کر دی تھی، عالمگیر نے اس فرمان کے ذریعہ ان ہی مندروں کو دوبارہ مسمار کرایا، چنانچہ مذکور ہی:-

دہم چنیں بعضے از ساکنان محال مرقوم بت خانہا را کہ پیش از جلوس والا

---

۱۵۱ تاریخ اورنگ زیب ج ۳ ص ۲۸۰، ۱۵۲ بادشاہ نامہ ملا عبدالحمید ج ۲ ص ۴۱۱ و ۵۱۰ و مراۃ احمدی ص ۲۳۲، ۱۵۳ مراۃ احمدی ص ۲۷۳ و ۲۷۵، ۱۵۴ تاریخ اورنگ زیب جلد ۳ ص ۲۸۳

بموجب حکم معلی منہدم گردیدہ بود تعمیر نمودہ بتہا در آں گذاشتہ پرستش می نمایند و زنگ بنوا زنا مشروع می گردند، لہذا حکم جہاں مطاع لازم الاتباع بہ کرامت صدور می پیوندد کہ ۔۔۔۔۔۔ بت خانہ [illegible] الحال مرمت نمودہ اند منہدم سازند[۵]

سرموصوف نے اورنگ زیب کی شاہزادگی کی مشق میں بعض [illegible] ہی کے یہ واقعات پیش کیے ہیں جن کی حقیقت اوپر پیش کی گئی، اسی طرح اگر ان کے تمام [illegible] کیے ہوئے حوالوں پر جو عالمگیر کے دورحکومت سے متعلق ہیں، نظر ڈالی جائے۔ تو یہی قسم کے واقعات آشکار ہوں گے لیکن یہ سطریں غیر ضروری طول پکڑ جائیں گی، صحیح نتیجہ پر پہونچنے کے لیے عمومی طور پر صرف یہ دیکھ لینا کافی ہے، کہ عالمگیر کے عہد میں مندروں کے انہدام کے زیادہ تر واقعات جودھ پور اودے پور اور کھنڈیلہ وغیرہ میں پیش آئے، اور یہی مقامات اس زمانہ میں بغاوتوں کے اہم مرکز بنے ہوئے تھے،

پرانے ہندو معابد کا وجود اور ان پر عالمگیر کے اوقاف

ورنہ اس کے ممالک محروسہ کے وہ علاقے جو اس کی اطاعت میں رہتے تھے، اور بہ حیثیت رعایا ان کی جان و مال اور معابد کی حرمت برقرار رکھنا اس پر فرض تھا، اس نے بہ حسن وخوبی اس فرض کو انجام دیا، اس سلسلہ میں دکن کی واضح مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ کہ وہاں ۳۵ سال عالمگیر نے حکمرانی کی، لیکن کبھی کسی ایک بت خانہ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا، اور عہد قدیم سے اس وقت تک الورہ وغیرہ کی نادر یادگاریں موجود ہیں، پھر مختلف مقاموں پر ایسے قرائن ایسے پائے جاتے ہیں، جن سے اس نے مطیع ہندو رعایا کے مندروں پر بڑی بڑی جاگیریں وقف کی ہیں۔ [illegible] بودھ گیا کے متعلق ایک فرمان کی عکسی تصویر گیا کے [illegible] سامنے آچکی ہے، اور اس فرمان کی اصل مہنت بودھ گیا کے پاس محفوظ ہے، اور راقم سطور کی نگاہ سے گذر چکی ہے، اسی طرح عالمگیر کی وہ وقف کی ہوئی جاگیریں آج بھی اسی مندر کے قبضہ میں باقی ہیں، اسی قسم

---

۵ مرات احمدی ۲۸۲ و ۲۸۴،

دوسرا فرمان جو بنارس سے متعلق ہے، رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل میں چھپ چکا ہے، اور اب بھی بہ کثرت پرانے ہندو معابد میں موجود ہیں،

اسلامی حکومت کے حدود میں بت خانے۔

(ج) مندروں کے انہدام کے سلسلہ میں تیسری بات یہ یاد رکھنے کی ہے، کہ اسلامی قانون کے رو سے اسلامی حکومت کے حدود میں جہاں کسی نئے بت خانہ کی تعمیر قانوناً ممنوع ہے وہاں صلح و امن کے قیام کے بعد رعایا کے معتقدات سے تعرض کرنا بھی اسلام کے قانون کے خلاف ہے، اور انھیں اپنے گھروں میں یا پہلے سے بنے ہوئے معبدوں میں اپنے طریق پر عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے، اور غیر مسلموں کی جو عبادت گاہیں اسلامی فتح سے پہلے کی تعمیر کی ہوئی ہوں، ان کو ان کے حال پر باقی رکھنا اور ان عبادت گاہوں کے مخالفوں کے ہاتھوں سے ان کا بچانا، اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے، اسلام کے دور اول میں عہد فاروقی میں شام و عراق کی فتوحات میں اس کی بکثرت مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں، اور خود ہندوستان میں سندھ و ملتان کی عربی حکومتوں کے عہد میں پورے احترام سے یہ معابد قائم رہے،

اسی کے ساتھ دوسری طرف کسی اسلامی حکومت میں اگر کسی غیر مسلم کی کوئی نئی عبادت گاہ بغیر اجازت تعمیر ہوگی تو اسلامی قانون کے مطابق وہ منہدم کر دی جائے گی، کیوں کہ جو قومیں اسلامی حکومت کو قبول کر لیں گی، انھیں اسلامی قانون کے مطابق ہی مسلمان حکمراں سے اپنے تعلقات قائم کرنے ہوں گے، اور قوانین کی پابندی کرنی ہوگی، اسی بنا پر عالمگیر کے عہد میں بھی بعض ایسے مندر ڈھا دیے گئے، جو اس قانون کی زد میں آ گئے تھے، چناں چہ عالمگیر کے عہد میں جو بت خانے مسمار کیے گئے، ان میں سے اکثر موقعوں پر ان کے "نو احداث" ہونے کی تصریح موجود ہے، اور اس قانون اسلامی پر عمل در آمد صرف بدنام عالمگیر کے عہد ہی میں نہ تھا، بلکہ شاہ جہاں تک کے عہد میں موجود تھا، جس کے متعلق ہمارے غیر مسلم مورخین بھی حسن ظن رکھتے ہیں، چناں چہ منتخب اللباب خوافی خان میں سنہ ۱۰۴۲ھ کے واقعات کے ضمن میں مذکور ہے:-

"از واقعہ صوبہ بہار بعرض رسید کہ ہفتاد و شش بت خانہ نو احداث مسمار و مصالح بنا مساجد شد[۱]"

---

(۱) منتخب اللباب جلد ۱ ص ۴۷۲

عالمگیر کے عہد میں پرانے مندروں کا احترام

پھر بھی ذکر کیے جانے کے لائق ہو کہ عالمگیر کے عہد میں اگر ایک طرف بعض نئے مندر ڈھائے گئے، تو دوسری طرف اس نے پرانے مندروں اور ان کے پرانے پروہتوں کے حقوق کی حفاظت کے بھی فرمان جاری کیے، چنانچہ ۱۵ جمادی الآخری ۱۰۶۹ھ کو بنارس کے ناظم ابوالحسن کے نام اس نے ایک فرمان جاری کیا تھا جس کی عکسی تصویر کا مرڈیہ (کلکتہ) ریویو میں شائع ہوئی تھی[۱]، نیز کرنل ڈی سی فلٹ نے بھی انگلستان سے اس کو شائع کیا، اور اس کا ذکر سرموصوف نے بھی اپنی تاریخ میں کیا ہو[۲]، اس فرمان میں وہ بتصریح لکھتا ہو:-

شریعت غرا کے مقدس قانون کے مطابق کوئی نئے مندر نہیں بنائے جا سکتے مگر پرانے مندروں کو توڑا بھی نہیں جا سکتا، ہمارے گوش گذار یہ خبر ہوئی ہو کہ بعض عمال از راہ جبر و تعدی قصبہ بنارس اور اس کے آس پاس کے دوسرے مقامات کے ہندوؤں اور برہمنوں پر جو قدیم بت خانوں کے پروہت ہیں، تشدد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ برہمنوں کو ان کی پروہتی سے الگ کر دیں، جس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، کہ یہ بیچارے پریشان ہو کر مصیبت میں مبتلا ہو جائیں، اس لیے تم ابوالحسن کو حکم دیا جاتا ہو، کہ اس فرمان کے پہنچتے ہی ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص تمھارے علاقہ کے برہمنوں اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے، اور ان کی تشویش کا باعث نہ ہو، تاکہ یہ جماعت بدستور سابق اپنی اپنی جگہ پر اور اپنے منصبوں پر قائم رہ کر اطمینان قلب کے ساتھ ہماری دولت خداداد کے حق میں مصروف دعا رہے، اس باب میں تاکید تقریر جانو[۳]۔

جس عالمگیر کے قلم سے یہ فرمان صادر ہوا ہو، اس کے متعلق یہ باور کرانا کتنا ظلم ہو، کہ اس نے تمام ناظموں کو علی الاطلاق حکم دے دیا، کہ سب مندر ڈھا دیے جائیں، اور ان کے سب مدرسے بند کر دیے جائیں،

---

[۱] تاریخ ہند (ہاشمی) جلد ۳ ص ۱۵۴، [۲] تاریخ اورنگ زیب (سرکار) ج ۳ ص ۲۸۰،
[۳] مضامین عالمگیر (مولانا شبلی) ص ۲۰،

مولانا شبلی کا شکوہ مؤلف مآثر عالمگیری سے

۳۔ سر جدو ناتھ سرکار فرماتے ہیں، کہ مولانا شبلی نے اس کی کوئی وجہ نہیں لکھی، کہ کیوں اورنگ زیب کے عہد کی ایسی سرکاری تاریخ کو قابل یقین نہ سمجھا جائے، مولانا شبلی مرحوم نے تو خود اعتراف کیا ہے، کہ عالمگیر نامہ کا مسودہ خود عالمگیر کو دکھالیا جاتا تھا، اور مآثر عالمگیری مستعد خاں ساقی کی تصنیف ہے، جو عالمگیر کا عہدہ دار تھا، اور دس برس اول کے حالات اوس نے صرف عالمگیر نامہ کے حوالہ سے لکھے ہیں، اور اسی کو مختصر کر دیا ہے[۹] البتہ مولانا مرحوم کو اس مورخ سے یہ شکوہ ضرور ہے، کہ اس نے ۱۰۷۹ھ کے اس زیر بحث فرمان کو جس میں ناظموں کو مندروں کے ڈھانے کا حکم دیا گیا ہے، ایسے عمومی الفاظ میں لکھا ہے، کہ بظاہر دھوکا ہوتا ہے کہ عمومیت کے ساتھ پوری سلطنت مغلیہ کے ہندوؤں کو مدرسوں اور مندروں کو ڈھانے کا حکم دیا گیا، اگرچہ اس مورخ کی لکھی ہوئی عبارت کے پڑھنے کے بعد یہ آشکارا ہو جاتا ہے کہ کن وجوہ سے یہ حکم دیا گیا تھا اور اس کی کیا غرض تھی۔"

اب سر جدو ناتھ سرکار جیسے فاضل روزگار مورخ کے مکتوب بالا میں بیچ سے اسی عبارت کو ثبوت میں پیش کرتے دیکھ کر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس مورخ سے مولانائے مرحوم کا یہ شکوہ، شکوۂ بیجا تھا۔

(ستمبر ۱۹۴۳ء)

تکملۂ بحث

مذکورۂ بالا مقالہ کے شائع ہونے کے تقریباً چار سال کے بعد آل انڈیا ہسٹری کانگرس کے سالانہ اجلاس میں بعض مورخین کی طرف اس سے موضوع کا ذکر دوبارہ چھیڑا گیا اور معارف ماہ فروری ۱۹۴۷ء کے شذرات میں راقم سطور نے اس پر تبصرہ کیا، مناسب ہے کہ اس مقالہ کے تکملہ کے طور پر اس کو بھی ذیل میں پیش کر دیا جائے، اس میں لکھا گیا۔

پچھلے دسمبر کے مہینے میں آل انڈیا ہسٹری کانگریس کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا جس کی سرزمین مظلومیوں کی ... [illegible] ... وقت تک لالہ زار تھی، ضرورت تھی کہ اس مناسبت سے اس میں تاریخ کے ایسے مناظر ... [illegible] ... ایک دوسرے سے نفرت کرنے والوں کو باہم ملاتے، اور وہ تاریخ کے آئینہ میں اپنے اسلاف کی صورتیں دیکھ سکتے کہ وہ کیسی شیر و شکر کی زندگی گذار چکے ہیں اور اس دیس میں اچھے پڑوسیوں کی طرح مل جل کر رہ چکے ہیں، لیکن افسوس کہ اس اجلاس میں نہ

---

[۹] مضامین عالمگیر (مولانا شبلی)، ص ۷۶،

صرف زندگی کے ان اعلیٰ اخلاقی تصورات کو فراموش رکھا گیا، بلکہ ایک سے زیادہ مقررین اس موقع پر بھی اسی بدنام عالمگیر کی "ہندو کشی و ستمگری" کے پامال افسانہ کو دہرائے بغیر نہ رہ سکے،

عالمگیر کے قدیم محسن

ادھر چند سال کے اندر افسانہ کی یاد تازہ کرنے کا سہرا عالمگیر کے قدیم محسن سر جدوناتھ سرکار کے سر ہے، ناظرین کو یاد ہوگا کہ سنہ ۳۲ء میں حکومت بنگال کے محکمۂ تعلیم نے تاریخ کی درسی کتابوں کی چھان بین کا ارادہ کیا تھا، اس سلسلہ میں عالمگیر کے دور میں مندروں کے انہدام کی پارینہ داستان بھی زیر بحث آئی تھی اور ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم نے اس موضوع کے ماہر سر موصوف کی طرف رجوع کیا تھا، موصوف نے جواب میں محمد ساقی کی مآثر عالمگیری کی ایک عبارت اخذ کر کے دکھایا تھا، کہ عالمگیر نے سنہ ۶۹ء میں ملک کے سب صوبوں میں مندروں کے ڈھانے کا حکم علی الاطلاق بھیجا تھا، حکومت بنگال نے اس مراسلہ کو دار المصنفین میں بھیجا تھا، اور راقم سطور کو اس کا جوابی مراسلہ بھیجنے کا موقع ملا تھا، جس میں مآثر عالمگیری سے اس موقع کی پوری عبارت اخذ کر کے دکھایا گیا تھا کہ سر موصوف نے بیچ کی ایک عبارت کو لے کر اپنا مدعا ثابت کرنا چاہا، جو عبارت درحقیقت اس فرمان کا تعلق ٹھٹھہ، ملتان اور خصوصاً بنارس کے چند ایسے مندروں سے ہے جو اس زمانہ میں فتنہ و فساد کا مرکز بنے ہوئے تھے، اور جن میں مسلمان بچوں کو لے جا کر پوتھی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ نہ یہ کہ وہ کوئی علی الاطلاق عالمگیری فرمان تھا، یہ مراسلات مقالہ کی صورت میں معارف ماہ ستمبر سنہ ۳۲ء میں شائع کر دیے گئے تھے،

سر جدوناتھ سرکار کے دعوے سے رجوع

ہسٹری کانگریس کے اجلاس پٹنہ میں ڈاکٹر پرماتما سرن نے اپنا خطبہ دیا ہے جو لیڈر (مورخہ ۲ جنوری سنہ ۴۷ء) میں "ہندوستان کی تاریخ میں عہد وسطیٰ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس میں عالمگیر کی "رجعت پسندانہ و تنزل پذیر سیاسی حکمت عملی" اور ہندوؤں کے ساتھ اس کی انتہائی غفلت شعاری کو دل کھول کر بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:-

> دوسری یہ بات بھی علم میں لے آنی ہے کہ بعض اہل قلم کی طرف سے چند حقیقتیں ابھی روشنی میں لائی گئی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چند اہم مراکز جیسے بنارس کے مندر تھے، ہندوؤں کی طرف سے مفسدانہ سازشوں کے اڈوں کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے، جو [illegible] خلاف

شہنشاہ نے اشتعال میں عملی اقدام کیا اور اس کو اب اس کے تعصب کی شہادت میں پیش کیا جاتا ہے،

لیکن یہ بات فراموش نہیں کی جا سکتی کہ ان مندروں کے بے رحمانہ انہدام کی کوئی توجیہ مشکل سے کی جا سکتی ہے جن کو شہنشاہ نے شاہزادگی ہی کے زمانہ میں ڈھایا تھا، اور اسی طرح مختلف قسم کے تعزیری اقدامات وہ ہندوؤں کے خلاف کرتا رہا، اور پھر کیا یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ضروری اور قرین دانش مندی تھا کہ آدمیوں کے ایک گروہ کے عصیان کی سزا ان مقدس آثار پر اتاری جائے، جو پورے ملک کی ایک عظیم اکثریت کی عقیدت وارادت گاہ تھے، کیا ہندوؤں کے مذہبی احساسات کو مجروح کیے بغیر ان باغیانہ مجرمین کو کسی اور طرح بندش میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔"

خوشی کی بات ہے کہ اس تحریر میں سر جدوناتھ سرکار کے اس دعویٰ سے تو رجوع کر لیا گیا جو انھوں نے ۱۶۶۹ء کے اس فرمان کو پورے ملک کے مندروں کے انہدام کے لیے حکم عمومی کے طور پر قرار دے دیا تھا، پھر اگر "عظیم اکثریت" کے افراد ان عمارتوں کی تقدیس کو برقرار رکھنا چاہتے تو ان مجرموں کو اجازت نہ دیتے کہ وہ ان کو مفاسد کا مرکز بنائیں ایسے موقع پر اس زمانہ میں جس کی بھی حکومت ہوتی، وہ ایسے مرکزوں کو اس زمانہ کی عام روش کے مطابق برباد کرنے کی کوشش کرتا اس معاملہ میں عالمگیر کے پیش رو حکمرانوں اور عالمگیر کے طرز عمل میں کوئی فرق نہ تھا، کہ عالمگیر کو خاص طور پر مطعون کیا جائے،

شاہزادگی کے زمانہ کے انہدامات

عالمگیر کی شاہزادگی کے انہداموں کو ایک سے زیادہ مرتبہ نمایاں کیا جا چکا ہے مگر نکتہ چیں یہ نہیں سوچتے کہ اگر یہ کسی مہذب حکومت کے لیے داغ ہے تو اس کے عہد حکومت شاہ جہاں کا دامن داغ دار ہوتا ہے، عالمگیر نے شاہزادگی کے زمانہ میں گجرات کے مندر ڈھائے تھے، ان میں سے ہر واقعہ کی تحلیل کی جا چکی ہے اس کی تہ میں کوئی نہ کوئی بغاوت، شورش اور سرکشی پائی گئی ہے، آخر دکن کی واضح مثال بھی تو موجود ہے، عالمگیر نے وہاں ۲۵ سال زندگی گزاری، دکن قدیم ہند کی تہذیب، کلچر اور تعمیر کا گہوارہ ہے، اگر تعصب کی وہ آگ جس کی تپش ہمارے زمانہ کے مورخین اب تک محسوس کرتے ہیں عالمگیر کے دل میں واقعی سلگتی ہوتی تو آج دکن میں قدیم ہندو تہذیب و تمدن کے آثار کا نشان باقی نہ رہتا، وہاں کی ساری

پرانی عبادت گاہیں جو آج ہند و تعمیر کی جان سمجھی جاتی ہیں، صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہوتیں، لیکن معلوم ہو کہ عالمگیر نے دکن کے ۲۵ سالہ دورِ حکومت میں کبھی کسی مندر کو ہاتھ نہیں لگایا، رعایا پُرامن رہی وہ بھی امن سے حکومت کرتا رہا، معارف کے مذکورۂ بالا مقالہ میں ان امور کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ہندو مسلم رشتۂ اتحاد کا ایک انمول موتی

اس صوبہ میں جہاں حال ہی میں کانگریس کا تازہ اجلاس منعقد ہوا، دور دور سے آئے ہوئے مورخین صوبہ کے ایک عظیم الشان معبد میں ہندو مسلم رشتۂ اتحاد کو درخشاں کرنے والے ایک انمول موتی کی زیارت بھی کر سکتے تھے جو اسی بدنام عالمگیر کے ہاتھوں وہاں ودیعت دیکھا گیا ہے اور جس کو بودھ گیا مندر کا پروہت عقیدت کے ساتھ سینے سے لگائے ہے، یہ ہے ایشیائی معبد کی سندِ جاگیر جو لاکھوں لاکھ کی مالیت ہے، اور جس سے آج لاکھوں لاکھ جائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہی عالمگیر کے ہاتھوں رہینِ منت ہے، اس کا ذکر معارف کے اس مقالہ میں بھی آیا ہے،

حقیقت کی ایک کرن

بہرحال خوشی کی بات ہے کہ عالمگیر کے کارناموں کو گھٹا ٹوپ اندھیاری میں چھپانے کی ہزاروں کوششوں کے باوجود حقیقت کی کرن کہیں کہیں چمکنے لگی ہے، دورِ حاضر کے مورخین کے خیالات کی رو میں اس روشنی کی ہلکی سی جھلک دکھائی دینے لگی ہے، شاید جب تعصبوں کی یاد کا زمانہ گذر جائے تو تاریکیوں کے پردے پورے طور پر چاک ہو جائیں، ڈاکٹر ریپا تما سرن موصوف نے ان عجیب جھوٹوں اور نکتہ چینیوں کے باوجود اس مقالہ کے آخر میں کچھ اعترافات بھی کیے ہیں، وہ ستایش کے مستحق ہیں،

فرماتے ہیں:-

> دورِ حاضر میں یہ دکھلانے کی کوششیں کی گئی ہیں کہ اورنگ زیب ہندوؤں کے حق میں نہایت اعتدال پسند تھا، ایسے فرامین کی ایک خاصی تعداد منظرِ عام پر لائی گئی ہے جس میں عالمگیر نے برہمنوں کو عطیے دیے، اور مندروں پر جاگیریں وقف کی ہیں … قدیم یورپی اذان کا اتباع کرنے والے ہندوستانی مورخین کے وہ نقوش و تاثرات ناپسندیدہ ہیں جو انھوں نے اورنگ زیب کے عہدِ حکومت کے متعلق پیدا کیے ہیں، اورنگ زیب کی تاریخ پر ان فرامین

کی اشاعت سے) جو روشنی پڑتی ہے، اس سے یقینی طور پر نہ صرف ان یورپی مورخین کے پیدا کردہ تاثرات کی اصلاح ہوتی ہے، بلکہ یہ بھی آشکارا ہوتا ہے کہ عالمگیر لوگوں کے ساتھ اپنے زمانہ کے طرز عمل اور نظم و نسق میں ایک شریف اور دوسروں کا پاس و لحاظ رکھنے والا انسان تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ کی تاریخ کے متعلق جو غلط نظریے لوگوں میں پھیل گئے ہیں، ان کی تصحیح کی بڑی ضرورت ہے تاکہ مختلف تاریخی پہلوؤں اور سلف کے کارناموں کے متعلق صحیح فیصلے کیے جا سکیں، اور ان غلط فہمیوں کو دور کیا جائے جو پھیلائی گئی ہیں، اور ہماری قومی ترقی کو جو نقصان پہنچانے والی ہیں"

فاضل مقرر کی یہ آرزو در اصل اس وقت پوری ہو سکتی ہے جب غیروں کی مرتب کی ہوئی تاریخ کے پھیلائے ہوئے اس تخیل کو ذہن سے مٹا دیا جائے، کہ مسلم قوم باہر سے آئی ہوئی ہے، اگر باہر سے آنا ہی غیریت ہے، تو اس میں سامی اور آرین دونوں نسلوں کا حال یکساں ہے، آریوں کا آخری قافلہ ہندوستان میں تقریباً سنہ ۴۰۰ ق م میں آیا تھا، اس طرح ہندوؤں کے آخری اور مسلمانوں کے پہلے قافلہ کی آمد کے زمانہ میں صرف ایک ہزار برس سے کچھ بالا کا فرق رہتا ہے، جو قوموں کی تاریخ کے لیے کوئی بڑی مدت نہیں،

(فروری ۴۷ء)

عہد مغلیہ کے مناصب ہفت ہزاری وغیرہ

"ہفت ہزاری، پنج ہزاری، سہ ہزاری، پنجصدی سے کیا مراد ہے، آیا یہ امرا اتنی سپاہ رکھنے کے مجاز تھے یا اتنی تنخواہ ملا کرتی تھی، جو سپاہ ان کے ماتحت ہوا کرتی تھی اس کی تنخواہ کون دیتا تھا،

مناصب کی ابتداء اور ان کا مدعاء

اکبر نے ایک خاص نظام کے ماتحت یہ مناصب قائم کیے تھے، جو اس کے جانشینوں کے عہد میں بھی بہ تغیر یا بلا تغیر قائم رہے، اس نظام کا مدعا فوج میں اصلاح و ترتیب کا پیدا کرنا تھا تعداد سے ان کی ارتقائی ترتیب کو ظاہر کرنا تھا، چنانچہ پنج ہزاری سے اوپر کے مناصب صرف شاہزادوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے، باقی مناصب کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا،

مناصب کے قائم کرنے کا اصول

مناصب کے قائم کرنے کا اصول یہ رکھا گیا کہ منصب کو اعداد محض یا اعداد نسبی سے اور اس کے درجہ کو سواروں کے شمار سے ظاہر کیا جائے، اگر سواروں کا شمار اعداد منصب کے برابر ہے، تو وہ منصب درجہ اول میں شمار کیا جاتا تھا، اگر سواروں کی تعداد اعداد منصب کا نصف یا اس سے زیادہ ہو، تو درجہ دوم، ورنہ درجہ سوم سمجھا جائے گا، مثلاً پنج ہزاری، پنج ہزار سوار، پنج ہزاری چار ہزار سوار، پنج ہزاری دو ہزار سوار، ان میں پنج ہزاری ہر جگہ منصب ہے، اور پانچ چار اور دو ہزار سوار کی قید منصب کے اول، دوم اور سوم درجہ کو ظاہر کرتی ہے، اگر کوئی اپنے منصب کی فوج خود بہم پہونچاتا تو وہ دو قبضی منصب دار ہوتا تھا، اگر وہ کسی منصب دار کی فوج کے کسی حصہ کی سرداری پر مامور ہوتا تھا، تو وہ داخلی منصب دار کہا جاتا تھا، اس کے ساتھ ہر منصب اور اس کے ہر درجہ کی داخلیوں کی تنخواہ کا ضابطہ مقرر تھا، اور "تنخواہ ذات" سے موسوم تھا، اور ہر ایک کی تنخواہ مع دواب شاہی کے مصارف کے حکومت سے اس کو ملتی تھی،

آئین اکبری میں ہے:-

ازیں روئیهان قدیم منصب پایها از ده باشی تا ده هزاری قرار فرموده و افزون
از پنج هزاری خاص فرزندان سعادت سرشت گردانید .. .. .. و گاہے منصب
افزوده سوار کمتر همراه سازد، از کار آگهی هر یکے را اندازه دستوری بگرفت و در
خور سواره دو سواره دگرگونی رفت هر کرا سوار موافق منصب باشد اولین
پایه داد و نیمه و زیاده را دوم و کمتر از آن را سوم ساخت .. ..
و یوزباشی یازده گونه شد نخست آنکه با او صد سوار بود ماهواره هفت
صد روپیه و یازدهم آنکه با او سوارے نبود، چنانچه پیشتر درو عالیان اعتبار
شود بایں صد روپیه مبالغے در هر ده سوار بیست روپیه افزوده
گردد۔[91]

منصب داروں کی قسم تنخواہوں کے اعتبار سے

منصب داروں کی تنخواہوں کے اعتبار سے بھی دو قسم کے تھے بعض بڑے تعلقے کے منتظم ہوتے تھے، اور اپنا اور اپنی فوج کا گذارہ اسی سے وصول کرتے تھے، اور بعضوں کو نقد تنخواہیں ان کے منصب، فوج اور جانوروں کی تعداد کے لحاظ سے دی جاتی تھیں،

اس موضوع پر آئین اکبری میں مختلف آئین کے ماتحت مفصل معلومات ملیں گے اور دیکھیں شمس العلماء مولوی عبدالرحمن صاحب (دہلی یونیورسٹی) نے ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس ۱۹۳۳ء میں "مناصب اکبری اور ان کی تنخواہیں" کے عنوان سے مضمون پڑھا تھا جو اس کی روداد میں چھپ چکا ہے[92]، اس مضمون سے اس موضوع کی تفصیلات معلوم ہو سکیں گی،

(جون ۱۹۴۳ء)

---

[91] آئین اکبری ج ۱ ص ۱۲۳، ۱۲۴، [92] روداد ادارہ معارف اسلامیہ ج ۱ ص ۲۶۲۔ ۲۶۷۔

ہر موضع کے لیے علیحدہ علیحدہ دفتر اور ان کے عہدہ دار تھے، جو معلومات کی مفصل روداد رکھتے تھے[1] اور اگر ایک فصل میں اگر بقایا رہ جاتا، تو اس کا اندراج دفتر میں کر لیتے، اور اس کے گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں کے دستخط لے لیتے، اور دوسری فصل کے موقع پر بقایا بھی وصول کرتے تھے[2]

اکبر نے پورے ہندوستان کی زمین کی پیمایش کر کے ان کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا تھا، اور ہر مقام کی آراضی کے لحاظ سے مال گذاری کی تشخیص کرائی تھی، اور پہلی مرتبہ یہ دہ سالہ بندوبست قرار پایا تھا، لیکن عملاً یہی بندوبست تقریباً ۳۰ سال تک قائم رہا، زمین اپنی مختلف حیثیتوں سے خالصہ جاگیری، اور معافی میں تقسیم تھی، اسی لحاظ سے ان سے مال گذاریاں وصول ہوتی تھیں[3]،

(۲۳ جون ۱۹۳۶ء)

---

[1] آئین اکبری ج ۱ ص ۱۹۹، [2] آئین اکبری ج ۱ ص ۲۰۰، [3] بنگال کی ابتدائی تاریخ مال گذاری باب مغلوں کا بندوبست، ماخوذ از ترجمہ اردو ص ۱۶

ہندوستان کے عہد اسلامی میں زکوٰۃ کا نظام

(جناب شیخ عطاء اللہ ایم اے استاذ شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے استفسار فرمایا تھا کہ میں نے العشر والزکوٰۃ پر معارف میں آپ کا مبسوط مقالہ پڑھا۔

درخواست ہے کہ ازراہ کرم مجھے تاریخ ہند کی کسی کتاب کا حوالہ دیجئے، جس سے آپ کے اس دعویٰ کی تصدیق ہوسکے، کہ ہندوستان کے عہد اسلامی میں عملی نظام زکوٰۃ قائم تھا، اور نیز بیت المال کی آمدنی سے متعلق کچھ معلومات ہوسکیں، امید ہے کہ آپ اس مسئلہ کے سمجھنے میں میری اعانت فرمادیں گے،

اس کے جواب میں عرض کیا گیا ہے۔

ہندوستان کے عہد اسلامی میں زکوٰۃ کے نظام قائم رہنے کا تذکرہ اس عہد کی تاریخوں میں عمومی طور پر مل سکتا ہے جس سے اندازہ ہوسکے گا، کہ عہد اسلامی کے مختلف دوروں میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول اور اس آمدنی کے مصارف کا طریقہ شرعی احکام کے بموجب قائم رکھا گیا،

اس سلسلہ میں پہلے یہ بات ذہن نشین رکھی جائے، تو حقیقت کے سمجھنے میں آسانی ہوگی، کہ ان اسلامی حکومتوں میں جو عہد وسطیٰ میں مشرق و مغرب میں قائم رہی ہیں، ان کے مالی نظام میں دو عملی طریق کار جاری ہوگیا تھا، ایک طرف وہ شرع کی پابندی کے لیے زکوٰۃ کے نظام کو قائم رکھتی تھیں، اور دوسری طرف مختلف سلاطین اپنی حکومت کے استحکام اور شاہی مصارف ملکی مہمات اور فوجی ضروریات کے لیے اور دوسرے ٹیکس بھی وصول کرتے تھے، اس طرح زکوٰۃ کی آمدنی و مصارف کی حیثیت ایک قسم سے دینی سرمایہ کی ہوگئی تھی، حالانکہ اگر یہ سلاطین دین کے ماہرین اور ارباب حل وعقد کے مشوروں سے اپنی حکومت کے اقتصادی نظام کو قائم کرتے، تو انھیں اس دو عملی طریق کار کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، چنانچہ بعض دیندار سلاطین وہ ولاۃ نے اپنی اور بعض دوسرے ملکوں میں بھی، ایک زمانہ میں خالص دینی نظام مالیات کو برقرار رکھ کر کامیابی سے حکومت کی، اور انھیں دوسرے ٹیکسوں کے

لگانے کی ضرورت نہ پڑی۔

ہندوستان کے عہد اسلامی میں بھی حکومت کے مالی نظام میں بھی صورتِ حال نظر آتی ہے، مختلف زمانوں میں بھی یہاں کی حکومتوں کے مالی نظام میں زکوٰۃ کا نظام قائم رہا، اگر اس عہد کی تاریخوں کو استقصا سے دیکھا جائے، تو مختلف دوروں کی تفصیلات سامنے آسکتی ہیں، ذیل میں ارشاد گرامی کی تعمیل میں چند سرسری حوالے پیش ہیں،

ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی حکومت سندھ میں قائم ہوئی، یہ حکومت ابتداً خالص اسلامی اصولوں پر قائم تھی، اس لیے شریعت کے مطابق مسلمانوں سے صدقہ و زکوٰۃ اور نامسلمانوں سے جزیہ کی رقم وصول کی جاتی تھی، اسی طرح انہیں کی پیداوار میں مسلمانوں سے دسواں حصہ اور نامسلمانوں سے مقررہ خراج وصول کیا جاتا تھا، چچ نامہ میں ہے:۔

> ان میں جو مسلمان ہو گئے تھے وہ غلامی اور جزیہ سے آزاد رہے، اور جو اپنے مذہب پر قائم رہے ان کے تین درجے قائم کیے گئے اعلیٰ طبقہ یعنی دولت مندوں سے ۴۸ درم متوسط لوگوں سے ۲۴ درم اور نیچے طبقہ سے ۱۲ درم تھے، جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا وہ اس سے معاف کیے گئے اور جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے انھوں نے جزیہ دیا، لیکن ان کی زمینیں اور ان سے جائدادیں نہیں لی گئیں بلکہ علیٰ حالہٖ ان ہی کے قبضہ میں رہنے دی گئیں[1]

موجودہ زمانہ میں ایک درہم ساڑھے تین آنہ کے برابر ہے، اس طرح دولت مندوں سے دس روپے متوسطوں سے پانچ اور غریبوں سے ڈھائی روپے سالانہ کے حساب سے وصول کیا جاتا تھا، اور عورتیں، بچے، بوڑھے، مذہبی عہدہ دار، پجاری، اور نہ کمانے والے معذورین مستثنیٰ تھے، مسلمانوں سے جزیہ کے بجائے ڈھائی روپیہ سیکڑہ زکوٰۃ اور انہیں کی پیداوار میں دسواں اور نامسلمانوں سے مقررہ خراج وصول ہوتا تھا،

پھر دوسرے آنے والے فاتحین نے جو حکومتیں قائم کیں، ان میں سے فیروز شاہی دور کے متعلق تو صریح ملتی ہے کہ اس میں رعایا کے درمیان مسلم ذمّی، مالی اور دوسری طرف حربی کی تقسیم و اصطلاح قائم تھی جس کی صراحۃً تفصیلات ملتی ہیں:۔

---

[1] چچ نامہ، ایضاً، ص ۱۸۴،

"واہل کفر از طائفہ ذمیاں وامانیاں زیر سایہ چتر فیروز شاہی از رعیت بادشاہی برفاہیت می گذرانیدند، واہل دار حرب را ہر سال نہب تاراج می کردند"[۱ھ]

اس دور کے متعلق یہ تصریح معلوم ہو کہ اس میں زکوٰۃ کا نظام قائم تھا، لیکن سلطان کے فوجی مہول میں مصروف رہنے کی وجہ سے حکومت کے نظام میں ابتری پیدا ہوگئی تھی، جب اس نے سلطنت کی اصلاحات کی طرف توجہ کی، اور خصوصاً مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی سے جو نقصانات متصور ہوئے، اور سامنے آئے، ان میں ذیل کی دو باتیں تھیں،

"دوم آن ست کہ اموال بیت المال برائے آن جمع می کنند تا قوت در اسلام زیادت گردد و آں کہ بیت المال خرج کنند و برائے قتل مسلمان روند"

"ششم آن ست اموال باطل و نامشروع در بیت المال جمع می شود"[۲ھ]

اسی طرح اسلامی ملکوں کے مالی نظام میں دو عملی طریق کا رکے جاری ہونے کا جو تذکرہ اوپر گذرا، وہی طریقہ اس دور میں ہندوستان میں جاری تھا، فیروز شاہ نے اس کو ختم کرنا چاہا، اور ان تمام ٹیکسوں اور محصولوں کو جو غیر شرعی طریق سے وصول کیے جاتے تھے، معاف کر دیا، اور حکومت کے مالی نظام کو خالص شرعی حدود میں لانا چاہا، شمس سراج عفیف لکھتا ہو،

"سلطان فیروز شاہ بعنایت الہ و حمایت اللہ انچہ در بلاد ممالک نامشروعات بود برخلاف شرع ردی می نمود بتمام از محصول بلاد مملکت دور کنانید، وآں مقدار روشہا کہ در قسم لکی وضع بود وآں روشہا مخالف شرع می نمود بہر را منع گردانید

اس کے بعد علماء نے نامشروع محصولوں کی فہرست تیار کی، اور فیروز شاہ نے ان سب کو موقوف کر دیا، لکھتا ہو:۔

"علمائے درگاہ شہنشاہی از آثار خوف حضرت الٰہی جل جلالہ وعم نوالہ چند چیز از قسم نامشروعات پیش حضرت شہنشاہ ششش جہات باز نمودند کہ در عہد سلاطین ماضیہ وضع کردہ بودند"

یہ خرابیاں دو قسم کی تھیں، ایک تو جائز محصول زکوٰۃ کی وصول میں غیر شرعی طریق اختیار کیا جاتا تھا،

۱ھ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۸۰، ۲ھ تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۵،

دوسرے سرے سے ناروا ٹیکس عائد کیے جاتے تھے، علماء نے ان دونوں کے تدارک کرنے کا مطالبہ پیش کیا تھا، چناں چہ فیروز شاہ نے اُن کے متعلق تحقیقات کرنے کا حکم دیا، پھر شرع کے مطابق اپنے فیصلے صادر کیے، شمس سراج عفیف ان تفصیلات کو لکھ کر آخر میں کہتا ہے،

"الغرض جملہ علمائے باصفا و تمام مشائخ مستثنیٰ و صاحبان دیوان قضا بہ حضرت شاہ طلب شدہ و از ایشان استفتا طلبیدہ، جمیع علماء و مشائخ متفق اللفظ و المعنی فتویٰ دادند و از کتب معتبر روایات راجح بیرون آوردند کہ ستون ایں وجوہات در علم شریعت یکے از مشروعات است چوں علمائے شریعت و مشائخ طریقت فتویٰ بہ حقیقت تحقیق مراد دریں محل حضرت شہنشاہ، حکم فرمود تا ایں جمیع چیزہا دور گردانند،"

اس کے بعد ایک شاہی فرمان تیار کیا گیا جس میں مشروع محصولات کی تفصیل درج تھی اور آخر میں مذکور تھا،

"اگرچہ سلاطین پیشین از سبب مصلحتے ایں چنیں خراجہا گرفتند، و یا پیش ایشاں دستور مشہور مستوریا نزد نمودند چوں از روئے شرع گرفتن ایں چنیں چیزہا جائز نہ بود من در عہد دولت خویش از آثار خوف بیش ایں جمیع چیزہا دور گردانیدم"

اس شاہی فرمان کو سنانے کے لیے شاہی لشکر کے مفتی قاضی نصراللہ ہاتھی پر سوار ہوئے اس کے سننے کے لیے عوام و خواص بڑی تعداد میں یک جا ہوئے، اور غیر معمولی خوشی سے اس فرمان کا خیر مقدم کیا گیا، اس فرمان کے جاری ہونے کے بعد حکومت کی آمدنی میں تیس لاکھ تنکہ کی کمی ہو گئی، یہ محاصل ششتہ میں بند کیے گئے تھے،[۱]

دوسری طرف جو شرعی محصول وصول نہیں کیے جاتے تھے، ان کی وصولی کا حکم جاری کیا، اور غیر معمولی احتجاج کے باوجود منسوخ نہیں کیا، اس سلسلہ میں جزیہ کی وصولی کا خاص اہتمام کیا گیا عفیف لکھتا ہے:۔

"ہم چنیں بیرون شد دین آئین شریعت محمدی از طائفہ زناردارن جزیہ ستدہ"[۲]

اسی طرح اس نے اپنی ذاتی املاک میں بھی شرعی حدود و قیود کا لحاظ رکھا، اور اپنی بنوائی ہوئی نہرو

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۷۶، ۳۷۹، ۳۸۰ [۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۸۲

سے سیرابی کے معاوضہ میں دسواں حصہ وصول کرنا، اور اوسر زمینوں کو آباد کرانا، ان املاک سے دو لاکھ تنکے وصول ہوتے تھے، اور یہ آمدنی بیت المال سے علیحدہ رہتی تھی،[۵۱]

بیت المال کی مجموعی آمدنی اس زمانہ میں کیا تھی، اس کے دریافت کرنے میں کسی قدر وقت صرف ہوگا، افسوس کہ اتنی فرصت نہیں کہ اعداد و شمار یک جا کیے جا سکیں، اگر اس دور کی تاریخوں سے یک جا کیے جائیں تو وہ فراہم ہو سکتے ہیں، مثلاً ایک جگہ باغوں کے محصول کی مجموعی آمدنی کا ذکر آیا ہے، وہ ایک لاکھ اسّی ہزار تنکہ تھی، اسی طرح دو آب کا محصول اسّی لاکھ تنکہ وصول ہوتا تھا، اور دہلی کے جوار سے ۶ کروڑ پچاس لاکھ کی آمدنی تھی، عفیف لکھتا ہے:-

"در عہد دولت آں خسرو جہات ایک لاکھ و ہشتاد ہزار تنکہ حصۂ دیوانی خارج حصۂ املاک باغبانان محصول میان دوآب در آں ایام ہشتاد لاک تنکے بود، ہم چنیں از بیابسے اشتمالات آں طالب دین شش کرد و ہشتاد و پنج لک تنکہ محصول بلاد و ممالک دار الملک دہلی بود"[۵۲]

فیروز شاہ نے زکوٰۃ کے مصارف کو ان کے جائز حدود میں صرف کرنے کا اہتمام بھی رکھا تھا، ۶ لاکھ تنکہ امدادی وظائف میں دیے جاتے تھے، اور چار ہزار چھ سو اشخاص مستقل طور پر وظیفہ یاب تھے، خیرات خانے قائم تھے، اور ناداروں کو ان کی لڑکیوں کی شادی کے مصارف دیے جاتے تھے، نیز عام صدقات و خیرات کا وسیع سلسلہ قائم تھا،[۵۳]

آئین اکبری کی تصریح کے مطابق اکبر کے زمانہ تک ہندوستان میں زمینوں کی تقسیم شرعی اصطلاحوں کے مطابق تھی، اور اسی لحاظ سے ان پر محصول واجب الادا تھا، چنانچہ ابو الفضل نے زمین کی عشری، خراجی اور صلحی قسم اور ان کی نوعیت بیان کی ہے، پھر محصولوں کے لیے جو اصطلاحیں ہیں، ان کو درج کیا ہے، اور ان محصولوں کا بھی ذکر آیا ہے، جن کو سلاطین نے واجب الادا قرار دیا تھا، اور آخر میں بیان کیا ہے، کہ اکبر نے اس نظام کو بدل دیا تھا،[۵۴]

باایں ہمہ بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خراجی و عشری تقسیم اس دور میں بھی کچھ نہ کچھ قائم تھی، چنانچہ ایک جگہ ذکر آیا ہے،

---

۵۱ تاریخ فیروز شاہی ص ۱۴۰، ۵۲ ؍؍ ص ۲۹۶ ۵۳ ؍؍ ص ۳۵۰، ۳۰۹ و ۶۰ ۵۴ آئین اکبری ج ۱ ص ۲۰۴

"ہر کہ از معنی خراجی را نگار دو بجہت علف قرق گرداند از گاو میش شش دانگ گاو سہ دام سالیانہ باز یافت کند" [۵۹]

اس کے بعد جب عالمگیر کا دور آیا، تو فیروز شاہ کے زمانہ کی طرح نئے سرے سے اسلامی احکام کے بموجب حکومت کا نظام مال تیار کیا گیا، مستعد خاں لکھتا ہے،

"جہاں پناہ نے فرمان مبارک صادر فرمایا، کہ تمام ممالک محروسہ میں محاصل موافق احکام شریعت وصول کیے جائیں،

اسی طرح غیر شرعی محاصل کی منسوخی کا اعلان کیا گیا، مآثر عالمگیری میں ہے،

"بادشاہ رعیت نواز نے غلے اور اناج اور وجوہ راہ داری محصول اسباب و دیگر اموال تجارت خاص کر محصول تنباکو جو بے حد کثیر رقم تھی، اور عملہ گرداگیری جس کے وصول کرنے میں تجار کو بے حد تنگ اور پریشان کرتا تھا، خاص کر مسلمانوں کے لیے اور دیگر محاصل مذکورہ کو تمام رعایا کے لیے صاف فرما دیا، اور موروثی مطالبات میں جو رقم مناصب میں سے تنخواہ بھری ہو کر خزانہ سرکار خالصہ میں ہر سال داخل کی جاتی تھی" اور جس کی وجہ سے خزانہ میں سالانہ معقول رقم داخل ہوتی تھی، وہ ایک قلم معاف فرمائی گئی" [۶۰]

اسی طرح کا خیرکا انتظام بھی وسیع پیمانہ پر رکھا گیا تھا جس کی تفصیل اس عہد کی تاریخوں میں عام طور پر ملتی ہے،

امید ہے کہ یہ اشارات ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں نظام زکوٰۃ کو سمجھنے اور اسی سلسلہ میں مزید معلومات فراہم کرنے کے لیے کافی ہوں گے،

(جون سنہ ۱۹۴۵ء)

---

۵۹ آئین اکبری ص ۱۹۹، آئین مالگذاری ۶۰ مآثر عالمگیری ترجمہ اردو ۳۰۷

ہندوستان کے عہد اسلامی کی تعلیمی زندگی

ہندوستان کو غزنی، خراسان، ماوراء النہر، عراق وعجم کے تیغ آزماؤں نے فتح کیا تھا، اسی طرح اس کے دل و دماغ کو ان ہی ملکوں کے ارباب کمال نے اپنا جاگیر بنایا، قطار در قطار علماء ان ملکوں سے ہندوستان آئے، اور ملتان، سندھ، بھکر، لاہور اور سیال کوٹ میں منزلیں کرتے ہندوستان میں اسلام کے دار السلطنت دلی میں آکر ٹھہر گئے، پھر جیسے جیسے اسلام کا قدم پورب کی سمت میں بڑھتا گیا علم کی روشنی کی کرنیں بھی اس علاقہ کو اجاگر کرتی گئیں، اسلام کے علم و فضل کا موکب جب دلی سے نکلا، تو پہلی منزل بدایوں ہوئی، پھر گنگا کے دہانہ پر کٹرہ اس سے لاہوا صوبہ اودھ، پھر آگے بڑھ کر جون پور، ظفر آباد، علم کے مرکز بنے، یہاں تک کہ ایک خطۂ ارض کا نام "پورب" پڑا، جس کی وسعت میں قنوج، بہرائچ، الہ آباد سے لے کر بہار و ترہت تک کا علاقہ داخل تھا، شاہجہاں نے اسی دیار کو "پورب شیراز ماست" کے لقب سے یاد کیا ہے، ہندوستان کے عہد اسلامی کے مختلف دوروں میں یہ سارے کے سارے خطے مسلمانوں کی تعلیمی زندگی کے مراکز بنے رہے،

ہندوستان میں اسلامی تعلیم کی ابتداء

ہندوستان میں اسلامی علوم کی تعلیم پانچویں صدی سے شروع ہوئی، کیوں کہ ہندوستان کی مسلسل اسلامی تاریخ در اصل غزنویہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے، سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۲ھ میں لاہور فتح کیا، اور سلطان مسعود یہاں کا گورنر بنایا گیا، اس کے دامن دولت سے علماء و فضلاء کی جماعت وابستہ تھی، اس کے عہد میں ایک بزرگ شیخ اسماعیل متوفی ۴۴۸ھ لاہور آئے، اور یہاں توطن پذیر ہو گئے، یہ مت اول اسلامی علوم تفسیر و حدیث و فقہ کا ذخیرہ اپنے ساتھ لائے، اور ان کے ذریعہ سے یہاں ان علوم کی اشاعت ہوئی، تذکرہ علمائے ہند میں ہے کہ یہ اکابر محدثین و مفسرین میں سے تھے، یہ پہلے شخص ہیں جو علم حدیث و تفسیر کو لاہور لائے[۵۲]،

---

[۵۱] حیات شبلی ملخصاً، [۵۲] تذکرہ علمائے ہند ۱۹۱۴ء ص ۱۱

ہندوستان میں اسلامی مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت

اس کے بعد ہندوستان میں اسلامی مدرسوں کی عمارتوں کی تعمیر کا زمانہ چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی کے آغاز کے درمیان قرار پاتا ہے،

ہندوستان میں مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت تعمیر ہونے کی جو اطلاع اس وقت تک مل سکی ہے، وہ مولانا قطب الدین کاشانی کے لیے ناصر الدین قباچہ کے ہاتھوں ملتان میں تعمیر ہوئی ہے۔ مولانا قطب الدین کاشانی ماوراء النہر سے ملتان آئے تھے، ناصر الدین قباچہ اس زمانہ میں ملتان کا والی تھا، اس نے ایک سرائے اور اس سے متصل ایک مدرسہ تعمیر کرایا، اور اس میں ان کا درس جاری ہو گیا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (المولود ۵۷۸ھ) کا ابتدائی زمانہ تھا، وہ روزانہ صبح کو اس مدرسہ میں آتے اور صبح کی نماز مولانا کاشانی کے پیچھے ادا کرتے تھے۔[۱]

ہندوستان میں مدرسوں کی تاسیس کا رواج

اسی کے ساتھ تاریخی قدامت کے لحاظ سے اجمیر کے ان مدرسوں کا ذکر کرنا چاہیئے جن کو سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ۵۸۷ھ میں اجمیر فتح کرنے کے بعد وہاں قائم کیا، اس کے بعد ساتویں صدی کے اوائل میں دلی کے دو مدرسوں معزی و ناصری اور اچھ (سندھ) کے مدرسہ فیروزی کا تذکرہ آتا ہے۔

طبقات ناصری کے مصنف قاضی ابو عمر منہاج الدین جوزجانی ساتویں صدی کے اوائل کے ذی علم لوگوں میں گذرے ہیں، وہ عہدۂ قضارت کے علاوہ اپنے علم و فضل کے باعث ایک سے زیادہ مدرسوں کے مہتمم بنائے گئے، وہ ماہ جمادی الاولیٰ ۶۲۴ھ میں خراسان سے سندھ کے مشہور شہر اچھ میں داخل ہوئے اور اسی سال ماہ ذی الحجہ میں مدرسہ فیروزی سے وابستہ ہو گئے،[۲] یہ مدرسہ غالبًا سلطان التمش کے لڑکے رکن الدین فیروز کے نام سے منسوب تھا، جو یہاں کا گورنر گزرا ہے۔ اس کے بعد ماہ شعبان ۶۳۵ھ میں سلطانہ رضیہ نے ایک دوسرے مدرسہ ناصریہ کو ان کے سپرد کیا۔

تیسرے مدرسہ معزیہ کا ذکر دلی میں قرامطہ کی یورش کے سلسلہ میں ملتا ہے کہ یہ بھی سلطان رضیہ کے عہد میں قائم تھا طبقات ناصری میں اس مدرسہ کے دروازے پر قرامطہ

---

[۱] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۰۸ [۲] طبقات ناصری ص ۱۴۴ [۳] ایضًا ص ۱۸۸

کے قتل عام برپا کرنے کا ذکر آیا ہے[1]

ملتان، اجمیر، سندھ، اور دلی کے مدرسوں کے بعد بہار اور بنگال کے اسلامی مدرسوں کا نام آئے گا، چناں چہ بہار و بنگال کے سب سے پہلے مسلمان فاتح بختیار خلجی کے حال میں فرشتہ نے لکھا ہے کہ اس نے ندیا کے بجائے شہر رنگ پور کی بنا ڈالی، اور اس کو دار الحکومت قرار دیا ہے، اور یہاں مسجدیں، خانقاہیں اور مدرسے تعمیر کیے، اور سب پر رونق ہو گئے[2]،

پھر اسی طرح اس دیار کے تمام مفتوحہ شہروں میں والیان شہر نے مسجدیں اور مدرسے تعمیر کرائے، چناں چہ طبقات ناصری میں بختیار خلجی کے حال میں مختلف امرا کے مساجد و مدارس کے بنا ڈالنے کا ذکر آیا ہے[3]،

عہد تغلق میں مدارس کی کثرت

اس اثنا میں ہندوستان کی اسلامی سلطنت میں مدرسوں کے قائم کرنے کا عام رواج ہو چکا تھا، چناں چہ آٹھویں صدی میں محمد تغلق کے عہد حکومت میں صرف دلی میں ایک ہزار مدرسے قائم تھے، قلقشندی صاحب صبح الاعشیٰ دلی کے حال میں لکھتا ہے:-

> یہاں ایک ہزار مدرسے ہیں جن میں سے صرف ایک شافعیوں کا ہے، اور باقی حنفیوں کے لیے اور یہاں تقریباً ۷۰ بیمارستان ہیں، جو یہاں دار الشفا کہے جاتے ہیں[4]

فیروز شاہ کے عہد میں تعلیمی ترقیاں

محمد تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق نے مدرسوں کی بنا و تاسیس و تعمیر پر بڑی توجہ کی، پرانے مدرسوں کی عمارتوں کی تجدید کی، اور نئیں نئے مدرسے قائم کیے، اور علما و طلبہ کے وظائف جاری کیے، اس نے اجمال کے ساتھ اپنی فتوحات فیروز شاہی میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اور فرشتہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے، ان مدرسوں کے مصارف کے لیے جائدادیں وقف کر دی تھیں، اور ان مدارس کے متوسلین کے لیے وظائف مقرر تھے[5]،

ضیاء الدین برنی نے اس کی تعلیمی فیاضیوں اور خدمتوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

> و ادرارات و انعامات و وظائف علما و مشائخ و مدرساں و مفتیان و مذکران

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۵۹ ... [2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۹۲، [3] طبقات ناصری ص ۱۵۱ [4] صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۶۹ [5] فرشتہ ج ۲ ص ۱۵۱

ومتعلمان وحافظان ومقربان (مقریان؟) وارباب مساجد وآستانہ واداران وحیدریان
وقلندران ومستحقان ومسکینان دارالملک دہلی از ہزار بگذشت وبہ لکھا رسید و
مدارس ومساجد قدیم وجدید کہ خالی ومندرس گشتہ بود از مدرسان ومذکران ومتعلمان
مشحون ومملو گشت ورونق علم ورواج تعلیم از سر پیدا آمد وبہ ہزاران استادان
دہبا انعام یافتند ومبجل ومعظم شدند وآنان را کہ صدگان ودو بیستگان تنکہ ادرار بودہ
است وادرار مندرس گشتہ وآں وثائق محو شدہ چہار صدگان وپانصدگان و
وہزارگان تنکہ ادرار تعیین فرمود وطوائفے کہ از طالبان علم محتاج دہ تنکہ بودند
صدگان ودو بیستگان وسیصدگان تنکہ ادرار تعیین گشت وعلماء ومتعلمان شہر از
خرد وبزرگ باحشمت وثروت شدند واز فقر وفاقہ واحتیاج وخواست خلاص یافتند
وبیشترے از طوائف مذکورہ کہ کفش درست نداشتند از مراحم سلطان فیروز شاہی
جامہاے لطیف می پوشیدند وبر اسپاں چیدہ سوار می شوند وبیشتر در علوم دین وبہ تعلیم
احکام شرع مشغول می باشند[1]

عہد فیروز شاہی کے شاعر مطہر کڑوی[2] نے جو صاحب درس وتدریس بھی تھا، اپنے قصیدوں میں فیروز شاہ کے تعلیمی خدمات کا تذکرہ بھی کیا ہے، چناں چہ فیروز شاہ کے قصیدے میں لکھتا ہے:-

ہر جا کہ اہل دانش واصحاب زہد بود — نان داد وزر داد ودرہا نثار کرد
ہر سو براے صادر و وارد زمین ودہ — تعیین بہر ولایت دور ہر دیار کرد
پیران کہنہ سال وخوردان را — چنداں وظیفہ داد کہ صاحب یسار کرد
چنداں رباط ومدرسہ خانقاہ ساخت — چنداں سرائے ومسجد وحوض وحصار کرد

مدرسہ فیروز شاہی | عہد فیروز شاہی میں سب سے بڑا شاہی مدرسہ دارالسلطنت دلی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۵۹ [2] مطہر کے حالات وسوانح اور دیوان پر اورینٹل کالج میگزین لاہور بابت ماہ مئی واگست ۱۹۳۵ء میں مولوی محمد شفیع صاحب ایم اے اور ڈاکٹر وحید مرزا نے مضامین لکھے ہیں، نیز نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی نے بابت ماہ جولائی واگست ۱۹۳۵ء میں اس مضمون پر استدراک فرمایا اور مزید حالات اور دیوان کے خصوصیات ظاہر کیے ہیں،

میں مدرسہ فیروز شاہی تھا، اس کے حالات ضیاء الدین برنی اور مطہر کڑوی دونوں نے نثر و نظم میں لکھے ہیں، بلکہ ضیاء نے اپنی نثر کو شاعرانہ مبالغہ آمیزی میں نظم سے بڑھا دیا ہے، اور اس کی عمارت کی توصیف و تعریف میں یہاں تک کہہ گزرا کہ وہ روئے زمین پر بے مثل عمارتوں میں سے ہے، اور مطہر نے جو دربار کی حاضری کے موقع پر دلی پہونچا تھا، اس مدرسہ کی زیارت کر کے نظم میں اس کے مفصل حالات قلم بند کیے تھے جس سے یہاں کے استادوں، طالب علموں اور دار الاقامہ کے کھانے وغیرہ کے مفصل حالات معلوم ہوتے ہیں، ضیاء الدین نے اس مدرسہ کی دل کش و عالی شان عمارت، اس کے گنبدوں کی رفعت، اس کی آب و ہوا کی لطافت، اور عمارت کی آراستگی و پیراستگی کا نقشہ اس مبالغہ سے کھینچا ہے کہ یہاں پہونچ کر گمان ہوتا ہے کہ آنے والا بہشت عدن میں داخل ہو گیا،

مطہر کڑوی نے اس شاہی مدرسہ فیروز شاہی کا جو حال قلم بند کیا ہے، اس میں اس کے اساتذہ خصوصاً مولانا جلال الدین رومی کے علم و فضل کا خاص طور پر ذکر آیا ہے، لکھتا ہے:۔

گفتم ایں مدرسہ و باغ شہنشاہ جہانست — اندروں آئی کہ یک حسن ببینی بہ ہزار

عالمان عربی لفظ و عراقی دانش — ہمہ در جبہ شاہی اشامی، و مصری دستار

ہر یکے نادرۂ دہر در انواع ہنر — ہر یکے واسطۂ عقل در اطراف دیار

در فقاہت بہ بخارا و سمرقند نشاں — در بلاغت بحجاز و یمن و نجد منار

صفہ (صدر) ایں محفل و سرِ دفتر ایں ستادی — کہ ز سر تا بقدم صورت عظمت و وقار

باز آہستہ در آورد سر اندر گوشم — کرد از نسبت ایں صاحب پس اخبار

گفتم ایں عالم آفاق جلال الدین است — رومی آں کز نسبش رومی کند روم و فخار

راوی ہفت قراۂ حمیدہ (قرات سند) چارۂ علم

شارح پنج سنن مفتی مذہب، ہر چہار

اسی طرح چند اشعار ہیں، اس کے بعد اس نے اس مدرسہ کے دار الاقامہ کے دستر خوان کے ایوان نعمت کا ذکر غیر معمولی انداز میں کیا ہے، اس سے اس دور کے تمدن اور عام فراغ بالی کا بھی اندازہ ہوتا ہے[۵]

---

[۵] یہ پورا قصیدہ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۵ء ص ۱۲۷ و ۱۲۸ میں چھپا ہے،

عہد فیروز شاہی کے دیگر مدارس | اسی طرح اس زمانہ میں سلطنت کے امراء نے بھی ملک کے مختلف حصوں میں مدرسے تعمیر کرائے تھے، جیسے عین الملک نے اسلام آباد کے نواح کے ایک دیہات میں جہاں مطہر کا قیام تھا۔ مدرسہ اور باغ تعمیر کرایا تھا مطہر نے اس کا تذکرہ بھی اپنے قصیدے میں کیا ہے[1]۔

غلاموں کی تعلیم کا اہتمام | فیروز شاہ کے تعلیمی خدمات میں یہ بھی شمار کرنے کے لائق ہے، کہ اس نے مسلمانوں کے سب سے ناخواندہ طبقہ غلاماں کو اکٹھا کر کے اپنی ملکی وسیاسی ضرورتوں کے لیے ان کی نوآبادیاں بسائیں اور ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا، چنانچہ ان کے بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم و حفظ قرآن وغیرہ کا خاص انتظام کیا تھا شمس سراج عفیف نے اس کی مفصل کیفیت بیان کی ہے[2] لکھا کہ ہر ایک کا مشاہرہ مقرر کر دیا جو دس سے سو تنکا تک تھا، مختلف طلباء حفظ قرآن اور علوم دینی کے درس میں مشغول تھے۔ کچھ لوگوں کو صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی تھی، اس طرح بارہ ہزار، مختلف فنون کے ماہر تیار ہوگئے مجموعی طور پر ایک لاکھ اسی ہزار غلام علوم و فنون اور مختلف صنعت و حرفت کے ماہر تیار ہوگئے تھے[2]

فیروز شاہ نے حوض خاص علائی کے پرے بھی ایک مدرسہ تعمیر کیا تھا جس میں سید یوسف بن سید جمال حسینی مشہدی متوفی ۷۹۰ھ مدرس تھے سالہا سال اس خدمت پر مامور رہے، شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں ان کا تذکرہ کیا ہے[3]

لڑکیوں کے مکاتب | اس زمانہ میں بعض مقامات پر لڑکیوں کے جداگانہ مکاتب کے قائم رہنے کا پتہ چلتا ہے، مشہور سیاح ابن بطوطہ موجودہ علاقہ بمبئی کے اس زمانے کے مشہور شہر[4] ہنور میں پہنچا، یہاں شافعی مذہب مسلمانوں کی بڑی آبادی موجود تھی اس کا بیان ہے کہ یہاں کی عورتیں حافظ قرآن ہوتی ہیں اور عورتوں کی تعلیم کے لیے تیرہ مکاتب قائم تھے وہ لکھتا ہے۔

---

[1] یہ پورا قصیدہ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۵ء ص ۱۳۷ و ۱۳۸ اور یہ پورا قصیدہ معارف جولائی ۱۹۳۵ء ص ۷۴ میں شائع ہوا ہے۔ [2] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف، ص ۲۷۰ [3] اخبار الاخیار ص ۱۴۲ [4] ہنور کا موجودہ نام ہونور ہے یہ احاطہ بمبئی میں شمالی کنڑا کے ضلع کی تحصیل کا آج بھی صدر مقام ہے اب یہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔

"ان عورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ سب کی سب قرآن حفظ کرتی ہیں، میں نے اس شہر میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے تیرہ اور لڑکوں کی تعلیم کے لیے تئیس مکاتب دیکھے، ایسی بات میں نے کسی اور جگہ نہیں دیکھی[1]۔

شاہی محل سرا میں جو لڑکیاں رہتی تھیں ان کی تعلیم کا خاص نظم کیا جاتا تھا، سلطان غیاث الدین خلجی کے محل میں ۱۵ ہزار باندیاں تھیں اس لیے ان کے لیے ایک نظام عمل بنا دیا تھا اور ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام تھا اور زنانہ نظام میں وزیر خزانہ دار، وکیل و ندیم کے ساتھ محتسب، مفتی، موذن اور حافظ قرآن کے عہدے بھی قائم تھے اور لڑکیاں اپنی استعداد کے مطابق ان منصبوں پر مقرر کی جاتی تھیں[2]۔

سلاطین بہمنی کے تعلیمی خدمات اسی طرح اس زمانہ میں سلاطین بہمنی نے مفید تعلیمی خدمات انجام دیے اور دکن کے مختلف مقاموں، گلبرگہ و بیدر وغیرہ میں مدرسے قائم کئے اور علماء و محدثین کے وظائف جاری کئے اور یتیموں کی تعلیم کا انتظام کیا، فرشتہ نے سلطان بہمنی کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے گلبرگہ، بیدر، قندھار، ایلچ پور، دولت آباد، چیبر، جیول، دابل اور دوسرے شہروں میں تعلیم گاہیں قائم کی گئیں جن میں احادیث کا درس خاص طور پر ہوتا تھا اور محدثین کے وظائف مقرر تھے[3]۔

آٹھویں صدی ہجری کے چند ممتاز اساتذہ آٹھویں صدی میں خلجیوں اور تغلق کے زمانہ میں ہندستان کے مختلف گوشوں میں جو اہل علم درس و تدریس کی خدمت میں مشغول تھے، ان میں سے چند کا بر حسب ذیل ہیں، ان کا تذکرہ تاریخ فیروز شاہی، فرشتہ اور سیر الاولیاء میں آیا ہے، جن سے صاحب نزہتہ الخواطر نے ہر ایک کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔

مولانا رکن الدین اندرپتی (نزہتہ الخواطر ص ۴۸) شیخ رکن الدین ظفر آبادی (ص ۴۵) مولانا رکن الدین بدایونی (ص ۴۵) قاضی زین الدین دہلوی (ص ۴۷) خواجہ زکی الدین مقری (۴۷) مولانا سراج الدین (ص ۴۸) شرف الدین امروہوی (ص ۵۲) مولانا شمس الدین باخرزی (دہلی ص ۵۴) مولانا شمس الدین کازرونی (دہلی ص ۵۴) مولانا شمس الدین

---

[1] رحلۃ ابن بطوطہ ص [2] فرشتہ ج ۱ ص ۲۷۵ [3] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۳۰۲ [4] مرآۃ احمدی ج ۱ ص ۷۰ آثر رحیمی ج ۲ ص ۳۷۳

دمشقی دہار (ص ۵۴) مولانا شہاب الدین ملتانی (دہلی ص ۵۹) حکیم صدر الدین دہلوی (ص ۶۱) مولانا صدر الدین ساوی (دہلی ص ۶۳) مولانا صدر الدین گندھک (دہلی ص ۶۳) مولانا صلاح الدین ستری (دہلی ص ۶۴) مولانا ظہیر الدین بھکری (ص ۶۶) مولانا ظہیر الدین اعرج (دہلی ص ۶۷) قاضی عبد اللہ بیانوی (ص ۷۰) مولانا عبد الکریم شروانی (ص ۷۰) مولانا فخر الدین زرادی، ابو علی قلندر (۵) شیخ اسماعیل بن محمد ملتانی (۹) مولانا جلال الدین رومی (ص ۲۲) مولانا جلال الدین اودھی (ص ۲۳) مولانا جلال الدین اچھی (ص ۲۴)

اسی طرح ایک سو سے زیادہ اہل علم کے اور نام ہیں جو ہندستان کے مختلف شہروں میں درس و تدریس میں مصروف تھے اور ملک کے مشاہیر اہل علم و ارباب درس و تدریس میں شمار کئے جاتے ہیں اور جن کے دامن فیض سے ہزاروں ہزار طلبہ اہل علم بن کر اٹھے۔

عہد خلجی میں تعلیمی ترقیاں اس کے بعد نویں صدی ہجری میں سلطان محمود خلجی کے ہاتھوں ہندستان میں تعلیمی ترقی انجام پائی مدرسے قائم کئے گئے اور لڑکوں کے وظیفے جاری کئے اور اپنے حدود حکومت سے باہر بھی اگر کہیں باکمال کا شہرہ سنتا۔ امداد کی رقمیں بھیج دیتا تھا۔

چنانچہ اس کے دور حکومت میں متعدد نئے مدرسوں کے قائم کرنے کا ذکر آتا ہے، جیسے ۸۴۶ھ میں ولایت چتور میں متعدد مدرسے قائم کئے اور اسی سال کے آخری مہینہ ذی الحجہ میں پایۂ تخت شادی آباد میں ایک شاہی مدرسہ قائم کیا۔[۱]

اس صدی میں دو دو لایتوں کے دو فرمانرواؤں کی تعلیمی خدمات بھی لائق ذکر ہیں، ایک گجرات میں محمود بیگڑہ (جلوس ۸۶۳ھ) اور دوسرے سندھ میں جام نظام الدین (جلوس ۸۶۶ھ) ہیں محمود کے متعلق مراۃ احمدی کا بیان ہے کہ اس نے "مدارس بہشت آئین و مساجد مانند خلد بریں" تعمیر کئے۔[۲]

اور جام نظام الدین کے بارے میں مآثر رحیمی میں ہے کہ

"اوائل عمر میں وہ علم کی طلب میں مختلف مدارس میں جاتا رہا ...... پھر اس زمانۂ حکومت میں

۱؎ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۶۳ ۲؎ مآثر رحیمی ج ۱ ص ۳۲۲ و ۳۲۳ و تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۲۶ ۳؎ مراۃ احمدی ج ۱ ص ۹۰

علما و صلحا و فقرا غیر معمولی فراغ بالی سے تھے، اور اس زمانہ میں سنن کا احیا اور مدارس کا رواج اس طریق پر ہوا کہ اس کی ستائش سے قلم عاجز ہو۔

اسی نے مولانا جلال الدین دوانی کو شیراز سے ہندستان آنے کی دعوت دی ٹھٹھہ میں ان کے لیے عمدہ قیام گاہ کا انتظام کیا۔ مگر اسی اثنا میں ان کا سفر آخرت پیش آگیا ان کے دو عزیز تلامذہ میر معین اور میر شمس کے سوائے ان کے علمی فیض و برکات ہندستان میں منتقل ہوئے۔[۵۱]

اسی زمانہ میں سلاطین شرقیہ جونپور میں حکمران تھے اور شہر جونپور دار السرور شیراز ہند کہا جاتا تھا۔ ملا محمد صفوانی صاحب سیر الملوک کا بیان ہے کہ یہاں صدہا مدرسے اور مسجدیں تعمیر ہوئیں اور علما و فضلا دور دراز ملکوں سے آئے جن کے لیے وظیفے اور جاگیریں مقرر ہوئیں۔ جونپور کی تعلیمی و علمی برتری مغلوں کے شباب کے زمانہ تک قائم رہی۔[۵۲]

لودیوں کے عہد کی تعلیمی ترقیاں اس کے بعد لودیوں کا زمانہ آتا ہے، اور سلطان سکندر لودی (جلوس ۸۹۴ھ) کا عہد حکومت تعلیمی ترقیوں میں سبقت لے گیا، سیر المتاخرین میں ہے کہ:

"اس نے مساجد و مدارس تعمیر کیے، اور ان میں امام، موذن، خطیب اور مدرس مقرر کیے، اور ان کے وظیفے اپنی سرکار سے مرحمت فرمائے"[۵۳]

اس عہد میں معقولات کے درس میں شیخ عبد اللہ طلبنی (دہلی) اور شیخ عزیز اللہ طلبنی (سنبھل) کو بڑی شہرت حاصل تھی، سلطان سکندر لودی بھی ان کا بڑا احترام کرتا تھا اور کبھی کبھی وہ شیخ عبد اللہ کے حلقۂ درس میں بھی چلا آتا تھا، لیکن جب آتا تو تمام شاہی آداب و لوازم ترک کرکے حلقہ کے کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھ رہتا اور درس کے خاتمہ کے بعد سلام و کلام کرتا تھا۔[۵۴]

ہندوؤں میں فارسی زبان کی تحصیل کی ابتداء سلطان سکندر لودی کے دور حکومت کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہی زمانہ

---

۵۱ آثر رحیمی ج ۲ ص ۲۷۲ ۵۲ جونپور نامہ ص ۴، ۵۳ سیر المتاخرین ج ۱ ص ۱۲۰، ۵۴ منتخب التواریخ بدایونی ج ۱ ص ۳۲۴۔

سے ہندوؤں نے فارسی زبان سے اپنا رشتہ قائم کیا، چناں چہ فرشتہ ہندوؤں میں ان علوم و فنون کے رواج پذیر ہونے کا تذکرہ کر کے لکھتا ہے،

"بہ خواندن و نوشتن خط فارسی کہ تا آں زبان درمیان ایشان معمول نہ بود پرداختند[51]"

پھر جلد ہی اس قدر ترقی کر لی کہ اس زبان میں شعر و شاعری کرنے لگے، اور مسند درس پر بیٹھ گئے، خافی خان لکھتا ہے:-

"دیگے از شعرائے عہد سلطان سکندر برہمن بود، می گویند کہ با وجود کفر کتب علم رسمی را درس می گفت[52]"

ہمایوں کے عہد میں تعلیمی ترقیاں

اس کے بعد مغلوں کا دور آتا ہے، مغل سلاطین صاحب علم و فضل تھے، اور ان کے درباروں سے علماء وابستہ رہے، اور ملک میں علم و تعلیم کا فیض پہونچاتے تھے، مختلف شہروں میں مدرسے قائم تھے، اور پچھلے فرماں رواؤں کے طرز پر ان کے مصارف شاہی خزانے سے ادا ہوتے تھے، نیز ملک میں جا بجا علماء کے وجود سے مدرسے جاری تھے، ہمایوں کو علم ہیئت و ہندسہ کا ذوق تھا، اس عہد کے باکمال ہیئت دان مولانا نور الدین ترخان اس کے دربار سے وابستہ تھے، وہ کبھی خود ان سے درس لیتا، اور کبھی ان کے فنی مشکلات حل کرتا[53]،

ہمایوں کے عہد میں[54] دو نئے اہم مدرسے لائق ذکر ہیں، ایک شیخ زین الدین خوافی کا مدرسہ آگرہ میں جہاں وہ مدفون ہوئے[55]، اور دوسرا دلی کا ایک مدرسہ جس میں شیخ حسین مدرس تھے[56]،

عہد اکبری میں تعلیمی انقلاب

اکبر کے دور میں ہندوستان کے اسلامی مدارس ایک نئے انقلاب سے دوچار ہوئے، اس میں ۹۹۵ھ

---

۵۱ تاریخ فرشتہ ج ۲، ص ۱۸۰، ۵۲ خافی خان ج ۱ ص ۳۲۳، ۵۳ مآثر الامراء ج ۱ ص ۴۹۴، ۵۴ منتخب التواریخ بدایونی ج ۱ ص ۴۰۱، ۵۵ آئین اکبری، ۵۶ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۷۶،

میں عربی و اسلامی علوم کی تعلیم کے روکنے کا فرمان صادر کیا، اور دوسرے عقلی علوم، نجوم، حساب، طب و فلسفہ مدرسوں میں رائج کیے [۵۱]

نصاب تعلیم کی اس تبدیلی کو ابو الفضل نے آئین اکبری میں تفصیل سے بیان کیا ہو، جیسے آگے ہم دکھائیں گے، لیکن یہاں یہ اشارہ کر دینا ضروری ہو، کہ اس شاہی فرمان کے رو سے نئے علوم تو ضرور نصاب میں داخل ہو گئے، لیکن عربی و اسلامی علوم خارج نہیں ہوئے چناں چہ اس زمانہ میں بھی جا بہ جا اسلامی مدرسے قائم رہے، جس میں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی، قلیج خاں کے متعلق جو دربار اکبری کے امرا میں سے تھا، مآثر الامرا میں ہی:-

قلیج خاں صلاح و تقوی بسیار داشت و در تسنن متعصب بود و ہمیشہ بدرس علوم و افادہ طلاب اشتغال نمود، گویند در صوبہ داری لاہور کہ پاس ۹ بدرس فقہ و تفسیر و حدیث در مدرسہ قیام می ورزید و با قصی غایت در ترویج علوم شرعیہ می کوشید [۵۲]

عہد اکبری کا ایک مشہور مدرسہ مدرسہ ماہم بیگم تھا، جس کی عمارت خیر المنازل کے نام سے مشہور تھی [۵۳]، بدایونی نے اس مدرسہ کو مدرسہ بیگم کے نام سے یاد کیا ہو، نیز آگرہ و فتح پور سیکری میں خود اس نے متعدد عربی مدرسے قائم کیے، اکبری دور حکومت میں کشمیر و بیجاپور میں غیر معمولی تعلیمی انقلاب ہوا، اس وقت تک یہاں علوم و فنون کے متعارف نہ تھے، خط نستعلیق کا رواج نہ تھا، اسی زمانہ میں یہاں علوم متعارفہ کا اور فارسی رسم خط کا رواج ہوا، بادشاہ نامہ میں ہی،

اگرچہ دوراں چندے کہ اکثر علوم متعارفہ درس گویند بودند آیا علوم مسند اولہ شیوع تمام نداشت خط نستعلیق نیکو می نوشتند و چندے زبان شعرا دانستند جدا زاں کہ در عہد دولت حضرت آشیانی نشاکش یاکتب اکثر ساکنان ش اکتساب مراسم الہیت و لوازم آدمیت نمودہ شائستگی جوہر کوا ہر ساختند و فارسی گفتن و خط خوش نوشتن و نغمہ فارسی

---

[۵۱] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۶۳، [۵۲] مآثر الامرا ج ۳ ص ۷۱-۲۰، [۵۳] رسالہ "ہندوستان کی اسلامی درس گاہیں" میں اس کا کتبہ آثار دہلی سے منقول ہو

سرانجام رواج تمام یافت

اسی طرح بیجاپور میں عادل شاہ نے چند خاص تعلیمی انقلاب بھی برپا کیے تھے، دارالاقامہ کے لڑکوں اور استادوں کے لیے نفیس غذائیں اور لڑکوں کے سالانہ امتحان کے لیے انعامات دیے جانے کے قواعد مقرر کیے تھے[۱]،

جہانگیر کے دور میں تعلیمی ترقیاں

جہانگیر نے عربی مدرسوں پر نئے سرے سے توجہ کی، اس کے عہد حکومت میں بہت سے ویران مدرسے آباد ہو گئے" اس نے تعلیمی ترقی کے لیے یہ قانون نافذ کیا کہ جو تاجر کسی غیر دیار میں فوت ہو جائے اور اس کے وارثوں کا پتہ نہ چل سکے، یا شہر ہی کا کوئی ایسا دولت مند وفات پائے، جس کے ورثہ موجود نہ ہوں تو اس کے مال و متاع کو شاہی خزانہ میں جمع کرنے کے بجائے ان سے مدرسے اور دوسری مفید عمارتیں تعمیر کر دی جائیں،

خوافی خاں نے اس فرمان کو نقل کیا ہے،

"حکم شد ہر جا کہ مسافر تاجر و مقیم مال دار فوت شود و وارث او حاضر نہ باشد مال او را امانت نگاہ دارند و در صورت مفقود الاثر بودن وارث مال ترکہ میت را صرف تعمیر و احداث مساجد و پل و مدرسہ و سرائے نمایند[۲]"

ہندوستان میں اس فرمان سے بہ کثرت مدارس قائم ہوئے، چناں چہ مصنف تاریخ جام جہاں کا بیان ہے، کہ جہانگیر نے پرانے مدرسے جو چڑیوں کے گھونسلے اور درندوں کے مان بن گئے تھے، نئے سرے سے آباد کیے[۳] اور اکبرآباد، آگرہ کو اکبر کے زمانہ سے جو تعلیمی اہمیت حاصل ہوئی تھی وہ اس دور میں بھی باقی رہی[۴]،

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی طالب علمی کا زمانہ جہانگیر کے دور حکومت میں

---

[۱] بادشاہ نامہ حصہ دوم ص ۵۵، [۲] بساتین السلاطین ص ۳۵۱، [۳] نزند را ناقد لاہو ۔۔۔ تاریخ جام جہاں ذکر جہانگیر، [۴] بادشاہ نامہ ج ۱ ص ۳۴۰

گزرا ہو، انھوں نے اپنی تصنیف اخبار الاخیار میں اپنے تحصیل علم کی مفصل حالت بیان کی ہو، ان کی تحریر سے اس عہد میں دہلی کے ایک اور مدرسہ کا پتہ چلتا ہو، جس میں وہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے لیے داخل ہوے تھے، اس مدرسہ کو انھوں نے "مدرسہ دہلی" کے نام سے یاد کیا ہو[۱]،

شاہ جہاں کے دور کی تعلیمی ترقیاں

شاہ جہاں کے عہد میں لاہور، احمد آباد، دہلی، اور جون پور علم و تعلیم کے ایسے مرکز تھے، کہ ہندوستان کے باہر ہرات و بدخشان سے لوگ تعلیم و تحصیل کے لیے ہندوستان آتے تھے، اس عہد میں با کمالوں کی مسند درس کو شہرت عام حاصل تھی، اور ان کے مدرسے علم و فن کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایشیا میں مشہور تھے،

لاہور میں ملا محمد یوسف اور ملا جمال لاہوری کو شہرت حاصل تھی، ملا محمد فاضل بدخشانی نوعمری میں تحصیل علم کے لیے کابل آئے، اور ملا صادق حلوائی سے تعلیم حاصل کی، پھر وہاں سے توران پہونچے، اور ملا مرزا جان شیرازی کے درس میں شریک ہوے، اس کے بعد علم کی مزید تکمیل کے لیے لاہور آئے، اور یہاں عقلی علوم کی تحصیل ملا محمد یوسف سے کی، جنھیں عبد الحمید مصنف بادشاہ نامہ نے "سرآمد اساتذۂ زماں" کے لقب سے یاد کیا ہو، اور نقلی و شرعی علوم تفسیر و اصول کی تعلیم ملا جمال لاہوری سے جنھیں عربیت میں "یگانۂ روزگار" کہا گیا ہو، حاصل کی[۲]،

اسی طرح ملا عبد اللطیف سلطان پوری، ملا جمال لاہوری کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے[۳]، اور ملا محمد یوسف خود بھی ملا جمال لاہوری کے شاگرد تھے، اور عقلی و نقلی دونوں دونوں علوم میں دست گاہ رکھتے تھے، اور خصوصاً پڑھانے کا طرز نہایت پسندیدہ اور دل نشیں تھا[۴]،

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۲۹۲، [۲] بادشاہ نامہ ج ۱ ص ۳۴۰، [۳] بادشاہ نامہ ج ۱ ص ۳۴۴
[۴] " ص ۳۴۲،

اس زمانہ میں لاہور کے ایک دوسرے مشہور استاد ملا عبدالسلام دیوی ہیں، انھیں معقول ومنقول وادب سب میں دست رس حاصل تھا، تقریباً ۴۰ سال درس وتدریس کی خدمت میں مصروف رہے، شاہ جہاں نے ان کا تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیا تھا[۹۱]، ملا میرک عنفوان شباب میں ہرات سے ہندوستان آئے، اور ملا عبدالسلام کے شاگردوں کے زمرہ میں داخل ہوئے[۹۲]، ملا خواجہ بہاری بھی عنفوان شباب میں اپنے والد ملا سعد ٹھٹوی سے علوم کی تحصیل کرنے کے بعد مزید تکمیل کے لیے لاہور آئے، اور تحصیل علوم سے فارغ ہو کر دربار سلطانی سے وابستہ ہوئے[۹۳]،

سیالکوٹ میں ملا کمال کشمیری کی مسند درس قائم تھی، معقولات کے مشہور فاضل ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ان ہی کے دامن فیض کے تربیت یافتہ تھے، شاہ جہاں نے ان کی مدد معاش کا معقول انتظام کیا اور انھوں نے اپنی مشہور تصنیفات اس کے نام سے معنون کیں۔ ملا عبدالحکیم کے بعد ان کے صاحب زادے اپنے والد کے درس کی مسند پر بیٹھے[۹۴]،

ملا محمد فاضل جن کا تذکرہ اوپر گذرا، لاہور سے عقلی ونقلی علوم کی تحصیل کے بعد دارالسلطنت دلی پہونچے، ابتداءً عہدۂ قضا پر مامور ہوئے، پھر دلی میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، شاہ جہانی دربار سے ان کا بھی معقول وظیفہ جاری تھا[۹۵]،

تھانیسر (پنجاب) میں ایک مدرسہ شیخ چلی کے نام سے مشہور تھا، اسے دارا شکوہ نے ۱۶۵۰ء میں تعمیر کرایا تھا، سکھوں کے زمانہ میں اس عمارت میں گرنتھ رکھا گیا، اور اسی کے قریب شیخ چلی کی جو درگاہ تھی، اسے گردوارہ بنا دیا گیا[۹۶]،

ملا عبداللہ کی مسند درس اسی زمانہ میں شہر بہار میں بچھی ہوئی تھی، ان کے صاحبزادہ

---

۹۱ بادشاہ نامہ ج ۱ ص ۳۴۱، ۳۴۲ ۹۲ ؍؍ ص ۳۴۴ ۹۳ ؍؍ ص ۳۴۳ و حصہ ۲ ص ۱۵۱
۹۴ ؍؍ حصہ اول ۲۴۰ و حصہ دوم ص ۵۵۵، ۹۵ بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۲۴۰،
۹۶ پروموشن آف محمڈن لرننگ انڈر مانو لا،

ملا محی الدین معروف بہ ملا موہن بہاری نے اس مدرسہ میں ۹ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، اور ۱۷ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت پائی، اور اسی مدرسہ میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، پھر شاہ جہاں کی ملازمت سے وابستہ ہوئے، شاہزادہ اورنگ زیب کی تعلیم کی خدمت ان کے سپرد ہوئی، پھر وطن میں قیام اختیار کیا، اور ۸۴ سال کی عمر میں ۱۰۶۲ھ میں وہیں وفات پائی[1]،

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مسند درس شاہ جہاں ہی کے عہد میں قائم ہوئی[2]،

احمد آباد گجرات میں میر محمد ہاشم درس و تدریس میں مشغول تھے، خصوصاً علم طب میں شہرت حاصل کی، شاہ جہاں نے ان کا وظیفہ جاری کیا، پھر شاہزادہ محمد اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے دلی بلا لیے گئے[3]،

شاہ جہاں نے "مسجد اکبر آبادی" کے نام سے ایک مسجد ۱۰۶۰ھ میں دلی میں تعمیر کرائی، اور اس سے متعلق ایک وقف کیا جس میں طالب علموں کے وظائف بھی مقرر کیے گئے،

سر سید مرحوم نے اس شکستہ حال مسجد کا کتبہ نقل کیا ہے، جس میں یہ عبارت بھی ہے،

"اگر بہ مرمت ایں امکنہ احتیاج افتد آنچہ از حاصل ایں موقوف بعد الترمیم باقی ماند بہ خدمت مسجد و حمام و طالب علم رسانند و الاتمام را لجماعہ مسطورہ بدہند[4]"

نومسلموں کی تعلیم کا انتظام

اکبری دور میں ہندو مسلمانوں کی باہمی شادی کا زیادہ رواج ہو گیا تھا، مسلمان لڑکیاں ہندوؤں کے عقد میں چلی گئی تھیں، اسلامی شریعت کی رو سے ایسے نکاح صحیح نہیں سمجھے جاتے تھے، اس لیے شاہ جہاں نے ان کے شوہروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیویوں سے بے تعلق ہو جائیں، یا تبدیل مذہب کر لیں، ایسے بہت سے شوہروں نے مذہب بدل لینے کو ترجیح دیا؛ اس طرح نومسلموں کی خاصی تعداد اکٹھا ہو گئی، اس تحریک کا بانی جوکھو نام کا ایک زمیندار بھی تھا، وہ خود بھی مسلمان ہو گیا تھا، شاہ جہاں نے ایسے نومسلموں کی تعلیم کے لیے خاص طور پر اہتمام کیا، اور ان

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۴ [2] بادشاہ نامہ حصہ اول ص ۳۴۱ [3] ص ۳۴۵ [4] آثار الصنادید باب ۳ ص ۱۹

کے لیے معلم مقرر کر دیے تھے[۱]،

نیز فوج میں مختلف ملکوں کے ارباب کمال جمع ہو گئے تھے ان سے ملک کے گوشہ گوشہ میں علم و تعلیم کی روشنی پھیلی،

عالمگیر کے عہد کی تعلیمی ترقیاں

عالمگیر کے عہد کی علمی و تعلیمی ترقیاں عام شہرت رکھتی ہیں، اس نے بڑے بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے شہروں اور گانوں میں بھی تعلیم پھیلانے کے لیے مدرسے قائم کیے، طالب علموں کے وظیفے جاری کیے، علما و مدرسین کو معیشت کی طرف سے فارغ البال کیا، اور اس کی کوششوں سے ہر صوبہ، شہر اور قصبہ میں علم و تعلیم کی روشنی پھیل گئی، عالمگیر نامہ میں ہے:-

> دانا ں جا توجہ خاطر دانش آثر بہ ترویج مراتب فضل و تاسیس معالم علم درجہ قصوی دارد دور جمیع بلاد و قصبات ایں کشور وسیع فضلا، و مدرسان را بہ وظائف لائقہ اندوختہ یانہ و املاک موظف ساختہ بہ شغل تدریس و تعلم محصلان علوم گماشتہ اند برائے طلبہ علم در ہر معمولی و ناحیہ وجوہ معیشت در خور رتبہ و حالت و استعداد مقرر داشتہ و ہر سال بدیں وجہ نیز از خزائن احسان پادشاہانہ مبلغہائے عمدہ صرف می شود از فیض مکرمت و افضال شہنشاہ ابرکف دریا نوال طالبان علم بکمال سمرت افزونی بہ پرفتسر فشوح البال و مرفہ الحال بکسب تحصیل علوم اشتغال می ورزند۔[۲]

عالمگیر کے زمانہ میں بھی دونوں قسم کے مدرسے جاری تھے، یعنی شاہی مدرسے جن کے پورے مصارف حکومت کی طرف سے ادا ہوتے تھے، اور جن کا انتظام و انصرام بھی حکومت کے متعلق تھا، دوسرے وہ مدرسے جو ارباب خیر اور علمائے دین خود اپنی طرف سے جاری کرتے تھے، عالمگیر نے پہلی قسم کے مدرسوں کے لیے ہر صوبہ میں یہ انتظام کر دیا

---

[۱] بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۵۸، [۲] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۵، ۱۰۸۶۔

تھا، کہ مدرسین اور طالب علموں کی تنخواہیں اور وظیفے اسی صوبہ کے خزانہ سے ادا کیے جائیں اور صوبہ دار مدرسین سے تنخواہوں کی وصولی کا سیاہہ حاصل کرکے خزانہ میں داخل کرلیا کرے، اور غیر سرکاری مدرسوں کو وہ وقتاً فوقتاً شاہی خزانہ سے امداد دیا کرتا تھا، چناں چہ مرات احمدی میں شاہی مدرسوں کے متعلق ہے،

"چوں حکم مقدس معلی در جمیع صوبہ جات ممالک محروسہ شرف نفاذ یافت کہ در ہر صوبہ مدرس تعیین نمایند و طلب علم از میزان تا کشاف خواں باستصواب صدر صوبہ موافق تصدیق بہ مہر مدرساں وجہ علوفہ از تحویل تحویلچی خزانۂ آں صوبہ می دادہ باشند، دریں ولا سہ نفر مدرس در احمد آباد وپٹن وسورت وچہل وپنج نفر طلبہ علم اضافہ در صوبہ احمد آباد مقرر شد،"

اسی طرح غیر سرکاری مدرسوں کی امداد ملاحظہ ہو جو وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا، ایک موقع پر مدرسہ سیف خاں کو ۵۸۰ اور ۶ بیگھے کا ذکر آیا ہے[۵۱]، اسی طرح مدرسہ ہدایت بخش ومسجد تعمیر کردہ شیخ محمد اکرام الدین کی تعمیری تجدید و اصلاح کے لیے اس نے ایک... لاکھ چوبیس ہزار روپے منظور کیے، اسی طرح موضع سوندرہ پرگنہ راندیل، اور موضع سیمہ پرگنہ کڑا کے مدرسوں کے لیے یومیہ مقرر کیے تھے[۵۳]

عالمگیر کے دور حکومت سے پہلے ابتدائی مکاتب میں ہندو اور مسلمان طلبہ ایک جا تعلیم حاصل کرتے تھے، ان مکتبوں میں غیر مذہبی تعلیم ہوتی تھی، یہاں سے فارغ ہو کر اعلیٰ مدارس میں چلے جاتے تھے، اور ہندو طلبہ اپنے مذہبی مدرسوں میں جاتے تھے، جہاں شاستر کے علاوہ طب و نجوم وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، ہندوؤں کے مدارس عالمگیر کے زمانہ میں بھی قائم رہے، اور ان کا اہم مرکز بنارس تھا، خافی خاں لکھتا ہے :-

"در ایامی کہ محرر سوانح در بندر سورت بود با زنانام زنار دار طبیب جیشیہ نقل می نمود

---

[۵۱] مرات احمدی ج ۱ ص ۲۸۲ [۵۲] ص ۲۰۹ [۵۳] ج ۱ ص ۲۶۳،

"کہ چوں در قوم ما ضابطہ است کہ برائے تحصیل علم نجوم و طبابت و شاستر برہمنان بے سرو
مایہ از دور و نزدیک بنارس رفتہ یکے از برہمنان آنجا را استاد خود قرار می دہند
و نزد او درس می خوانند صبح و شام از طرف استاد خود کنار آب گنگ رفتہ موافق
دابے کہ مقرر است مردمی را کہ برائے غسل می آیند بہ دستور دعا و آئین مقرری خدمت
می نمایند، و ہر چہ از آں ہم رسد بلا تصرف و خیانت نزد استاد خود می برند و
خرچ خوراکی و پوشاک شاگردان بر ذمہ استاد است کہ بہ قدر کفالت ضرور
خبری گیرند[1]"

نیز دلی کا وہ سرچشمۂ علم و عرفان جس نے فیوض و برکات سے سارے ہندوستان
کی علمی تشنہ کامی دور کی، وہ عالمگیر ہی کے عہد میں قائم ہوا، حضرت شاہ
ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی نے جو
فتاوی عالمگیری کے جامعین میں سے تھے، اس مدرسہ کو قائم کیا تھا، جس سے علوم
کے سرچشمے جاری ہوئے، اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے اپنے والد ماجد
سے علوم کی تحصیل کی، اور پھر اسی مدرسہ کی مسند درس پر حضرت شاہ عبدالعزیز،
حضرت شاہ محمد اسحاق، حضرت عبدالقادر، اور حضرت نذیر حسین میاں صاحب
اعلی اللہ مقامہم باری باری جلوہ افروز ہوئے، اور اس سرچشمۂ فیض سے خاص طور
پر علم حدیث ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گیا، اس مدرسہ کے حالات اس خاندان
کی تاریخ میں مفصل ملیں گے،

پھر دوسری طرف ہندوستان کے مشہور دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ کے مدرسہ نظامیہ
کی ابتدا بھی عالمگیر ہی کے عہد میں ہوئی ہے، قصبہ سہالی (اودھ) کے مشہور صاحب
درس ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد عالمگیر نے ان کے صاحبزادوں کو لکھنؤ
کے محلہ فرنگی محل میں ایک قطعہ مکان مع متعلقہ عمارتوں کے سنہ ۱۱۰۵ھ میں عنایت کیا[2]

[1] خافی خان ج ۲ ص ۲۱۹، [2] یہ فرمان اب تک محفوظ ہے، اسے مولانا شبلی مرحوم نے دیکھا تھا، اور ملا
نظام الدین کے سوانح میں اس کی عبارت نقل کی ہے، (مقالات شبلی ج ۴ ص ۱۲)

ملا قطب الدین سہالوی کے چھوٹے صاحب زادہ نے جو ان دنوں ۱۵ سال کے تھے، اسی عمارت میں مسند درس قائم کی، جسے مدرسہ نظامیہ کا مشہور لقب حاصل ہوا، اور اس کا مرتب کیا ہوا نصاب تعلیم دو صدیوں تک بلا اختلاف ہندوستان میں رائج رہا، اور آج بھی ہندوستان کے قدیم عربی مدرسے نصاب تعلیم میں بہت کچھ تبدیلیاں قبول کر لینے کے باوجود اسی نقش قدم پر چل رہے ہیں،

آج فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ پر تقریباً ڈھائی سو برس گذر چکے ہیں، اس مدت میں سیکڑوں علما و فضلا اس خاندان میں پیدا ہوئے، اور اس مدرسہ کی مسند تعلیم کو مسلسل قائم کیے رہے، اور ان کے دامن تعلیم و تربیت سے ہزاروں علما پیدا ہوئے، جنھوں نے ہندوستان کے چپہ چپہ کو علم و تعلیم کی روشنی سے منور کیا، فرنگی محل کے اون اکابر علماء میں جو درس و تدریس میں اپنے زمانہ میں فن کے امام اور مسلم استاد تھے، ملا نظام الدین، مولانا بحر العلوم عبد العلی، مولانا عبد الوالی، مولانا عبد الحلیم، ملا حسن، ملا حسین اور مولانا عبد الحئی فرنگی محلی وغیرہ ہیں[۵]

مغلوں کے دور حکومت کے آغاز سے عالمگیر کے زمانہ تک بیرون تعلیم کی اشاعت پر سلاطین امراء اور ہر عہد کے علماء و فضلاء کی جو توجہ رہی، اس کا یہ اثر تھا، کہ ہندوستان کے مختلف صوبے گجرات، پنجاب، دہلی، آگرہ، سندھ، دکن، بنگال، بہار، جون پور، اودھ، اور الہ آباد مختلف دوروں میں تعلیم کے مرکز رہے، اور ان کی تعلیمی خدمات عالمگیر کے عہد تک خصوصیت کے ساتھ جاری رہیں، مولانا غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں مشرقی ہندوستان کی عمومی اور اودھ و الہ آباد کی خاص طور پر تعلیمی حالت کا نقشہ کھینچا ہو، لکھتے ہیں:-

---

[۵] فرنگی محل کے علماء کے حالات میں تذکرۂ علمائے فرنگی محل، مطبوعہ مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہو، اور ۱۳۳۱ھ میں مولانا عبد الباری صاحب مرحوم نے "اغصان اربعہ" "فرنگی محل" کے نام سے ایک رسالہ لکھ چکے ہیں،

سرزمین پورب از قدیم الایام معدن علم و علما است ، ۔۔۔۔ اگرچہ جمیع صوبہ جات
ہند بہ وجود حاملان علوم تفاخر دارند سیما حصار پایۂ تخت خلافت کہ بہ واسطۂ جمعیت
صاحب کمالان ہر قسم دران جا فراہم می آیند از تراکم افکار و اجتماع عقول اہل
ہر عصر کمالات نفس ناطقہ را چہ علم عقلی و نقلی و چہ غیر آن بہ پایہ ، بالا تری رسانند ،
اما صوبہ اودھ و الہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتوان یافت چہ تمام
صوبہ اودھ و اکثر صوبہ الہ آباد بہ فاصلۂ پنج کردہ نہایت دہ کردہ تخمیناً آبادی شرفا
و نجبا است کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتند و مساجد و
مدارس و خانقاہات بنا نہادہ مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بر روے دانش پژوہان
کشادہ و صلاے اطلبوا العلم در دادہ و طلبۂ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند
و ہر جا موافقت دست بہم داد و بہ تحصیل مشغول می شوند و صاحب توفیقان ہر معمورہ
طلبۂ علم را نگاہ می دارند و خدمت این جماعہ را سعادت عظمی می دانند صاحبقران ثانی
شاہ جہاں انار اللہ برہانہ می گفت پورب شیراز مملکت ما است " و تا حدود ۱۲۰۰ھ
ہنگامہ علم و علما دریں گل زمین گرمی داشت [5] "

دورِ زوال

ہندوستان میں تیموری سلطنت کے جاہ و جلال کا آفتاب عالمگیر کے وفات پاتے ہی گہن میں آیا ، بالآخر آخری تاجدار ہند بہادر کے زمانہ میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ، عالمگیر کی وفات سے سلطنت کے مٹنے تک کا زمانہ اس عظیم الشان سلطنت کے اختلال کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے ، اس کا اثر لازمی طور پر ہندوستان کے تعلیمی نظام اور اسلامی مدرسوں پر بھی پڑا ، تاہم یہ زمانہ شاہی مدرسوں کے وجود سے یکسر خالی نہیں ، خال خال ایسے مدرسوں کے وجود کا پتہ بھی چلتا ہے ، جو مغل سلاطین کی سرپرستی میں جاری ہوئے ، اور ان کے مصارف شاہی خزانہ سے ادا ہوئے ، جیسے مرات احمدی میں محمد معظم بہادر شاہ اول (۱۱۱۸ھ - ۱۱۲۳ھ) کے دورِ حکومت میں ایک مدرسہ کی تعمیر عمل میں آئی ، اور اس کے مصارف

---

[5] مآثر الکرام ج ا ص ۲۲۱

شاہی خزانہ سے ادا کیے گئے،[۱]

لیکن یہ شاذ و نادر مثالیں ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے، کہ عالمگیر کے بعد سے اخیر دور تک جس قدر اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم رہے، یا نئے جاری کیے گئے، وہ زیادہ تر علماء و فضلاء کے ذاتی ذوق اور علمی شغف سے قائم تھے، اور ارباب ثروت ان مدارس کی مدد دینی خدمت سمجھ کر کرتے رہتے، اور اس حیثیت سے اس زمانہ میں بھی ملک کے مختلف حصوں میں نئے مدرسے کے قائم ہونے، پرانے مدرسوں کے جاری رہنے، اور ارباب علم و فضل کے درس و تدریس میں مشغول رہنے کے واقعات کچھ کم نہیں ہیں،

چنانچہ بہادر شاہ اول کے عہد میں دارالسلطنت دلی میں ایک نیا مدرسہ امیر غازی الدین خاں فیروز جنگ نے جو سلطنت آصفیہ کے بانی آصف جاہ اول کے والد بزرگوار تھے، اجمیری دروازہ کے قریب قائم کیا، اس مدرسہ کے لیے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی گئی تھی، امیر موصوف اسی مدرسہ میں ۱۱۲۲ھ میں مدفون ہوئے، اس مدرسہ کے بعض کھنڈر آج تک عہد رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔

یہ مدرسہ مدتوں تک جاری رہا، دلی پر انگریزی عملداری ہو جانے کے بعد انگریزوں نے بھی اس کو تعلیم گاہ کے طور پر استعمال کیا، پھر نواب اعتماد الدولہ فضل علی خاں وزیر اودھ نے اس مدرسہ کے اخراجات کے لیے ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی گراں قدر رقم انگریزی کمپنی کے حوالہ کی، چنانچہ کمپنی کی طرف سے غازی الدین خاں کے مقبرہ پر حسب ذیل عبارت کندہ کی گئی،

کتبہ مقبرہ غازی الدین خان

نہ ہر لوح نقشے بماند ولیک جز از عمل ماند و نیک نام

بیاد حسنات نواب اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خاں بہادر سہراب جنگ کہ یک

---

[۱] مرآت احمدی ج ۱ ص ۴۰۸،

داک، و ہفتاد ہزار روپیہ برائے ترقی علوم در مدرسہ ہذا واقع دہلی خاص مولود وطن خویش
بہ صاحبان کمپنی انگریز بہادر تفویض نمودہ اند منقوش گردیدہ ۱۸۲۹ء[۵۱]،

محمد شاہ (۱۱۳۱ھ-۱۱۶۱ء) کی حکومت کے زمانہ میں نواب شرف الدولہ ارادت خاں نے دلی کے بازار دریبہ میں سر راہ ایک مدرسہ ۱۱۲۵ھ میں تعمیر کرایا، اس مدرسہ سے ملحق ایک مسجد بھی ہے، اس کی پیشانی پر یہ ایک منظوم کتبہ کندہ ہے، جس سے آخری شعر سے تاریخ نکلتی ہے:-

سال تاریخ بنا گفت خرد　　قبلۂ حج ارادت کیشاں
۱۱۳۵

اسی طرح احمد آباد گجرات میں اسی زمانہ میں مولانا نور الدین احمد آبادی متوفی ۱۱۵۵ھ نے ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا، اور اس میں ان کی مسند درس بچھی ہوئی تھی اور درس و تدریس کا فیض جاری تھا[۵۲]،

بہادر شاہ اول کے زمانہ میں ایک مدرسہ فرخ آباد میں فخر المدارس کے نام سے قائم تھا، اس کے بانی ایک صاحب علم مولوی ولی اللہ نامی تھے، مولوی علم الدین اور مولوی نعیم الدین نے اس مدرسہ میں تعلیم پائی تھی،

اسی طرح اس دور کے چند دیگر مدارس کے تذکرے ملتے ہیں، جن کے نام گنانے کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن اسلامی سلطنت کے دور اضمحلال میں ہونے کی وجہ سے ان مدرسوں کا کوئی تعلق حکومت سے نہیں تھا، کیوں کہ جاہ پسند امراء مختلف صوبوں کی ولایتوں اور بڑے عہدوں پر قابض تھے، ان کے پیش نظر سب سے زیادہ ان کی

---

[۵۱] آثار الصنادید باب سوم ۳۱-۳۲، سر سید مرحوم نے اس عمارت کا مفصل حال لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ مدرسہ احمد شاہ بادشاہ اور عالمگیر ثانی کے عہد میں تیار ہوا لیکن یہ صحیح نہیں، جیسا کہ اوپر گذرا، اس کے بانی غازی الدین فیروز جنگ محمد علی معظم بہادر شاہ اول کے دور میں وفات پا چکے تھے، اور اسی مدرسہ میں مدفون ہوئے،
[۵۲] آثار الصنادید باب سوم ص ۲۴، [۵۳] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۱،

کی ذاتی سیاسی مصلحتیں تھیں، ان مدارس کا سارا بار دیں دار ارباب ثروت اپنے اوپر اٹھائے ہوئے تھے، لیکن رفتہ رفتہ سلطنت کی ابتری کا اثر ملک کے تعلیمی نظام پر بھی طاری ہوا، چناں چہ سلطنت کے دورِ زوال کے شروع ہونے کے کچھ دنوں بعد عمومی طور پر ہندوستان کے تعلیمی نظام اور اسلامی مدرسوں میں اختلال پیدا ہوا، اور اس دور میں اگر کسی فرمان روا کے زمانہ میں کہیں کوئی مدرسہ تعمیر پایا یا تعلیمی وظیفے جاری ہوئے، تو عمالِ سلطنت نے بڑے بڑے تعلیمی اوقاف ضبط بھی کرلیے، چناں چہ مولانا غلام علی آزاد نے اس دور کی تعلیمی رفتار کا نقشہ موثر انداز میں کھینچا ہے، اور اسی سے سارے ہندوستان کے تعلیمی حالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"تا آں کہ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبہ اودھ شد و اکثر بلاد عمدہ صوبہ الہ آباد نیز مثل دار الخیر جون پور، بنارس، غازی پور، کڑہ مانک پور، کوڑہ جہان آباد، وغیرہ با ضمیمۂ حکومت گردید وظائف و سیور غالات خاندان ہائے قدیم بہ جبر یک قلم ضبط شدہ و کار شرفا و نجبا بہ پریشانی کشید و اضطرار معاش مردم آں جا را از کسب علم باز داشتہ در پیشۂ سپاہ گری انداخت و رواج تدریس و تحصیل بہ آں درجہ نماند و مدارسے کہ از عہد قدیم معدن علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد و انجمن ارباب کمال پیش تر برہم خورد"[1]،

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

و بعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہر زادہ او ابو المنصور خاں صفدر جنگ رسید و وظائف و اقطاعات بہ دستور زیر ضبط ماند و در اواخر عہد محمد شاہ ۱۱۵۹ھ صوبہ داری الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد، و تتمۂ وظائف آں صوبہ کہ تا حال از آفت ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط در آمد و در عہد احمد شاہ صفدر جنگ بہ پایۂ وزارت اعلیٰ صعود نمود و نائب صوبہ کار بر ارباب وظائف تنگ تر گرفت و تا حین تحریر کتاب این دیار پامال حوادث روزگار است[1]

با ایں ہمہ ہندوستان کے دین دار علماء اپنے دینی اخلاص، اصلاح و تقویٰ اور ایثار
سے ہندوستان کے قدیم اسلامی نظام تعلیم کی عمارت کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالے رہے،
مدرسوں کی بوسیدہ عمارتوں میں قال اللہ و قال الرسول کا درس جاری رکھا، پھر
اس دور سے اس زمانہ تک ایسے ارباب خیر بھی رہے، جو مدرسوں کو چلاتے، نئی عمارتیں
بنواتے، اور طلبہ کے مصارف کا بار اٹھاتے رہے، جزاہم اللہ،

(اکتوبر ۱۹۳۷ء)

بنگال و بہار میں عہدِ نظامت و دیوانی

اور اُس کا خاتمہ

اور برطانوی اثر و اقتدار کا آغاز

"صوبہ بنگال کی مال گذاری کی ابتدائی تاریخ" کے عنوان سے مسٹر ایف، ڈی، اسکولی نے ڈھاکہ یونی ورسٹی میں چند لکچر دیے تھے، ان میں انھوں نے پارلیمنٹ کی روداد وں، کمیشنوں کی رپورٹوں اور دوسری سرکاری یادداشتوں کے مستند ماخذوں سے حکومت بنگال و بہار کے مختلف دوروں میں مال گذاری کے متعلق حکومت کی مختلف حکمت عملیاں دکھاکر بند و بست دوامی پر لاکر اس بیان کو ختم کیا ہی، ان لکچروں کا مجموعہ کتاب کی شکل میں شایع ہوا ہی[1]

اس کتاب سے برطانوی عہد کے آغاز میں بنگال و بہار کے کسانوں کے معاشی حالات اور ان کے ساتھ حکومت کا طرزِ عمل اور زمینداری و کاشت کاری نظام کے رواج پذیر ہونے کے اسباب پر روشنی پڑتی ہی،

مصنف نے اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پیشتر کتاب کا پہلا باب "بنگال سلطنت مغلیہ کے صوبہ کی حیثیت سے اور مملکت برطانوی کا آغاز" کے عنوان سے لکھا ہی، تاکہ اصل مبحث کے سمجھنے میں آسانی ہو، مصنف نے اس میں بڑی جامعیت و اختصار سے بنگال کے عہدۂ نظامت و دیوانی کی سرگذشت اور برطانوی اثر و نفوذ کے آغاز کو دکھایا ہی، راقم سطور کو اس کتاب کے اس باب کی جامعیت غیر معمولی طور پر پسند آئی، اور اس کی تلخیص کرکے اشاعت کے لیے بھیج دیا، اس مجموعہ کی ترتیب کے وقت اس تلخیص کا تراشہ بھی نگاہ کے سامنے آیا، اور اس کی افادی حیثیتوں کی جہت سے اس مجموعہ سے اس کو علیحدہ رکھنے

---

[1] ابھی حال میں اس کا اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے بھی شایع ہوگیا ہی،

پر طبیعت مائل نہ ہو سکی، اس کو مصنف اور دارالترجمہ کے شکریہ کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے

مغلوں کے عہد میں بنگال کا الحاق

مغلوں نے ۱۵۷۶ء میں پہلی مرتبہ اکبر کے عہد حکومت میں بنگال کو قطعی طور پر فتح کیا، اور بنگال کا آخری خود مختار بادشاہ داؤد خاں مارا گیا،

۱۵۷۶ء سے اورنگ زیب کے سال وفات ۱۷۰۷ء تک صوبہ بنگال کی نشو و نما صوبہ داروں کی نگرانی میں جاری رہی، اور یہ مرکزی حکومت کے نہایت زرخیز صوبوں میں شمار کیا گیا، چناں چہ اس کے محاصل دوسرے صوبوں کی بہ نسبت سہ چند تھے، جاگیرداری تنظیم کے اصول پر (۸۰۱،۱۵۸) پیادہ فوج (۲۷۳۳) سوار (۴،۲۶۰) توپیں اور ہاتھیوں اور مسلح کشتیوں کی ایک بڑی تعداد مہیا رہتی تھی، (آئین اکبری جیارٹ ج ۲ ص ۱۲۹) ظاہر ہے کہ اس عہد میں اتنی قوت کا صوبہ دار ایک طاقت ور حلیف اور خطرناک غنیم ہوسکتا تھا، اس لیے ۱۵۷۶ء سے ۱۷۰۷ء تک بنگال میں جو ۲۷ صوبہ دار (گورنر) گزرے، وہ یا تو بہ ذات خاص قابل اعتماد اکابر تھے، یا مغل شہنشاہ سے ان کا قریبی تعلق تھا،

بنگال کے صوبہ داروں کے دور

اکبر سے اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے صوبہ داروں کے لحاظ سے دو دور قائم کیے جاسکتے ہیں، پہلا دور سال الحاق ۱۵۷۶ء سے اکبر کی وفات ۱۶۰۵ء تک کا ہے، اس دور میں راجہ ٹوڈر مل جلیل القدر ماہر مالیات (۱۵۸۰ء ۱۵۸۲ء) اور راجہ مان سنگھ (۱۵۸۶ء - ۱۶۰۴ء) بڑے اہم صوبہ دار گذرے ہیں، ۱۵۷۶ء سے ۱۵۹۲ء تک بنگال کا دارالسلطنت، شمالی بنگال کا دارالسلطنت شمالی بنگال کا مرکزی مقام ٹانڈہ رہا، اور پھر یہاں سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر راج محل میں منتقل کر دیا گیا، دارالسلطنت کا محل وقوع حکومت کے نظام کے لیے ایک اہم شے ہے، کیوں کہ اس کی دوری اور نزدیکی کی وجہ سے نائبوں کا تقرر لازمی پڑتا ہے، چناں چہ جب راجہ مان سنگھ ۱۵۷۹ء میں چار سال کے لیے بہار چلا گیا، تو اس نے سعید خان کو اپنے نائب کی حیثیت سے ٹانڈہ میں متعین کر دیا،

پھر اس دور کے یہ دو واقعے بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں، اول یہ کہ سنہ ۱۵۷۹ء میں دیوان یا وزیر مال کا عہدہ قائم کیا گیا، جس کے سر مال گذاری کی جملہ امور کی ذمہ داری عائد کی گئی، اب صوبہ دار مالیات کے بندوبست کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا۔ دوسرا واقعہ یہ کہ سنہ ۱۶۰۵ء میں مرکزی حکومت کے سامنے صوبہ بنگال کی اہمیت اس وقت پہلی مرتبہ آشکارا ہوئی، جب راجہ مان سنگھ سابق صوبہ دار نے اکبر کی وفات کے وقت اپنے ایک زیر حمایت شہزادے کو تخت نشین کرانے کی ناکام کوشش کی،

دوسرے دور سنہ ۱۶۰۵ء سے سنہ ۱۷۰۷ء تک میں ۱۹ صوبہ دار ہوئے جن میں شاہ جہاں (سنہ ۱۶۲۲ء سنہ ۱۶۲۵ء)، سلطان محمد شجاع (سنہ ۱۶۳۹ء سنہ ۱۶۶۰ء) اور سلطان محمد اعظم (سنہ ۱۶۷۸ء سنہ ۱۶۷۹ء) خاقان وقت کے بیٹے تھے، عظیم الشان شہنشاہ وقت کا پوتا تھا اور قطب الدین (سنہ ۱۶۰۶ء سنہ ۱۶۰۷ء) ابراہیم خان (سنہ ۱۶۱۷ء سنہ ۱۶۲۲ء) شایستہ خاں (پہلی مرتبہ از سنہ ۱۶۶۴ء سنہ ۱۶۷۷ء) دوسری مرتبہ از تا سنہ ۱۶۸۹ء) اور اعظم خاں (سنہ ۱۶۷۷ء سنہ ۱۶۷۸ء) کسی نہ کسی رشتہ سے خاندانِ شاہی سے وابستہ تھے، ان صوبہ داروں میں شاہ جہاں، سلطان محمد شجاع، اور شایستہ خاں نمایاں قابلیت کے اشخاص تھے، باقی دوسرے صوبہ داروں میں سے جن کی مدت حکومت ۲۷ سال ہوتی ہو، صرف اسلام خاں (سنہ ۱۶۰۸ء سنہ ۱۶۱۳ء) اور میر جملہ (سنہ ۱۶۶۰ء سنہ ۱۶۶۴ء) قابل ذکر ہیں،

اس دور میں بنگال نے تدریجی ترقی کی، سرحدی علاقے وسیع اور مستحکم کیے گئے، اور بنگال سلطنت مغلیہ کا سب سے زیادہ زرخیز اور اہم صوبہ بن گیا، اس کی اہمیت دوبارہ سنہ ۱۶۲۲ء میں اس وقت ظاہر ہوئی، جب شاہ جہاں نے جہانگیر سے بغاوت کر کے اڑیسہ بنگال، اور بہار کو فتح کر لیا، پھر سنہ ۱۶۵۷ء میں سلطان محمد شجاع نے بنگال میں علم بغاوت بلند کیا، اور سنہ ۱۶۶۰ء تک سلطنت مغلیہ کے خوف کا موجب رہا۔ اس کے بعد سنہ ۱۷۰۷ء یعنی اورنگ زیب کے انتقال تک بنگال سلطنت مغلیہ کا حقیقی حصہ بنا رہا، اس دور میں ذیل کے امور قابل توجہ ہیں،

۱۔ صوبہ کی وسعت اور اس کا دار السلطنت :

۲۔ دیوان کا عروج اور صوبہ دار سے اس کے تعلقات،

۳۔ بنگال میں برطانوی عہد کا آغاز،

صوبہ کی وسعت اور اس کا دارالسلطنت

سنہ ۱۶۰۷ء تک بنگال، بہار، اور اڑیسہ صرف ایک ہی صوبہ دار کے تحت میں تھے، سنہ ۱۶۰۷ء میں جب بنگال و اڑیسہ کی صوبہ داری پر جہانگیر علی خاں مقرر ہوا، تو اسی وقت سے بہار کو ایک علیحدہ صوبہ قرار دے کر اسلام خاں کو اس کا صوبہ دار بنایا گیا، یہ تقسیم سنہ ۱۶۹۷ء تک قائم رہی،

اس تقسیم کے بعد ہی جب سنہ ۱۶۰۸ء میں اسلام خاں صوبہ بنگال کے صوبہ دار کا جانشین بنا تو اس نے بنگال کا مستقر راج محل کے بجائے ڈھاکہ کو قرار دیا، کیوں کہ اس کا محل وقوع مرکز میں تھا، اور یہاں سے ساحل اراکان کی نگرانی کی جا سکتی تھی، جہاں پرتگالی اور مراگھی جنگی جہاز آ کر لوٹ مار مچاتے تھے، اس وقت سے عظیم الشان کی صوبہ داری تک بجز اس زمانہ کے جب کہ سلطان محمد شجاع (سنہ ۱۶۳۹ء تا سنہ ۱۶۶۰ء) صوبہ دار تھا، ڈھاکہ، بنگال کا دارالسلطنت رہا، سلطان محمد شجاع کے زمانہ میں راج محل پھر صوبہ کا مستقر بن گیا تھا،

اس کے بعد سنہ ۱۶۹۷ء میں شہنشاہ وقت کے پوتے عظیم الشان کی صوبہ داری کے زمانہ میں تینوں صوبے دوبارہ ملا دیے گئے، اس نے ابتدا سنہ ۱۷۰۴ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم کے مطابق راج محل کو صوبہ کا مستقر قرار دیا، اور اس کے بعد بنگال کا دارالسلطنت عظیم آباد پٹنہ قرار پایا، پھر سنہ ۱۷۰۶ء میں شہنشاہ کا دوسرا فرمان پہونچا کہ عظیم الشان اپنے بیٹے فرخ سیر کو جو سنہ ۱۷۰۳ء سے بنگال کا نائب صوبہ دار بن کر ڈھاکہ میں مقیم تھا، بنگال و اڑیسہ کی صوبہ داری کے لیے چھوڑ دے، اور سربلند خاں بہار میں نائب صوبہ دار بنایا جائے،

ناظم و دیوان یا گورنر اور وزیر مال

آئینِ اکبری میں صوبہ کے حاکم کو اصطلاحاً "سپہ سالار" کہا گیا ہے، گو وہ وائسرائے کی

حیثیت سے کشوری و عسکری دونوں قسم کے جملہ امور میں شہنشاہ کی نمایندگی کرتا تھا، اس کے بعد اسے صوبہ دار کہا گیا، پھر "نواب ناظم" کی اصطلاح قائم ہوئی، الغرض اس دور میں ۱۶۹۷ء تک ایک ناظم صوبہ بنگال، واڑیسہ پر اور ایک بہار پر حکم راں رہا، البتہ شاہ جہاں اپنی باغیانہ حکومت بنگال کے زمانہ (۱۶۲۲ء ۱۶۲۵ء) میں ان تینوں صوبوں کا واحد حکم راں تھا، اور اس نے بنگال و بہار میں اپنے دو نائب ناظم مقرر کیے تھے،

پھر ۱۶۲۵ء میں جب مہابت خاں بنگال کی گورنری کے لیے نام زد کیا گیا، اور سپہ سالار اعظم کی خدمات کی انجام دہی کے لیے مرکزی حکومت ہی میں روک لیا گیا: تو خان زادہ خاں کو بنگال کے نائب ناظم کی حیثیت سے روانہ کیا گیا، اسی طرح سیف خاں نے ۱۶۳۹ء ناظم سلطان محمد شجاع کی آمد تک اس کی نیابت کی، اسی طرح ۱۶۹۷ء تک نائب ناظموں کا تقرر وقتاً فوقتاً ہوتا رہا، مگر انھوں نے اس وقت تک کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں کی تھی، یہاں تک کہ صوبہ کے دیوان کو عروج حاصل ہوا،

دیوان کا عہدہ ۱۵۷۹ء میں اکبر نے قائم کیا تھا، وہ حکومت کا وزیر مال ہوتا تھا، جس کے فرائض میں مال گزاری کی وصولی، سرکاری رقم کے مصارف کی ذمہ داری، اور دیوانی مقدمات کا تصفیہ کرنا داخل تھا، وزیر مال کا انتخاب صوبوں کے لیے بھی شہنشاہی کے فرمان سے ہوتا، اور وہ قانوناً صوبہ دار کے ماتحت سمجھا جاتا تھا، ناظم، صوبہ کے عام نظم و نسق کا ذمہ دار تھا، اور دیوان صوبوں کے مالی کاروبار کی دیکھ بھال کرتا تھا،

صوبہ بنگال و بہار میں ۱۷۰۱ء سے دیوان کے عروج کا زمانہ مرشد قلی خاں کے دیوان مقرر ہونے سے شروع ہوتا ہے، مرشد قلی خاں ۱۷۰۳ء میں ان تینوں صوبوں کے عہدۂ دیوانی کے علاوہ بنگال واڑیسہ کا نائب ناظم بنایا گیا، اور سید حسین علی خاں بہادر کا نائب ناظم مقرر ہوا، ان دونوں نائب ناظموں نے غیر معمولی اقتدار حاصل کر لیا، خصوصاً مرشد قلی خاں کے قبضہ میں مالیات کے ہونے سے اسے مزید تفوق حاصل ہوا، مرشد قلی خاں نے اپنا مستقر مرشد آباد کو قرار دیا، اس طرح اورنگ زیب کے انتقال کے وقت ۱۷۰۷ء میں ان تینوں صوبوں پر حسب ذیل عہدہ دار تھے،

صوبہ	ناظم	نائب ناظم	دیوان
بنگال	عظیم الشان	مرشد قلی خاں	مرشد قلی خاں
بہار	عظیم الشان	سید حسین علی خاں	مرشد قلی خاں
اڑیسہ	عظیم الشان	مرشد قلی خاں	مرشد قلی خاں

بنگال میں برطانوی اثرات کی ابتداء

بنگال میں انگریزوں کا تعلق سترھویں صدی سے پیدا ہوا، وہ پہلی مرتبہ ۱۶۳۲ء میں مدراس سے کٹک آئے، ۱۶۳۳ء میں دو تجارتی کوٹھیاں ہرپیش پور اور بالاسور میں قائم کیں، سلطان محمد شجاع اور شایستہ خاں کے عطا کردہ اجازت ناموں سے ۱۶۶۰ء تک تین صدر کوٹھیاں ہگلی، قاسم بازار، اور بالاسور میں قائم کر چکے تھے، نیز کمپنی کی نگرانی میں ڈھاکہ اور پٹنہ میں بھی کوٹھیاں قائم ہوئیں، پھر ۱۶۸۱ء میں کمپنی نے خلیج بنگال کی اہمیت محسوس کرکے بنگال کو ولیم ہیجیس کی گورنری میں دے کر اسے مدراس سے بے تعلق کرکے اسے مستقل تجارتی علاقہ قرار دیا، اس وقت سے بنگال سے کمپنی کے مستقل تجارتی اغراض وابستہ ہو گئے، پھر ۱۶۹۱ء میں کفایت خاں دیوان ڈھاکہ کے نام شہنشاہ کے احکام موصول ہوئے، کہ انگریزوں کو تین ہزار روپیہ ادا کرنے پر آزادانہ تجارت کا پروانہ دے دیا جائے، ۱۶۹۶ء میں کمپنی نے کلکتہ میں ایک قلعہ کی تعمیر کی اجازت اس وقت حاصل کی، جب سبھا سنگھ کی سرکشی جاری تھی، عظیم الشان کے صوبہ داری پر فائز ہونے کے بعد کمپنی کو پہلا ملکی علاقہ نصیب ہوا، اور ۱۶۹۸ء میں ناظم و دیوان کی بارگاہ میں شایان شان نذر پیش کرنے کے بعد انگریزوں کو اجازت دی گئی کہ وہ کلکتہ، ستانوٹی، اور گوبندپور ان تینوں موضعوں کی ٹھیکہ داری کا حق ان کے موجودہ مالکوں سے خرید لیں، اس طرح انگریزوں نے ایک ہزار ایک سو چھیانوے روپیہ چھ آنے سالانہ مال گزاری پر بنگال میں پہلی مرتبہ حقیقت زمینداری خرید لی،

بنگال کے ناظم و دیوان کے اختیارات کلی

اورنگ زیب کے انتقال کے ساتھ ہی حکومت مغلیہ کا شیرازہ بکھرنے لگا،

جب ۱۷۱۲ء میں عظیم الشان جو بنگال و بہار و اڑیسہ کا برائے نام ناظم تھا، تاج و تخت کی لڑائی میں مارا گیا، تو ان تینوں صوبوں کے ناظم کی جگہ خالی ہوگئی، ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد مرشد قلی خاں نے ان تینوں صوبوں کی نظامت پر اپنا تقرر کرا لیا، اب ناظم کا صدر دفتر قطعی طور پر مرشد آباد قرار پایا، بہار و اوڑیسہ میں مرشد قلی خاں خود نظامت و دیوانی کے اختیارات سے کام لیتا رہا، اور بنگال اور کبھی اوڑیسہ میں وقتاً فوقتاً سید اکرام خاں شجاع الدین خاں، سید رضا خاں، لطف اللہ اور سرفراز خاں نیابت نظامت دیوانی کے عہدوں پر سرفراز ہوتے رہے،

موروثی نظامت اس دور میں پہنچ کر سلطنت مغلیہ میں اتنی طاقت باقی نہ رہ گئی تھی، کہ وہ دور دراز صوبوں پر اپنی نگرانی قائم رکھتی، پہلے نظامت و دیوانی کے عہدہ داروں کا تقرر شہنشاہ کا اختیاری فعل تھا، اب مرشد قلی خاں کے زمانہ سے ناظم کا عہدہ موروثی قرار پایا، اور دیوان کا منصب مرحمت و نوازش پر موقوف ہوگیا،

شجاع الدین خاں ناظم چناں چہ نواب مرشد قلی خاں کی وفات کے بعد اس کا داماد شجاع الدین خاں (۱۷۲۵ء۔ ۱۷۳۹ء) ناظم ہوا، اس نے اپنے بیٹے سرفراز خاں کو اپنا دیوان مقرر کیا، مرزا لطف اللہ تبریزی کے ساتھ جو اس کا نائب دیوان تھا، نائب ناظم کے عہدہ پر قائم رہا، پھر جب یہ دونوں اڑیسہ منتقل ہوگئے، تو سرفراز خاں کو دیوان کے عہدہ پر بحال رکھنے کے علاوہ اسے نائب ناظم بھی نام نہاد طور پر بنایا گیا، مگر در اصل غالب علی خاں، جسونت راؤ نائب دیوان کے ساتھ منصرمانہ طور پر کام انجام دیتا رہا،

سرفراز خاں ناظم شجاع الدین خاں کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خاں (۱۷۳۹ء۔ ۱۷۴۰ء) نے نظامت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی، اس کے زمانہ میں عہدہ دیوانی کے فرائض ایک مجلس جو حاجی احمد اور جگت سیٹھ پر مشتمل تھی، انجام دیتی رہی اور بہار کی نظامت پر علی وردی خاں مامور کیا گیا،

علی وردی خاں مہابت جنگ ناظم

علی وردی خاں مہابت جنگ (۱۷۴۰ء-۱۷۵۶ء) سرفراز خاں کے بعد اس مسند پر بیٹھا، نوازش محمد خاں دیوان صوبہ جات اور نائب ناظم ڈھاکہ مقرر ہوا، اور حسین الدین خاں اس کا نائب اور اس کے قتل کے بعد ۱۷۵۴ء میں راجہ راج بلبھ کے توسط سے حکومت کی، اور صوبہ بہار میں نواب زین الدین خاں ہیبت جنگ نے اس کی نیابت کی، اور اڑیسہ میں صولت جنگ نائب ناظم رہا،

سراج الدولہ ناظم ۱۷۵۶ء-۱۷۵۷ء

سراج الدولہ (۱۷۵۶ء-۱۷۵۷ء) علی وردی خاں کا نواسہ تھا۔ اس نے موہن لال کو اپنا دیوان بنایا، اور جسارت خاں ۱۷۵۶ء سے ۱۷۸۱ء تک ڈھاکہ کا نائب ناظم رہا،

برطانوی اثر کی ترقی اور سرمایہ داری

اس کے بعد صوبہ بنگال و بہار کی سیاسی تاریخ میں میر جعفر میر قاسم کی نظامت اور اس عہد کی مشہور لڑائیوں اور شاہ زادہ عالی گہر (شاہ عالم بادشاہ) اور انگریزوں کی جنگ کے مشہور واقعات پیش آئے، جن کے بعد برطانوی طاقت ان صوبوں پر پورے طور پر مستولی ہو گئی،

انگریزوں نے مرشد قلی خاں کے زمانہ میں ۱۷۱۷ء میں شہنشاہ فرخ سیر سے کلکتہ کے قریب مزید ۳۸ مواضعات کی خریداری کا فرمان شاہی آٹھ ہزار ایک سو اکیس روپے آٹھ آنے سالانہ شرح محصول پر حاصل کر لیا، مگر مرشد قلی خاں کی زبردست شخصیت ان مواضعات کی خریداری میں خاطر خواہ مزاحم ہوئی، اس کی وفات کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت اس کے دو جانشینوں کے زمانہ میں بغیر روک ٹوک کے چلتی رہی، پھر علی وردی خاں کے زمانہ میں وہ مرہٹہ حملہ آوروں کے ساتھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کرناٹک کے معاملات میں مصروف رہے، جس کی وجہ سے بنگال کی تجارت اور ان دونوں قوتوں کے متضاد سیاسیات میں کسی قدر سکون رہا، سراج الدولہ کے زمانہ میں جو انگریزوں کا دشمن مشہور تھا، ان دونوں طاقتوں میں تصادم ہوا، ۱۷۵۶ء میں سراج الدولہ نے

کلکتہ پر قبضہ کرلیا، اس کے ایک سال کے بعد انگریزوں نے شہر کو دوبارہ چھین لیا، پھر ۹ر فروری ۱۷۵۷ء کو سراج الدولہ نے کسی قدر دب کر صلح کی، اور معاہدہ کے رو سے کمپنی کے تجارتی حقوق متعلقہ بنگال کی توثیق کی گئی، اور وہ ۳۸ گانوں جو ۱۷۱۷ء میں مرشد قلی خاں کے زمانہ میں شاہی فرمان کے بموجب انگریزوں کو مل چکے تھے، اور مرشد قلی خاں نے ان پر قبضہ نہ ہونے دیا تھا، ان پر انگریزوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا، لیکن ماہ جون کے اوائل میں پھر مخالفت پیدا ہوگئی، میر جعفر میدان سیاست میں آیا، ۹ر فروری کے معاہدہ کی تکمیل کے عوض اسے ناظم مقرر کیا گیا، پھر پلاسی کی جنگ، سراج الدولہ کی موت، ۲۹ر جون کو ناظم بنگال وبہار واڑیسہ کی حیثیت سے میر جعفر کی سربلندی، یہ واقعات جلد جلد یکے بعد دیگرے پیش آئے، ۲۰ر دسمبر کو میر جعفر سے ایک نیا معاہدہ کرایا گیا، جس میں ۹ر فروری کے معاہدہ کی تصدیق کے علاوہ کمپنی کے حاصل کردہ رقبۂ اراضی میں ۸۸۲ مربع میل کا ایک ضلع جو ۲۴ پرگنوں پر مشتمل ہو، اور جو آج تک ضلع چوبیس پرگنہ ہی کے نام سے مشہور ہو، انگریزوں کی زمینداری میں دولاکھ بائیس ہزار نو سو اٹھاون روپے سالانہ مال گذاری پر اضافہ کیا گیا، یہ گویا بنگال میں کمپنی کے اہم ملکی علاقہ کی ابتدا ہو، تاہم ابھی قانوناً نھیں کما اختیارات حاصل نہیں ہوے، بلکہ وہ ناظم کے زبردست، زمیندار کی حیثیت رکھتے تھے، مگر عملاً اس وقت کمپنی ہی بنگال میں حکمراں طاقت تھی،

اس کے بعد ۱۳ر جولائی ۱۷۵۹ء کو چوبیس پرگنوں کی آمدنی شہنشاہی خدمات کی بجاآوری کے صلہ میں جاگیر کے طور پر کلائیو کے نام لکھ دی گئی، پھر ۲۳ر جون ۱۷۶۵ء کو اس عطیہ کی توسیع دس سال کی مدت کے لیے کی گئی، اور اس کے ساتھ طے پایا، کہ اس کے بعد کمپنی کے سارے حقوق مل جائیں گے، جو شاہی مطالبات مال گذاری سے مستثنیٰ رہیں گے،

پھر جب میر جعفر کی برطرفی کے بعد قاسم علی خاں ناظم مقرر ہوا، تو ۲۷ر ستمبر ۱۷۶۰ء کو ایک نیا معاہدہ ہوا اور فوج کے مصارف کے نام سے ایک وسیع علاقہ مال گذاری کی

معافی کے ساتھ کمپنی کو عطا کیا گیا، جو بردوان، مدناپور، اور چٹاگانگ کے اضلاع پر مشتمل تھا، اس علاقہ کا رقبہ آٹھ ہزار ایک سو آٹھ مربع میل تھا، ۶ رجولائی ۱۷۶۲ء کو میر جعفر نے نظامت پر دوبارہ فائز ہونے کے بعد تصدیق کی، اور ۱۲ ر اگست ۱۷۶۵ء کو آخر کار شہنشاہ نے بھی اس پر مہر تصدیق لگا دی، اور کمپنی کلکتہ (۱۶۹۸ء) چوبیس پرگنہ (۱۷۵۷ء) بردوان، مدناپور و چٹاگانگ (۱۷۶۰ء) کے اضلاع میں تاریخ حصول قبضہ سے تحصیل مال گذاری کے ساتھ امور انتظامی بھی اپنے خاص کارکنوں کے ذریعہ انجام دیتی رہی،

اس کے بعد ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں شاہ عالم و نواب اودھ پر میجر منرو کی فتح یابی سے بنگال میں برطانوی سکہ پورے طور پر جم گیا، جنوری ۱۷۶۵ء میں ناظم کی وفات پر کمپنی نے اس کے بیٹے نجم الدولہ کی جانشینی اس شرط پر قبول کی، کہ نظم و نسق ایک نائب ناظم یا صوبہ دار کے سپرد ہوگا، جس کا انتخاب کمپنی کرے گی، چنانچہ محمد رضا خاں اس خدمت کے لیے منتخب کیا گیا، پھر ۱۲ ر اگست ۱۷۶۵ء کو شہنشاہ نے کمپنی کو صوبہ بنگال، بہار، اور اوڑیسہ کا دیوان مقرر کیا، اور کمپنی پر یہ فرض عائد کیا، کہ وہ شہنشاہ کو ۲۶ لاکھ روپے اور ناظم کے عملے کے کل مصارف ادا کر کے ان تینوں صوبوں کے محاصل وصول کر لیا کرے، اس کے بموجب ۳۰ ر ستمبر کو ناظم نے انگریزوں کو ان صوبوں کا دیوان تسلیم کیا، شہنشاہ کی جانب سے اس عہدہ پر ۱۷۰۰ء کے بعد یہ پہلا تقرر تھا، کمپنی نے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے محمد رضا خاں کو نائب دیوان مقرر کیا،

اسی وقت سے بنگال میں مال گذاری کے برطانوی نظم و نسق کی بنا پڑی، اس وقت کمپنی ان صوبوں میں ویسی ہی خود مختار تھی، جیسے اورنگ زیب کے انتقال کے وقت مرشد قلی خاں با اقتدار تھا، دونوں کو قانوناً دیوان کا منصب حاصل تھا، اور دونوں کو عملاً ناظم کے اختیارات حاصل تھے، شاہی اقتدار کی وقعت و حیثیت بجز نمود و نمایش کے کچھ اور نہ باقی نہ تھی، مرشد قلی خاں

کے عارضی شان دار دور کے مقابلہ میں برطانوی نظم ونسق کی مستقل کامیابی کا
باعث زیادہ تر یہ تھا کہ ایک سند یافتہ جماعت کے لیے جو اپنے ملک و قوم کی
خدمت کرنا چاہتی ہو، ایک فرد پر فطری تفوق حاصل ہوتے ہیں، اور اس
کے لیے کامیابی کے بہتر ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں۔

(جون ۱۹۳۶ء)

آب گلہ کا گورغریباں

آبگلہ شہر گیا سے دو میل جانب مشرق سادات کی اجڑی ہوئی ایک قدیم بستی ہے، گو اس کی کوئی مرتب و مستند تاریخ محفوظ نہیں، لیکن اس کی عظمت و جلال کا اندازہ اس کے کھنڈروں اور ان کی ٹوٹی پھوٹی سنگی دیواروں سے ہوتا ہے، اس قصبہ کے مورث اعلیٰ حضرت مینا مشہدی تھے، کسی تذکرہ میں نظر سے گذرا تھا، نیز خاندانی روایات سے سننے میں آیا ہے، کہ یہ دو بھائی تھے، ایک دلی کی شاہی مسجد کی امامت پر سرفراز ہوئے، دوسرے یہ حضرت مینا مشہدی کوڑا مانک پور ہوتے ہوئے پورب آئے، جہاں دربار شاہی سے چند گانوں انھیں معافی میں ملے تھے، تاکہ یہاں رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیں،

حضرت شاہ عطا حسین رحمہ اللہ اپنی کنز الانساب (تصنیف سنہ ۱۲۶۰ھ) میں لکھتے ہیں:-

.. .. رضوی ہستند، بسیار بہر شہر و امصار و دیار بلکہ اکثر اند .. ..

.. .. دریں بدار دو سادات ساکنان موضع آبگلہ کہ نسبت مصاہرت دارند، واضح باد در زمان ماضی سلاطین بزرگے بودند، مشاہیر منصب قضا داشتند، قاضی سید عبد الاحد عرف قاضی سید بڑے رضوی نسب بودند، فرزندشان قاضی احمد علی .. ..[1]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:-

واضح باد کہ از بزرگان مشایخان قدیم کہ آں را بالا از دو صد سال گذشتہ باشد از سادات مشہدی تشریف آوردند در دیار بدان موضع (آبگلہ) کردند سکونت

---

[1] کنز الانساب مطبوعہ مطبع صفدری بندر بمبئی سنہ ۱۳۰۰ھ ص

اختیار، ہنوز اولاد شان دراں موضع ہستند موجود، سابقین بودند مامور
بمنصب قضا و افتا ۔۔ ۔۔ ۔۔ باید دانست نام آں بزرگ بود
حضرت بینا مشہدی رضوی نسب ۔۔ ۔۔ ۔۔
مرحوم حضرت شاد عظیم آبادی حیات فریاد میں لکھتے ہیں :۔
حضرت شاہ محب اللہ کی شادی حضرت قاضی سید منصور کی پوتی سے ہوئی تھی،
جن کا مزار موضع آب گلہ میں متصل شہر گیا ہے، قاضی سید منصور، قاضی سید اسمعیل
مشہدی کی اولاد سے تھے، اور حضرت اسمعیل مشہدی کی پوتے تھے، جن کا تذکرہ
بہ جلالت قدر ملا جامی نے اپنی ضخیم کتاب سلسلۃ الذہب میں کیا ہے، ملا جامی
نے بہ ایں عبارت یاد کیا ہے،
گویند چوں بمشہد رضا قابض می شد در شہا دیرا حضوری امام عالی مقام شد
والعلم عند اللہ!
علاوہ ازیں حضرت شہید رابع قاضی سید نور اللہ شوستری نے بھی حضرت ناصر
بن ہمدانی کا ذکر اپنی کتاب مجالس المومنین میں کیا ہے،
خانوادہ آب گلہ کے مصاہرانہ تعلقات حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی صاحب
اوراد فتحیہ سے بھی جن کا مزار وادی کشمیر میں مرجع خلائق ہے، نیز حضرت مخدوم الملک
شاہ شرف الدین بہاری قدس سرہ کا ایک مکتوب گرامی آب گلہ کے ایک بزرگ
کے نام سے مکتوبات صدی جلد دوم میں ہے، حضرت مخدوم الملک کی آمد و رفت
یہاں سے قائم تھی،
لیکن اب یہ قصبہ گویا عالم گم نامی میں ہے، اس کی تمدنی و علمی رفعت کے نشانات
مٹتے جاتے ہیں، مزارے کے کتبات تک برباد ہو چکے ہیں، قدیم کتبات میں صرف
ایک کتبہ زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ سکا ہے، وہ قاضی سید احمد علی کی لوح

---

[۱] کنز الانساب ص ۳۲۳، [۲] حیات فریاد ص ۱۹

زار کا ہو،

قاضی سید احمد علی قاضی سید بڑے کے خلف اکبر تھے، جن کا تذکرہ کنز الانساب کی عبارت میں اوپر گذرا،

قاضی سید احمد علی کے بڑے صاحب زادے مفتی سید ارشد علی تھے، جو مرشدآباد میں منصب افتا پر مامور تھے، اور اخیر عہد میں نواب مرشدآباد کے رزیڈنٹ کی حیثیت سے حکومت انگلشیہ کے دربار میں نمایندگی کرتے تھے، دوسرے صاحب زادے قاضی سید ارشاد علی گیا میں اپنے آبائی منصب قضا پر مامور تھے

حضرت مخدوم معظم ڈاکٹر قاضی سید اکرم امام علیہ الرحمہ المتوفی ماہ محرم سنہ ۱۳۵۱ھ اور حضرت موصوف کے برادر بزرگ حضرت مخدوم و مطاع جناب قاضی سید مظاہر امام متعنا اللہ بطول بقائہ اسی خاندان کے چشم و چراغ اور موخرالذکر ۸۳ سال کے زاہد شب زندہ ہیں، خداوند تعالیٰ ان کا سایہ تا دیر قائم رکھے،

یہ کتبہ نہایت نفیس سنگ مرمر پر ہو، جس کا طول و عرض ۱۶ ½ انچ اور دبازت انچ ہو، یہ لوح مزار بھی برباد کی جانے والی تھی، ستم شعاروں نے اس پتھر کی مالیت سے فائدہ اٹھانا چاہا، شب کے وقت قبر پر سے اکھیڑ لیا، لیکن قبرستان سے لے جانے نہ پائے تھے، کہ سپیدۂ صبح نمودار ہو گیا، اور اس کو وہیں چھوڑ کر انہیں بھاگ جانا پڑا، اہل خاندان اس آبائی تبرک کو گھر پر اٹھا لائے، پھر اس کے دوبارہ نصب کیے جانے کا موقع نہ آیا، اور آج تک مکان کے ایک گوشہ میں کھڑا بزرگوں کی عظمت رفتہ پر آنسو بہا رہا ہو،

اس کتبہ کی نقل ذیل میں درج ہو، کہ شاید آگے چل کر اس کا بھی نام و نشان

سلہ قاضی صاحب علیہ الرحمہ نے ۵ ربیع الآخر سنہ ۱۳۶۱ مطابق ۲۲ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کو آبگلہ میں وفات پائی، اور آبائی قبرستان میں قاضی سید احمد علیؒ کے قریب قبرستان کے بالائی حصہ پر دفن کیے گئے، مزار مرجع خلائق ہو، کیفیۃ العارفین و نسبۃ العاشقین کے ضمیمہ میں موصوف کے نبیرہ ڈاکٹر صاحب موصوف مرحوم کے مختصر سوانح حیات درج ہیں ص ۲۱

باقی نہ رہ جائے ، والبقاء للّٰہ الواحد القہار ،

کتبہ لوح مزار قاضی سید احمد علی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہم ارض عنہ

سنہ ۱۲۳۲

خادم شرع محمد وارثِ علم علی | این تن آب و گلہ بگذاشت با فارغ دلی
سر فرو بردم پے تاریخ ہاتف برکشید | دود ۔ وگفتا حیف قاضی سید احمد علی

(اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء)